

بلوغ المرام

اُردو
مِن أدلة الأحكام

جلد اول

تألیف: ابو الفضل شاہ الدین احمد بن حجر عسقلانی

شارح: مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

دار السلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

اس کتاب کے جملہ حقوق ترجمہ، نقل و اشاعت محفوظ ہیں

جمادی الاول ۱۴۱۸ھ ستمبر ۱۹۹۷ء



دارالاستصلاح

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۴۳ ریاض ۱۱۴۱۶ مملکت سعودی عرب

فون نمبر ۲۰۳۳۹۴۲ فیکس ۲۰۲۱۶۵۹

(برایچ پاکستان)

دارالاستصلاح

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

۵۰۔ نورمال نزد ایم اے او کالج لاہور۔ فون: ۲۲۰۰۲۲۰ فیکس ۷۳۵۴۰۷۲

(سیل نمبر) رحمن مارکیٹ (غزنی سٹریٹ) اردو بازار لاہور پاکستان

بلوغ المرام

مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ

جلد اول

تألیف
ابو الفضل شهاب الدین ابن محمد ابن حجر عسقلانی

(۷۸۳-۸۵۲ھ)

تحف الکرام شرح بلوغ المرام

مترجم
مولانا عبدالوکیل علوی

شرح
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

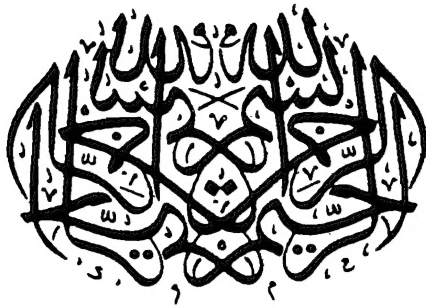
تصحیح و تصحیح
مولانا ارشد الحق الاثری

دارالاسلام

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

ریاض - لاہور

243.9
ن - ب



المكتبة العامة
للمكتبة العامة

۹۹۔۔ جے ماڈل ٹاؤن - لاہور

.....1.7.4.4.....

فہرست مضامین

جلد اول

۲۴۶	نفل نماز کا بیان	۲۵	طہارت کے مسائل
۲۶۸	نماز باجماعت اور امامت کے مسائل	۲۵	پانی کی اقسام
۲۹۰	مسافر اور مریض کی نماز کا بیان		(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)
۳۰۰	نماز جمعہ کا بیان	۳۹	برتنوں کا بیان
۳۱۶	نماز خوف کا بیان	۴۴	نجاست اور اسے دور کرنے کی تفصیل
۳۲۲	نماز عیدین کا بیان	۵۱	وضو کا بیان
۳۳۱	نماز کسوف کا بیان	۶۷	موٹوں پر مسح کرنے کا بیان
	(گرہن والی نماز)	۷۱	وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان
۳۳۸	نماز استسقاء کا بیان	۸۳	قضائے حاجت کے آداب کا بیان
	(بارش مانگنے کیلئے نماز)	۹۵	غسل اور جنبی کے حکم کا بیان
۳۴۸	لباس کا بیان	۱۰۵	تیمم کا بیان
۳۵۴	جنازے کے مسائل	۱۱۳	حبس (سے متعلق احکام) کا بیان
۳۸۹	زکوٰۃ کے مسائل	۱۲۳	نماز کے احکام
۴۱۱	صدقہ فطر کا بیان	۱۲۳	اوقات نماز کا بیان
۴۱۴	نفلی صدقے کا بیان	۱۳۶	اذان کا بیان
۴۲۳	اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان	۱۴۹	شرائط نماز کا بیان
۴۳۰	روزے کے مسائل	۱۶۱	نمازی کے سترے کا بیان
	نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے	۱۶۷	نماز میں خشوع و خضوع کا بیان
۴۴۶		۱۷۳	مساجد کا بیان
۴۵۳	اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان	۱۸۱	نماز کی صفت کا بیان
۴۵۹	حج کے مسائل		(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)
۴۵۹	حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان	۲۳۲	سجود سو وغیرہ کا بیان
۴۶۶	(احرام کے) میقات کا بیان		

۶۱۷	لفظ (گری پڑی چیز) کا بیان	۴۶۹	احرام کی اقسام اور صفت کا بیان
۶۲۳	فرائض (وراثت) کا بیان	۴۷۰	احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان
۶۳۱	وصیتوں کا بیان	۴۷۹	حج کا طریقہ اور دخول مکہ کا بیان
۶۳۵	ودیعت (امانت) کا بیان	حج سے محروم رہ جانے اور روکے جانے	
۶۳۶	نکاح کے مسائل کا بیان	۵۰۲	کا بیان
۶۵۴	کفو (مثل، ہمسری) اور اختیار کا بیان		
	عورتوں (بیویوں) کے ساتھ رہن سہن و		
۶۶۵	میل جول کا بیان	۵۰۶	خرید و فروخت کے مسائل
۶۷۴	حق مہر کا بیان	۵۰۶	بیع کی شرائط و اور بیع ممنوعہ کی اقسام
۶۸۱	ولیمہ کا بیان	۵۴۱	بیع میں اختیار کا بیان
۶۸۸	بیویوں میں باری کی تقسیم کا بیان	۵۴۵	سود کا بیان
۶۹۳	خلع کا بیان		
۶۹۵	طلاق کا بیان	بیع عرایا، درختوں اور (ان کے) پھلوں کی	
۷۰۷	(طلاق سے) رجوع کرنے کا بیان	۵۵۵	بیع میں رخصت
۷۰۸	ایلاء، ظہار اور کفارہ کا بیان	۵۵۹	پیشگی ادائیگی، قرض اور رہن کا بیان
۷۱۴	لعان کا بیان	مفلس قرار دینے اور تصرف روکنے کا	
۷۱۹	عدت، سوگ اور استبراء رحم کا بیان	بیان	
۷۳۰	دودھ پلانے کا بیان	صلح کا بیان	
۷۳۷	نفقات کا بیان	ضمانت اور کفالت کا بیان	
۷۴۴	پرورش و تربیت کا بیان	شراکت اور وکالت کا بیان	
۷۵۰	جنایات (جرائم) کے مسائل	اقرار کا بیان	
۷۶۴	اقسام دیت کا بیان	ادھار لی ہوئی چیز کا بیان	
۷۷۳	دعویٰ خون اور قسامت	غصب کا بیان	
۷۷۷	بانی لوگوں سے جنگ و قتال کرنا	شفعہ کا بیان	
	مجرم (بدنی نقصان پہنچانے والے) سے	مضاربت کا بیان	
۷۸۰	لڑنے اور مرتد کو قتل کرنے کا بیان	آپاشی اور زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا بیان	
۷۸۶	حدود کے مسائل	بے آباد و بنجر زمین کو آباد کرنے کا بیان	
۷۸۶	زانی کی حد کا بیان	وقف کا بیان	
		ہبہ، عمری اور رقبی کا بیان	

۸۸۷	مسائل	۸۰۰	تہمت زنا کی حد کا بیان
۸۹۴	شہادتوں (گواہیوں) کا بیان	۸۰۳	چوری کی حد کا بیان
۸۹۹	دعویٰ اور دلائل کا بیان		شراب پینے والے کی حد اور نشہ آور
۹۰۵	غلامی و آزادی کے مسائل	۸۱۱	چیزوں کا بیان
۹۱۰	مدبر، مکاتب اور ام ولد کا بیان	۸۱۶	تغزیر اور حملہ آور (ڈاکو) کا حکم
۹۱۶	متفرق مضامین کی احادیث	۸۲۰	مسائل جہاد
۹۱۶	ادب کا بیان	۸۳۵	جزیہ اور صلح کا بیان
۹۲۳	نیکی اور صلہ رحمی کا بیان	۸۵۰	گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان
۹۲۹	دنیا سے بے رغبتی اور پرہیز گاری کا بیان	۸۵۴	کھانے کے مسائل
	برے اخلاق و عادات سے ڈرانے اور	۸۶۰	شکار اور ذبائح کا بیان
۹۳۷	خوف دلانے کا بیان	۸۶۷	(احکام) قربانی کا بیان
	مکارم اخلاق (اچھے عمدہ اخلاق) کی	۸۷۳	حقیقہ کا بیان
۹۵۶	ترغیب کا بیان	۸۷۶	قسموں اور نذروں کے مسائل
۹۶۶	ذکر اور دعا کا بیان		قاضی (جج) وغیرہ بننے کے



فهرست ائمه مشاهیر (حالات زندگی)

۹۸۹	سعید بن منصور	۹۸۴	محمد بن حنبل
۹۸۹	ابن السکن	۹۸۵	اسحق بن راهویه
۹۸۹	الشافعی	۹۸۶	الاسماعیلی
۹۸۹	ابن ابی شیبہ	۹۸۴	البخاری
۹۸۹	الطبرانی	۹۸۶	البزار
۹۹۰	الطحاوی	۹۸۶	البیهقی
۹۹۰	ابن عبدالبر	۹۸۵	الترمذی
۹۹۰	عبدالحق	۹۸۶	ابن الجارود
۹۹۰	عبدالرزاق	۹۸۶	ابو حاتم الرازی
۹۹۱	ابن عدی	۹۸۷	الحارث بن ابی اسامه
۹۹۱	العقیلی	۹۸۷	الحاکم
۹۹۱	علی بن الممدینی	۹۸۷	ابن حبان
۹۹۱	ابو عوانه	۹۸۷	ابن خزیمه
۹۹۱	ابن القطان	۹۸۷	ابن ابی خیشمه
۹۸۵	ابن ماجه	۹۸۷	الدارقطنی
۹۹۱	مالک بن انس	۹۸۸	الدارمی
۹۸۴	مسلم بن الحجاج	۹۸۴	ابوداؤد
۹۹۲	ابن منده	۹۸۸	ابوداؤد الطیالسی
۹۸۵	النسائی	۹۸۸	ابن ابی الدنیا
۹۹۲	ابو نعیم الاصبهانی	۹۸۸	الذهلی
۹۹۲	ابو یعلی	۹۸۸	ابوزرعه الرازی



فهرست اسماء الرواة

۷۷	بسر بن صفوان	۳۳۳	ابراهم بن رسول الله ﷺ
۲۲۳	بشیر بن سعد	۷۱	ابی بن عماره
۲۲۵	ابو بکر الصدیق	۸۵۷	ابن ابی عمار
۵۶۸	ابو بکر بن عبدالرحمن	۲۶۳	ابی بن کعب
۷۶۶	ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم	۳۹۳	اسامة بن زید
۷۱	ابو بکره نفع بن الحارث	۳۷۹	ابو اسحاق السبعمی
۳۱۱	بلال بن الحارث الزنی	۵۰	اسماء بنت ابی بکر
۱۳۸	بلال بن رباح الحبشی مؤذن	۱۱۵	اسماء بنت عمیس
۳۹۹	بنز بن حکیم	۹۶۱	اسماء بنت یزید بن السکن
۳۷۱	بیضاء و ابنایاها	۶۸۱	ابو اسید
۹۶۳	تیم الداری	۹۰۱	اشعث بن قیس الکندی
۶۰۰	ثابت بن النحاک	۷۳۴	فلح اخو ابی القعیس
۶۹۵	ثابت بن قیس	۳۶۶	اقرع بن حابس
۴۳	ابو ثعلبه الحسینی	۲۸	ابو امامه الخثعمی
۹۸	ثمامه بن اثال	۲۳۰	ابو امامه الحارثی
۷۰	ثوبان مولی رسول الله ﷺ	۱۶۰	امامه بنت زینب بنت النبی ﷺ
۷۹	جابر بن سمره	۶۲۸	ابو امامه بن سهل
۶۲	جابر بن عبد الله	۸۰۸	ابو امیه المخزومی
۱۳۲	جسیر بن مطعم	۳۶	انس بن مالک
۱۳۰	ابو جحیفه	۷۶۱	انس بن النضر
۶۷۲	جدامه بنت وهب	۲۳۰	ایاس بن ثعلبه
۸۲۲	جریر بن عبد الله البجلي	۹۰	ابو ایوب الانصاری
۳۸۶	جعفر بن ابی طالب	۲۰۸	البراء بن عازب
۶۶۳	جمیل بن زید	۸۱۷	ابو برده الانصاری بلوی
۸۷۰	جندب بن سفیان	۳۱۳	ابو برده بن ابی موسی
۹۷۰	جویریة بنت الحارث	۱۲۷	ابو برزه الاسلمی
۱۷۱	ابو جهم بن حذیفه	۶۷۸	برورع بنت واشق
۱۶۲	ابو جهم بن الحارث	۱۲۵	بریده بن الحصیب
۸۱۰	حارث بن حاطب	۵۱۶	بریره

۱۲۷	رافع بن خدیج	۸۳۹	حبيب بن مسلمة الفهري
۷۳۷	رافع بن سنان	۱۱۷	ام حبيب بنت جحش
۳۲۸	ابو رافع مولى رسول الله ﷺ	۲۵۰	ام حبيب بنت ابى سفيان (ام المؤمنين)
۶۵۳	ربيع بن سبرة	۵۰۵	حجاج بن عمرو بن غزية
۷۹۱	ربيع بنت النضر	۷۳۳	ابو حذيفة
۲۳۷	ربيعه بن كعب	۴۰	حذيفة بن اليمان
۱۸۳	رفاعة بن رافع بن مالك	۱۷۶	حسان بن ثابت
۷۰۲	ابو ركانه بن عبد يزيد	۲۱۹	حسن بن على
۷۷۳	ابو رمثه	۶۲۶	حسن بن ييار البصري
۷۲۷	رويفع بن ثابت	۸۷۳	حسين بن على
۳۵۰	زبير بن العوام	۴۳۳	حفصه بنت عمر
۵۱۴	ابو زبير (محمد بن مسلم بن مدرّس)	۳۱۵	حكيم بن حزن
۷۴۲	ابو زناد (عبد الله بن ذكوان)	۱۷۷	حكيم بن جهم
۷۲۰	زهري (محمد بن مسلم بن شهاب الامام)	۳۹۹	حكيم بن معاوية
۱۴۷	زياد بن الحارث الصداقي	۵۳	حمران مولى عثمان
۷۳۷	زياد السبعمي	۴۴۲	حمزه بن عمرو الاسدي
۱۵۷	زيد بن ارقم	۷۵۹	حمل بن ثابته الهذلي
۸۰۰	زيد بن اسلم	۱۱۶	حننة بنت بخش
۲۴۲	زيد بن ثابت	۱۸۴	ابو حنيفة الساعدي
۶۴۰	زيد بن خالد الجعفي	۵۹۹	حنظلة بن قيس
۶۶۳	زيد بن كعب بن عجرة	۵۲۳	ابو حنيفة النعمان بن ثابت الامام
۴۲۰	زينب زوجة ابن مسعود	۷۷۶	حويصه بن مسعود
۶۶۱	زينب بنت النبي ﷺ	۲۵۷	خارجة بن حذافه
۴۷۱	سائب بن خلاد بن سويد	۸۱۹	خالد بن عرفطه
۵۸۱	سائب المخزومي	۲۴۳	خالد بن معدان
۳۱۱	سائب بن يزيد	۶۱۰	خالد بن الوليد
۳۷۷	سالم بن عبد الله	۸۱۹	خباب بن الارت
۷۳۳	سالم بن معقل مولى ابى حذيفة	۲۳۶	خرياق بن عمرو السلمى (ذواليدرين)
۱۶۲	سبرة بن معبد الجعفي	۴۸۵	خزيمة بن ثابت
۷۲۰	سبيعه بنت الحارث الاسلميه	۴۷۱	خلاد بن السائب
۴۹۹	سراء بنت نبحان	۳۱۷	خوات بن جبير
۹۳	سراقه بن مالك	۹۴۴	خوله الانصاري
۲۱۴	سعد بن طارق الاشجعي	۵۱	خوله بنت ييار
۸۸۳	سعد بن عباد	۹۵۰	ابو الدرداء
۱۷۸	سعد بن معاذ	۱۱۰	ابو ذر

۳۱۷	صالح بن خوات	۲۲۷	سعد بن ابی وقاص
۸۳۶	صخر بن العیله	۸۳۵	سعيد بن جبیر
۹۴۹	ابو صرمه	۲۷	ابو سعيد الخدری
۴۷۵	صعب بن جشامه اللیثی	۶۳	سعيد بن زيد
۵۸۷	صفوان بن امیه	۷۹۶	سعيد بن سعد عبادہ
۳۷۱	صفوان بن بیضاء	۲۹۹	سعيد بن المسیب
۶۹	صفوان بن عسال	۷۴۲	سفيان الثوري الانام
۶۷۴	صفیه بنت حبیب بن اخطب	۷۳۸	ابو سفيان صخر بن حرب
۶۸۵	صفیه بنت شیبہ	۴۳۵	سلمان بن عامر الضبی
۴۵۱	صماء بنت لمر	۸۹	سلمان الفارسی
۵۹۵	صهیب بن سنان الرومی	۳۰۲	سلمه بن اکوع
۵۰۵	ضباعه بنت الزبیر	۷۱۲	سلمه بن صخر البياضي
۶۵۸	ضحاک بن فیروز الدیلمی	۶۷۵	ابو سلمه بن عبد الرحمن
۳۸۲	ضمهره بن حبیب	۴۲	سلمه بن المحبتي
۲۱۴	طارق بن اشیم	۳۵۸	ابو سلمه عبد الله بن عبد الاسد
۸۱۶	طارق بن سويد	۴۰	ام سلمه (ام المؤمنين)
۳۱۴	طارق بن شهاب	۹۶	ام سليم
۷۳۹	طارق بن عبد الله الحارثی	۳۸۷	سليمان بن بريدة
۵۲۹	طاؤس	۲۰۱	سليمان بن يار
۴۸۹	ابو الطفیل (عامر بن واثله)	۴۹	ابو السمح
۴۶	ابو طلحه (زيد بن سهل)	۹۹	سمره بن جندب
۳۷۳	طلحه بن عبد الله بن عوف	۴۹۰	سوده بنت زمعه
۶۳	طلحه بن مصرف عن ابيه عن جده	۸۱۶	سويد بن طارق حضري
۷۶	طلق بن علی	۳۷۱	سهل بن بیضاء
۸۴۷	عائذ بن عمرو	۴۰۶	سهل بن ابی حثمہ
۴۸	عائشه الصديقه (ام المؤمنين)	۳۷۲	سهل بن حنيف
۶۶۱	ابو العاص بن الربیع	۳۰۳	سهل بن سعد
۴۹۸	عاصم بن عدی	۷۳۳	سهله بنت حمیل
۸۴۶	عاصم بن عمر	۳۷۱	سهیل بن بیضاء
۶۶۳	عالیه بنت ظبيان	۸۴۹	سهیل بن عمرو
۳۴۹	ابو عامر الاشعري	۴۳۹	شداد بن ادس
۱۵۲	عامر بن ربيعہ	۷۶۴	ابو شرحبیر الخزازي
۶۴۴	عامر بن عبد الله بن الزبير	۵۶۹	شرید بن سويد
۱۹۳	عباده بن الصامت	۸۰۲	شريك بن سحماه
۳۴۵	عباس بن عبد المطلب	۲۵۸	شعيب (والد عمرو بن شعيب)

٢٢٢	عبد الله بن عدي بن الخيار	٥٦١	عبد الرحمن بن ابيزى
٢٠٤	عقاب بن اسيد	٤٦٢	عبد الرحمن بن البيلماني
٨٢٦	عثمان بن ابي سليمان	٨٤٨	عبد الرحمن بن سره
١٢٥	عثمان بن ابي العاص الشقيف	٤٤٦	عبد الرحمن بن سئل بن زيد
٥٣	عثمان بن عفان	٦٢٢	عبد الرحمن بن عثمان التيمي
٣٨١	عثمان بن مغعون	٢٣٥	عبد الرحمن بن عوف
٨٦٢	عدي بن حاتم الطائي	٥٤٠	عبد الرحمن بن كعب بن مالك الانصاري
٤٨٠	عرفه بن شريح	٣٤٢	عبد الرحمن بن ابي ليلى
٥٣٨	عروه الباريقي	٥٩٦	عبد الرحمن بن يعقوب الجعفي
٥٩٠	عروه بن الزبير	٣٦٣	عبد الله بن ابي (رئيس السافقين)
٢٩٢	عروه بن مضر الطائي	١٩٨	عبد الله بن ابي ادوي
٥٥٢	عطاء الخراساني	٢٠٨	عبد الله بن يحيى
٥٤٢	عطيه القرظي	٢٥٨	عبد الله بن بريده
١١٨	ام عطيه	٨٠	عبد الله بن ابي بكر
٤٣٤	عقبه بن الحارث	٢٣٩	عبد الله بن جعفر
١٣١	عقبه بن عامر	٨١٨	عبد الله بن خباب بن الارت
٥٠٥	عكرمه	٥٠١	عبد الله بن الزبير
٥٩٦	العلاء بن عبد الرحمن الجعفي	٦٩٣	عبد الله بن زمه
٦٤٨	علقمه بن قيس	٥٣	عبد الله بن زيد بن عاصم المازني
٦٠٦	علقمه بن داكل الكندي	١٣٨	عبد الله بن زيد بن عبد ربه
٥٣	علي بن ابي طالب	٨٢٣	عبد الله بن السدي
١٢٩	علي بن طلق	٣١٣	عبد الله بن سلام
١٠٨	عمار بن ياسر	٤٤٦	عبد الله بن سئل بن زيد
٨٥٤	ابن ابي عمار	١٥٨	عبد الله بن الشيخير
٦٦	عمر بن الخطاب	٦٤٩	عبد الله بن عامر بن ربيعه
٥٦٨	عمر بن خلد	٣٢	عبد الله بن عباس
٦٨٦	عمر بن ابي سلمه	٣٦٣	عبد الله بن عبد الله بن ابي
٩١٣	عمرو بن الحارث	٣٠	عبد الله بن عمر بن الخطاب
٨١	عمرو بن حزم	٥٥	عبد الله بن عمرو بن العاص
٢٤	عمرو بن خارج	٩١	عبد الله بن مسعود
٢٨٠	عمرو بن سلمه	٢٥١	عبد الله بن مغفل
٥٩٩	عمرو بن الشريد	٣٤٩	عبد الله بن يزيد
٢٥٤	عمرو بن شعيب	٢٢٦	عبد المطلب بن ربيعه
٥٤٦	عمرو بن عوف الزني	١٣٢	عبد مناف
٢٣	عمران بن حصين	٦٢٨	ابو عبيده بن الجراح

٤٠٠	محمود بن لبيد	٦٨١	عمرو بنت الجون
٤٤٦	محيصة بن مسعود	٣٢٢	ابو عمير (عبد الله بن انس)
١٥٥	ابو مرثد الغنوي	٣٤٢	عوف بن مالك
٨٢٩	مروان بن الحكم	٣٢١	ابو عياش الزرقى
٨٩٢	ابو مريم الازدي	٦٢٢	عياض بن حمار
٩١	ابن مسعود	٩٢	عيسى بن يزداد
٢٢٣	ابو مسعود انصاري	٦٥٨	غيلان بن سلمة الشافعي
٢٩٦	مسور بن مخرمة	٤٣	فاطمة بنت ابي جيث
٦٣	مصرف (والد طلحة)	٦٥٥	فاطمة بنت قيس
١٥٨	مطرف بن عبد الله بن الشخير	٣٦٦	فاطمة بنت النبي ﷺ
٨٤	معاذ بن جبل	٤٢٢	فريه بنت مالك بن شان الخديريه
٨٣٣	معاذ بن عمرو بن الجموح	٢٢٢	فضالة بن عبيد
١٥٤	معاوية بن الحكم	٢٦٣	فضل بن العباس
٣٩٩	معاوية بن حيدة القشيري	٦٥٨	فيروز الديلمي
٨٣	معاوية بن ابي سفيان	٢٢٦	قيصة بن الحارث
٦٤٨	معقل بن شان الاشجعي	٣٥	ابو قتاده (الحارث بن ربحي)
٣٥٤	معقل بن ييار	٩٢٤	قطيب بن مالك
٥٣٣	معمر بن عبد الله بن نافع	٦٣١	ابو فلابه
٨٣٨	معض بن يزيد	٥٤٦	كثير بن عبد الله بن عمرو بن عوف
١٦٨	معتيق	٨٨٢	كروم
٦١	مغيرة بن شعبه	٨٤٢	ام كرز الكعبه
٤٢	مقداد بن الاسود	٢٤٤	كعب بن عجرة
٦٢٣	مقدم بن معد كريب	٦٣	كعب بن عمرو الياي
١٢٣	ابن ام مكتوم	٥٤٠	كعب بن مالك الانصاري
٨٣٢	مكحول	٩٠٦	كعب بن مره
١٤٥	ابو موسى الاشعري	٤٨٠	كوثر بن حكيم
٣٣	ميمونه بنت الحارث	٥٦	لقيط بن صبره
٥٥٢	نافع مولى ابن عمر	١٣٥	مالك بن الحويرث
٢٢٩	نيسه الهذلي	٩٠٢	مجزز الديلمي
٣٦٩	نجاشي (ملك الحبشه اصحمه بن الابر)	١٣٥	ابو مخزومه
٣٠٩	نعمان بن بشير	٤٠٢	محمد بن اسحاق (صاحب المغازي)
٨٢٨	نعمان بن مقرن	٣٢٢	محمد الباقر
١٩٥	نعيم بن عبد الله النخعي	٦٣٠	محمد بن الحسن الشيباني
٩١١	نعيم بن عبد الله النخعي	٨٦٤	محمد بن شان
٩١٨	نواس بن سمعان	٦٣٠	محمد بن مسلمه

٨٠٢	هلال بن اميه الواقفي	١٩٢	وائل بن حجر
٤٣٨	هند بنت عتبة زوجة ابي سفيان	٢٨٤	واليصه بن معبد
٦٥٦	ابو هند (يسار او سالم)	٣٩	ابو واقد الليثي
٤٣٤	ام يحيى بنت ابي اهاب	٢٨٩	ام ورقه
٢٤٣	يزيد بن الاسود	٨١٢	وليد بن عتبة
٥٩٤	يعقوب الجعفي	٨٢٢	ام هاني بنت ابي طالب
٣٨٩	يعلى بن اميه	٢٦	ابو هريره
٦٣٠	ابو يوسف (يعقوب القاضي)	٣٠٤	ام هشام



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض ناشر

دارالسلام -- الریاض، لاہور -- اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ الحمد للہ، اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں۔ جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ بھی ہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری بھی، اور طباعت و کتابت کے ظاہری حسن و جمال سے آراستہ بھی۔

اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری نشریاتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور اس کی مہربانی کا نتیجہ اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا صلہ ہے، بس پر ہم بارگاہ الہی میں سجدہ ریز اور وابستگان، رہ کے مشکور ہیں۔ جَزَاهُمْ اللَّهُ أَحْسَنُ الْجَزَاءِ، وَوَفَّقَنَا اللَّهُ وَإِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب ”بلوغ المرام فی اولیۃ الاحکام“ بھی ہے، ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیسی ساز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا، اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا، یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ ہے۔

”بلوغ المرام“ پاک و ہند کے دینی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متداول۔ اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے، چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں مولانا مبارکپوری حفظہ اللہ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا، تاکہ اردو دان حلقہ بھی اس سے

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی خدمات حاصل کیں، انہوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا، فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) نے اس پر نظر ثانی فرمائی، اس کے بعد بھی اس کی نوک پلک درست کرنے میں ادارے کے بعض اور رفقاء نے بھی حصہ لیا۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم سلمہ اللہ تعالیٰ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انہوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس طرح رفیق ادارہ جناب محمود الحسن اسد نے بھی اس کی تصحیح و نظر ثانی میں بڑی پر خلوص محنت کی ہے۔ جَزَاهُمْ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْجَزَاءِ

اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں، ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کر دی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظر ثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے، اس لیے ادارہ اس کو قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔

خادم، توحید و سنت

عبدالمالک مجاہد

دار السلام۔ الریاض لاہور

ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / جولائی ۱۹۹۷ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ عَلَى الْعَالَمِينَ نَذِيرًا وَبَعْدُ:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ”بلوغ المرام من ادلت الاحکام“ اپنے موضوع میں درج ذیل متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے، یہ کہ مؤلف نے اس میں احکام کی احادیث میں سے ایسی احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں، جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور لمبی احادیث کا شاندار انداز میں اختصار پیش کیا اور حدیث کو ائمہ حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے اور صحت و حسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اعتناء کیا ہے، جیسا کہ بہت سی علل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ واضح ہو کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد ٹکڑے اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں، جو مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل بنانے اور مغلط کو واضح، تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں، جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث و تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنایا، مشرق و مغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کا زینہ بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کر لیا اور اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح و توضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

سابق الذکر اہتمام و اعتناء کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی، جس میں قدیم و جدید انداز کی معروف و مشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقہ سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہو، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں

میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا، اس عمل عظیم کو شروع کیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہوگی، جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہوگی، تاہم یہ اس وقت ہو گا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدہ کا اثبات کرنا چاہوں جو عام کتابوں میں ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اکثر یا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے غامض اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسہ کیا ہو، جب کہ وہ طبعی، تاریخی، جغرافیائی اور دیگر قسم کی تحلیل کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں، چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت دینے پر مجبور ہوا تا کہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی مجھے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰی نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ

صفی الرحمن مبارکپوری

شعبان ۱۳۹۴ھ



مؤلف کتاب کے مختصر حالات

ابو الفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی، المعروف ابن حجر عسقلانی، سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے قاضی القضاۃ اور حفاظ و رواۃ میں منفرد ہیں۔ دس شعبان ۷۳۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحادی اور مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب یاد کیں اور اپنے کسی ایک وصیت کرنے والے کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا، پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز، شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہوئے، چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی، ابن الملقن اور دیگر اہل علم سے فقہات حاصل کی، آپ کو جلیل القدر ائمہ و شیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا، جو کسی دوسرے کو میسر نہ آیا، جیسا کہ متقدم الذکر ائمہ و شیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا۔ اور آپ نے دونوں اصول یعنی کتاب و سنت اور دیگر علوم عربین جماعہ سے، لغت الجہد فیروز آبادی سے، عربی زبان عماری سے، ادب و عروض بدر مشکئی سے اور کتابت جماعہ سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے اور قرأت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ توفی سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشر و اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ، قرأت، تدریس و تصنیف اور افتاء کی صورت میں اس پر تھے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر، حدیث، فقہ اور وعظ و نصیحت کی تدریس کی اور ازہر، جامع مسجد عمرو اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے اور اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املاء کروائی اور بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے متجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں، اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ اور امراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر ”فتح الباری شرح صحیح بخاری“ کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی

فتح الباری ہی آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ھ میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ھ میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۲۲ھ میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا، جس میں تمام عام و خاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی نصرت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب ”بلوغ المرام فی اولہ الاحکام“ جو اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے، مگر اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں جن میں ایک یہی مولانا صفی الرحمن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی اتحاف الکرام ہے جسے اردو دان طبقہ کے لیے اردو پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔

پہلے سال آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے، پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شاہی علاقے بھی آپ کی قضاء میں شامل کر دیے گئے، جو اکیس سال سے زائد عرصہ تک آپ کے زیر قضاء رہے، شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے، حتیٰ کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا، پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے، بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انہیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا، یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے، آپ کی یہ تقرری ۱۲ محرم بروز ہفتہ ۸۲۷ھ عمل میں آئی، پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات ہی مرتبہ اس سے الگ ہوئے، پھر جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو آخری مرتبہ اس عہدہ سے دستبردار ہوئے اور اسی سال میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس کے علاوہ آپ، تواضع، بردباری، صبر و تحمل، خوش طبعی، وسعت و ظرافت، قیام و صیام، احتیاط و ورع، جود و سخا، برداشت، باریک و لطیف کلام اور عمدہ اور نفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور و مختار تھے، جیسا کہ آپ ائمہ متقدمین و متاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب و احترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ بروز ہفتہ آٹھ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا ثواب اور بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تخصیص از ”التبر السبک وغیرہ“



کلمہ مؤلف

آغاز اللہ رحمن اور رحیم کے نام سے

بسم الله الرحمن الرحيم

ظاہری، باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور درود و سلام اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور (مزید برآں) اس کی آل اور اس کے اصحاب پر جنہوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تہذیب اور برق رفقاری کا مظاہرہ کیا اور تابعین کرامؒ پر جو ”معلم“ کے وارث ہوئے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ علماء ہی انبیاء کرامؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ اور اچھا ہے یہ ورثہ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ
وَالْبَاطِنَةِ قَدِيمًا وَحَدِيثًا، وَالصَّلَاةُ
وَالسَّلَامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ
وَالِهِ وَصَحْبِهِ الَّذِينَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ
دِينِهِ سِرًّا حَثِيثًا، وَعَلَى أَتْبَاعِهِمُ
الَّذِينَ وَرِثُوا الْعِلْمَ، وَالْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ
الْأَنْبِيَاءِ، أَكْرَمَ بِهِمُ وَارِثًا وَمُورِثًا.

حمد و صلوة کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب میں بڑی جانفشانی اور تہذیب سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بحیثیت ماہر اور بڑی شان والا بن جائے۔ مبتدی طالب علم اس کے ذریعہ مدد طلب کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت و ضرورت سے مستغنی نہ رہ سکے۔ (یعنی یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)

أما بعد، فَهَذَا، مُخْتَصَرٌ يَسْتَمِلُ
عَلَى أُصُولِ الْأَدِلَّةِ الْحَدِيثِيَّةِ
لِلْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَزْتُهُ تَحْرِيرًا
بَالِغًا، لِيَصِيرَ مَنْ يَحْفَظُهُ مِنْ بَيْنِ
أَفْرَانِهِ نَابِغًا، وَيَسْتَعِينَ بِهِ الطَّالِبُ
الْمُبْتَدِي، وَلَا يَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّاعِبُ
الْمُنْتَهِي.

میں نے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے امت کی خیر

وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقَبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ
أَخْرَجَهُ مِنَ الْأَيْمَةِ، لِإِرَادَةِ نُصْحِ

الْأُمَّة، فَالْمُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ
وَالْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ
وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهَ،
وَبِالسَّبْعَةِ: مَنْ عَدَا أَحْمَدَ،
وَبِالْخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا الْبُخَارِيَّ
وَمُسْلِمًا، وَقَدْ أَقُولُ: الْأَرْبَعَةُ
وَأَحْمَدُ وَبِالْأَرْبَعَةِ: مَنْ عَدَا الثَّلَاثَةَ
الْأُولَى، وَبِالثَّلَاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ
وَالْآخِيرَ، وَبِالْمُتَّفَقِ: الْبُخَارِيُّ
وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لَا أَذْكَرُ مَعَهُمَا
غَيْرُهُمَا، وَمَا عَدَا ذَلِكَ فَهُوَ مُبَيَّنٌّ.

خواہی کے لیے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جہاں
میں نے ﴿اخرجه السبعة﴾ نقل کیا ہے اس سے میری
مراد امام احمد رحمہ اللہ، بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ، ابوداؤد رحمہ اللہ،
ترمذی رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ ہیں اور جہاں
﴿اخرجه الستہ﴾ نقل کیا ہے اس سے مراد امام احمد بن
حنبل کے ماسوا باقی تمام آئمہ ہیں اور ﴿اخرجه الخمسة﴾
سے مراد بخاری و مسلم کے علاوہ باقی پانچ امام ہیں اور کبھی
میں ﴿اخرجه الاربعہ﴾ کہتا ہوں اور ﴿اربعة﴾ سے
مراد پہلے تین امام یعنی احمد، بخاری اور مسلم کے علاوہ باقی
آئمہ مراد ہوتے ہیں اور ﴿اخرجه الثلاثة﴾ سے مراد
پہلے تینوں اور آخری کے علاوہ بقیہ تین امام مراد ہیں (یعنی
امام ابوداؤد، نسائی، ترمذی) اور ﴿متفق علیہ﴾ سے مراد
بخاری اور مسلم ہیں اور بسا اوقات میں بخاری و مسلم کے
علاوہ دوسرے آئمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ متذکرہ بالا
صورتوں کے ماسوا باقی تمام صورتوں میں روایت کرنے
والے آئمہ کا ذکر ہر موقع پر نمایاں طور پر ذکر کر دیتا ہوں۔

وَسَمَّيْتُهُ بُلُوغَ الْمُرَامِ مِنْ أَدْلَةِ
الْأَحْكَامِ، وَاللَّهِ أَسْأَلُ أَنْ لَا يَجْعَلَ
مَا عَلَّمْنَاهُ عَلَيْنَا وَبَالًا وَأَنْ يَرْزُقَنَا
الْعَمَلَ بِمَا يَرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

میں نے اس مختصر کتاب کا نام ﴿بلوغ المرام من ادلة
الاحکام﴾ تجویز کیا ہے۔
آخر میں رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوں کہ
وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ
اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

لغوی تشریح: ﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾ سے مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن پاک کے طریقہ کی
پیروی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتداء کرنے کی تعمیل کے لیے کیا ہے۔ ﴿الحمد﴾ میں
حمد سے مراد ہے بہترین تعریف۔ بہترین اسلوب کے ساتھ جو انسان کے اختیار میں ہو۔ ﴿النعم﴾ ان پر دو اعراب
منقول ہیں۔ کسرہ اور فتح۔ یہ جمع ہے اس کا واحد نعمہ ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فائدہ
اٹھاتا ہے۔ ﴿الظاہرہ﴾ سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ ظاہری
انعامات و احسانات میں انسان کی شکل و صورت کا موزوں و مناسب بنانا اور لذیذ و عمدہ طرح طرح کے کھانے جو

اس کے منہ کے ذریعہ شکم میں جاتے ہیں شامل ہیں اور ظاہری نعمت سے اسلام بھی مراد ہے۔ ﴿الباطنہ﴾ ایسے انعامات جن کا انسان اور اک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو ارض و سماء میں ہی نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ایسی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ باطنی نعمتوں میں عیوب پر پردہ پوشی بھی شامل ہے۔ قدیم و جدید سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان نے اپنی زندگی کی سہولت اور آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ عقل و خرد کو استعمال کر کے معیشت و معاشرت اور تمدن کے لیے ایجادات کی ہیں۔ دور جدید کے انکشافات نے انسانی تمدن کو ایسی نعمتوں سے روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ انسان بحر و بر تو در کنار فضا میں ہوا سے تیز رفتار ایجاد کی وجہ سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چند لمحوں میں ہزار ہا میل دور ٹیٹھے ہوئے انسان سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ﴿الصلوۃ﴾ کے معنی دعا رحمت، بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں ﴿السلام﴾ آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ مصنف نے کتاب کا آغاز حمد و ثناء کے بعد قرآن مجید میں رب کائنات کے ارشاد صلوا علیہ وسلموا تسلیما کی تعمیل اور سلف کی پیروی میں صلوة و سلام سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی عزت افزائی فرمائے اور آپ ﷺ کی شان بلند کرے۔ ﴿ال﴾ آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ یعنی اس لفظ میں بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے اتباع و پیروکار بھی شامل ہیں۔ مثلاً ال ابراہیم سے جس طرح ان کی اولاد مراد ہے اسی طرح ان کے متبعین بھی مراد ہیں بعینہ جس طرح ال فرعون میں فرعون کی اولاد بھی شامل ہے اور اس کے نظریہ کے پیروکار بھی۔ ﴿صحابہ﴾ فتح یعنی زبر کے ساتھ۔ صاحب کی جمع ہے اور صحابی سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں مگر زیادہ صحیح یہی ہے۔ ﴿الحشیت﴾ تیز رفتاری، تیز گامی۔ ﴿اتباع﴾ ہمزہ کے فتح یعنی زبر اور تاء کے سکون۔ تابع کی جمع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کے حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تحصیل علم کے بعد اس کے دقیق مسائل نکالے۔ یہ بزرگ اگر جانفشانی اور سعی و جدوجہد کر کے علم حقیقی ہم تک نہ پہنچاتے تو آج انسانیت کفر و الحاد کے اندھیروں میں ٹانک ٹانیاں مارتی پھرتی۔ ﴿اکرم بہم فعل تعجب﴾ یعنی کتنے معزز و مکرم ہیں یہ لوگ۔ ﴿وادنا﴾ اکرم مہم میں ضمیر مجرور کی تیز کے طور پر ہے۔ اسے منصوب لایا گیا ہے۔ یعنی تابعین صحابہ کرامؓ سے دین حقیقی کے علم کو وراثت میں پانے کی وجہ سے بہت ہی معزز و مکرم ہیں۔ ﴿اما بعد﴾ حرف شرط ہے اور بعد کے ”د“ پر ضمہ ہے گویا جہی بر ضمہ ہے۔ یہاں ظرف واقع ہو رہا ہے مضاف الیہ کی نیت موجود ہے مگر اضافت بظاہر موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حمد و صلوة کے بعد۔ ﴿اصول﴾ جمع ہے اصل کی۔ جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔ ﴿الادلہ﴾ ہمزہ کے فتح ”د“ کے کسرہ اور ”ل“ کی تشدید دلیل کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے دلیل کا معنی مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ ﴿الاحکام﴾ حکم کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ ﴿حردہ﴾ تحریر سے ہے جس کے معنی تفتیح تہذیب کے ہیں۔ ﴿نابعہ﴾ عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ ﴿المبتدی﴾ فن

حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ ﴿المنہی﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلباء سے لے کر کامل ماہرین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ ﴿عقب﴾ ”ع“ کے فتح اور ”ق“ کے کسرہ۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿من اخرجه﴾ اس میں ”من“ موصولہ ہے اور اخرجه کے ساتھ مل کر نیت کا مفعول ہے اس میں اخراج، تخریج اور روایت کے معنی میں استعمال ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ کتاب میں بیان کرنا اور مصنف نے مخرجین کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے حسن یا ضعیف ہے۔ ﴿النصح﴾ بھلائی اور خیر خواہی۔ ﴿فالمراء﴾ کا مطلب ہے میری مراد۔ یعنی اس کتاب میں جب میں بالسبعہ کہتا ہوں تو میری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اور جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد ”اخرجه السبعہ“ کہتا ہوں تو اس کا بھی وہی مطلب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ﴿عدا﴾ غیر اور سوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو اشتقاق کے لیے ہیں اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے اور کبھی میں ﴿الاربعة﴾ واحد ﴿اخذ﴾ کہتا ہوں تو اس سے مراد ﴿اخرجه الخمسة﴾ کی طرح پانچ محدث مراد ہوتے ہیں ﴿الاربعة﴾ واحد ﴿اخذ﴾ اور ﴿اخرجه الخمسة﴾ بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔ ﴿الثلاثة الاول﴾ الاول ہمزہ کے ضمہ اور ”و“ کے فتح۔ اول کی جمع ہے اور ثلاثہ سے میری مراد پہلی تین کتابوں بخاری، مسلم اور احمد کے علاوہ ہے۔ ﴿الاخیر﴾ سے ابن ماجہ مراد ہے۔ یعنی پہلی تین اور آخری ابن ماجہ کے علاوہ باقی ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رہ جاتی ہیں بالثلاثة سے یہی تین مراد ہیں۔ ﴿معہما﴾ اس سے مراد بخاری و مسلم کے ساتھ۔ ﴿غیرہما﴾ حدیث کی نسبت بخاری و مسلم کی جانب ہے۔ حدیث کے مرتبہ صحت کے لیے کافی ہے مگر مزید برآں تائید غمے لیے ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ﴿ما عدا ذلک﴾ ان سات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے ان کے اسماء گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ﴿المروم﴾ کے معنی طلب کے ہیں اور مراد سے مطلوب ہے۔ ﴿والله﴾ مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے اسال کا مفعول ہے۔ مفعول کو مقدم بیان کرنے سے مقصود کلام میں حصر کرنا ہے یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ بجز اس کے کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ ﴿ما علمناہ﴾ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر جعل فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول و بالہ ہے۔ وبال کی ”و“ پر فتح ہے اس کے معنی برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصہ اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے اور ان یرزقنا کے معنی ہیں یوفقنا یعنی ہمیں اللہ توفیق دے۔



۱۔ کتاب الطہارۃ

طہارت کے مسائل

پانی کی اقسام

۱۔ باب المیاء

(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔
 (۱۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَغْتَسِلْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (ابن ماجہ)۔

خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس

روایت کو مالک، شافعی اور احمد نے بھی روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: (کتاب الطہارۃ) کتاب، کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب مسائل کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ اور طہارت پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

(باب المیاء) باب ایک ہی نوع سے متعلق مسائل جس میں بیان کئے جائیں اسے باب سے تعبیر کرتے ہیں اور (مبایہ) ماء کی جمع ہے ”مویہ“ اس کی تفسیر آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر ”مویہ“ کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں وہ کنوئیں کا پانی، دریا اور سمندر کا پانی اور چشموں اور باران رحمت کے پانی کا ذکر کریں گے۔

﴿عن ابی ہریرۃ﴾ اس کا تعلق محذوف سے ہے جو روی یا مروی وغیرہ ہو سکتا ہے اور ﴿فی البحر﴾ کا مطلب ہے دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ پھر ﴿الطہور﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے ”طاء“ کے فتح سے اگر اسے ادا کیا جائے تو اس صورت میں وہ اسم مراد ہوگا جو مطہر یعنی پاک کرنے والا کے معنی میں ہوگا۔ دریا و سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ ﴿الحل﴾ ”حاء“ کے کسرہ اور ”لام“ کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے معنی ہیں حلال۔ ﴿میتہ﴾ سے وہ جانور مراد ہے جو پانی میں ہی صرف زندہ رہ سکتا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث دراصل ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں، ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے، اب اگر ہم اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے مرجائیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا ”وہ پانی پاک ہے۔“

یہ حدیث دلیل ہے، اس کی کہ سمندری پانی بغیر تفصیل کے مطلقاً پاک ہے۔ نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں خواہ وہ کتے اور خنزیر کی شکل کے ہوں۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی ﷺ نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ بغیر سائل کے دریافت کئے، اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتادی۔ اس لئے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے وہ تو اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ شک و شبہ میں رہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے مگر اس کی تفصیل نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہذا آنحضرت ﷺ کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ یہ سائل کون تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبداللہ المدلجی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالعزیز رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبید العزیز رضی اللہ عنہ تھا اور عسکی سمندر و دریا میں کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی ملّاح۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا پاک ہونا، اس سے وضو کرنا، اس کو (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں، چاہے سمندر میں مرجائے یا نکالنے کے بعد مر جائے اور یہ کہ سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت ابویہرہؓ﴾ وہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ صاحب استیعاب کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تھے۔ ۶ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اٹھتر سال کی عمر پائی اور ۵۹ھ میں اس دنیائے فانی

سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع غرقہ نامی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان سے کم و بیش ۵۳۸۴ احادیث مروی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَے فرمایا کہ ”پانی پاک ہے“ اسے رسول اللہ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا كُوفِيْ شَيْءٌ» (اس روایت کو ابوداؤد) بِنَجَسِهِ شَيْءٌ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ وَصَحَّحَهُ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے أَخَذَ۔ صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخدری﴾ ”خاء“ کے ضمہ اور ”ذ“ کے سکون کے ساتھ۔ ”خدرہ“ کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک معروف و مشہور قبیلہ ہے۔ ﴿طهور﴾ ”طاء“ کے فتح کے ساتھ اس کے معنی پاک کے بھی ہیں اور پاک کرنے والے کے بھی۔ ﴿لاینجسہ﴾ میں ینجسہ تنجیس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس یعنی ناپاک نہیں کرتی۔ مفہوم و معنی یہ ہے پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔

حاصل کلام: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور غواہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف عملاً رونما نہ ہو جیسا کہ آگے ابوامامہ بابلی رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ابوسعید خدری رحمہ اللہ سے مروی حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بشر بضاہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ (بشر بضاہ ایک پرانا کواں تھا جس میں حیض والے کپڑے، کتے کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں) آپ نے اس کے جواب میں فرمایا ”پانی تو پاک ہے۔“ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ الماء میں جو ”لام“ ہے یہ لام عمد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسائل کے ذہن میں جس کنوئیں کا پانی مراد تھا اور وہ بشر بضاہ کا پانی تھا، اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں پانی ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا۔ جیسا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ (اگر مذکورہ کثیر مقدار ہو تو اس میں نجاست واقع ہونے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا ورنہ ناپاک ہو جاتا ہے)۔

راوی حدیث: ﴿ابو سعید الخدری رحمہ اللہ﴾: ابوسعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رحمہ اللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رحمہ اللہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ

ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھیاسی برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ھ کے آغاز میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

(۳) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ لَا يَنْجِسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنُهُ». أخرجه ابنُ ماجه، وَضَعَهُ أَبُو حَنِيمٍ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ: ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اسے ضعیف قرار دیا (۳) تیسری میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں ”پانی پاک (۳) ہے (اور پاک کرنے والا بھی ہے) بجز اس کے وہ ناپاک پانی میں گرنے والی چیز پانی کی بو، ذائقہ اور رنگت غالب ہو جائے۔“ (اسے ابن رنگت کو تبدیل کر دے۔“

لغوی تشریح: ﴿لَا يَنْجِسُهُ﴾ تنجیس سے ہے۔ محض نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ پانی کی مقدار کثیر ہو یعنی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اگر پانی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے مساوی ہو اور اس میں نجاست گر کر اس کی بو، ذائقہ اور رنگت میں سے کوئی ایک وصف بھی تبدیل کر دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس میں پانی کی مقدار قلیل یا کثیر کا اعتبار نہیں ہو گا ﴿تحدث فيه﴾ معنی نجاست پانی میں واقع ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں رشدین بن سعد راوی متروک ہے اور وہ اسے موصول بیان کرتا ہے جبکہ راشد بن سعد جو ثقہ راوی ہے اسے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم معنوی اعتبار سے اس کی صحت پر اجماع ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ نجاست کے اس میں گرنے سے اس کے تین اوصاف میں سے کسی ایک کی تبدیلی کی صورت میں وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کو اگر زیادہ مقدار مثلاً دو قلعے یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ہاں اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ، بو یا مزہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو امامۃ الباہلی رحمۃ اللہ علیہ﴾: ابو امامہ کنیت۔ امامہ حمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ باہلہ قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے باہلی کہلائے۔ ان کا نام صدی (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی پھر حصص کی جانب منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلْتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ». وَفِي لَفْظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أَخْرَجَهُ الْأَوْثَقُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب پانی کی مقدار دو بڑے منکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔“ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ ”پانی نجس (نپاک) نہیں ہوتا۔“ (اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلتین﴾ ”قاف“ کے پیش اور ”لام“ کی تشدید۔ بڑے منکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ لیکن عرب میں حجر کے منکے مشہور و معروف تھے۔ شعراء نے اپنے اشعار میں بکثرت اس کا استعمال کیا ہے اور امثال میں بھی اسے بہت بیان کیا ہے۔ اس طرح حدیث میں بیان شدہ منکے سے مراد یہی حجر کا منکا ہے اور دوسرا کوئی مراد نہیں ہو سکتا اور ان کے منکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سامنے کی گنجائش تھی لہذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانہ کے پیانہ کے مطابق دو سو ستائیس کلوگرام ہوتی ہے۔ ﴿یحمل الخبث﴾ الخبث میں ”خاء“ اور ”باء“ دونوں پر زبر ہے۔ معنی اس کے نجاست اور گندگی کے ہیں۔ ﴿لم یحمل الخبث﴾ کے معنی ہیں کہ پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا، قبول کرنے سے انکاری ہے اور صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے وہ نپاک ہوتا بھی نہیں۔ وفی لفظ ﴿لم ینجس﴾ میں ایک قرأت کے مطابق تو ”جیم“ پر زبر (فتح) ہے اور دوسری قرأت کے مطابق پیش (ضمہ) ہے، دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (منکوں) سے کم ہوگی تو نجاست کے اس میں محض گرنے سے ہی وہ نپاک ہو جائے گا۔ خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ اور اس کی مقدار قلتین (منکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی۔ تو محض وقوع نجاست سے وہ نپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو پاک کرے گا اور جب ان اوصاف ثلاثہ (بو، ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف اس کی وجہ سے رونما ہوگا تو وہ پانی نپاک شمار ہوگا۔ جیسا کہ ابوامامہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

جہاں تک ”بئر بضاعہ“ والی حدیث کا تعلق ہے اس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ اس میں پانی دو قلوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث کے ایک جم غفیر امام شافعی رحمہ اللہ، ابو عبیدہ رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ، طحاوی رحمہ اللہ، ابن حبان رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ، ابن مندہ رحمہ اللہ،

حاکم رحمہ اللہ، خطابی رحمہ اللہ، بیہقی رحمہ اللہ، ابن حزم رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے قوت المغنزی میں نقل کیا ہے۔ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی کثیر کے زمرہ میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احتاف کا ”دہ درہ“ کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

معلوم ہوا کہ کھڑے پانی میں نہ تو نجاست ڈالی جائے اور نہ جنبی نہائے۔ پانی اگر دو قلوں سے کم ہو تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے، چاہے اس کا رنگ، بو اور مزہ بدلے یا نہ بدلے اور اگر دو قلوں سے زیادہ ہو تو اس وقت تک پلید نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ، بو اور مزہ نجاست پڑنے سے بدل نہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ زاہد اور وسیع علم کے مالک تھے۔ صغریٰ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوہ خندق میں شریک ہوئے۔ ۳۷ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ». أخرجه مسلم. وللبخاري: «لَا يَبُولُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَا يَخْرُجُ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». ولمسلم: «منه» ولأبي داود: «وَلَا يَغْتَسِلُ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔“ (مسلم) اور بخاری کے الفاظ ہیں کہ ”تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔“ صحیح مسلم کے الفاظ فیہ کے بجائے منہ ہیں یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل کرے اور ابو داؤد کے الفاظ ہیں ”ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ“ یعنی ”جنابت لاحق ہو جانے کی صورت میں اس میں غسل نہ کرے۔“

لعوی تشریح: ﴿الدائم﴾ ایسا ساکن جو بہتا نہ ہو ﴿جنب﴾ جم اور نون کے ضمہ (پیش) کے ساتھ۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہو۔ ﴿ثم یغتسل فیہ﴾ اس میں ثم دوری ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور ﴿یغتسل﴾ میں پیش (رفع) بھی جائز ہے، مبتدا مخذوف ”هو“ کی خبر ہونے کے اعتبار سے اور سکون (جزم) پڑھنا بھی جائز ہے ﴿لا یغتسل﴾ کی نہی پر عطف کی وجہ سے اور زبر (نصب) پڑھنا بھی جائز ہے، (ان) پوشیدہ (مقدار) مان لینے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت میں ”فیہ“ کی جگہ ”منہ“ ہے اگر ”فیہ“ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس

پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے اور ”منہ“ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہی ہے۔ بہر حال مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے دونوں کی ممانعت ہے۔ ابو داؤد کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر ممانعت ہے یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ دونوں عمل ہی ممنوع ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر و تبدل کا موجب ہوگا۔ پس نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تنزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک و نجس نہیں ہوتا۔

(۶) وَعَنْ رَجُلٍ صَحَبَ النَّبِيَّ ﷺ اِيك ايسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ كَال: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَغْتَسِلَ صحبت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، اَوِ الرَّجُلُ منع فرمایا ہے کہ ”عورت“ مرد کے بچے ہوئے غسل بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلَيَغْتَرِفَا جَمِيعًا۔ کے پانی سے غسل کرے یا مرد، عورت کے باقی ماندہ اَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمُّنِيُّ، وَلِإِسْنَادِهِ ضَعِيفٌ۔ غسل کے پانی سے غسل کرے۔ ہاں دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں۔ (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں) “

(ابو داؤد و نسائی۔ اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن رجل صحب﴾ صحب باب سمع يسمع سے فعل ماضی ہے اور اس مرد کی صفت میں واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں، کیونکہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ ”الصحابۃ کلہم عدول“ کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اور ﴿بفضل الرجل﴾ سے مراد ہے کہ آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ ﴿ولیغترفَا جَمِيعًا﴾ میں ”لام“ امر کا ہے اور ﴿اغترفا﴾ کے معنی ہیں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی لینا۔ یعنی دونوں چلو سے پانی لینا۔ حاصل کلام: اس حدیث میں نہی سے مراد نہی تنزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑ سکتا ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا بدل بن جاتے ہیں اس میں چونکہ کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

اگر خاوند و بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے پانی لے کر نہائیں تو جائز ہے۔ لیکن صرف خاوند یا صرف بیوی کے غسل جنابت کے بعد اس کا بچا ہوا پانی دوسرے کیلئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے،

تاکہ دونوں کے ذہن میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. وَلَا ضَحَابَ الشَّنَرِ: اغْتَسَلَ بَغَضِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ لِيَغْتَسِلَ مِنْهَا، فَقَالَتْ لَهُ: إِنِّي كُنْتُ جُنُبًا، فَقَالَ: إِنَّ الْمَاءَ لَا يَجْنُبُ. وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیا کرتے تھے۔ (مسلم) اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے ایک نے ٹب نہا برتن میں غسل کیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے کہ اس میں باقی بچے ہوئے پانی سے غسل فرمائیں تو اس نے آپ سے عرض کیا کہ میں نے اس میں حالت جنابت سے غسل کیا ہے تو آپ نے فرمایا ”پانی ٹپاک نہیں ہوتا۔“ (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لاصحاب السنن﴾ سے ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، اسی طرح داری، دارقطنی، ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ ﴿جفنة﴾ ”جیم“ کے فتح اور ”فاء“ کے سکون کے ساتھ۔ ایک بڑا سا پیالہ اور عام لوگ اسے ”اجانہ“ (یعنی چڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ ﴿یغتسل منها﴾ یعنی اس کے پانی سے ﴿فقالت: انی كنت جنبا﴾ سے مراد ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ ﴿لا یجنب﴾ میں جنب سمع اور کرم دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب اکرام سے ہو۔ اس کا معنی ہے کہ جنبی کے کسی پانی والے برتن سے پانی لے کر غسل کرنے کی وجہ سے وہ پانی ٹپاک نہیں ہو جاتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کو یہ شک پیدا نہ ہو کہ یہ حدیث پہلی کے مخالف ہے۔ درحقیقت امت کی سہولت اور آسانی کیلئے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے اور پہلی ترک اوّلیٰ پر۔

رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور آپ دونوں ایک برتن سے پانی لے کر نہاتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری سند سے واضح ہے۔ اصحاب سنن والی روایت لمجاز سند ضعیف ہے۔ لہذا راجح یہی ہے کہ خاوند اور بیوی دونوں اکٹھے تو ایک برتن سے پانی حل کر نہا سکتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ نہانے کی صورت میں ایک کو دوسرے کا بچا ہوا پانی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما﴾ ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ

کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرنا مندوب ہے واجب نہیں اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست کے ازالہ کیلئے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ نجاست کے علاوہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی حکمت اور ہو۔ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلہ سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے ارد گرد بالوں کے ساتھ ان میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا وجود صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہے جیسا یورپین اقوام اور اس کے مقلدین عموماً ایسا کرتے ہیں تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورد و نوش کے وقت آسانی سے اس کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس انسان کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس سے جراثیم نکل کر معدہ کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل، دماغ اور پھیپھڑے کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے وقت درکار ہے اور انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے۔ ایسے آلات کے ذریعہ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شرعاً اسے نجس و ناپاک قرار دینا اور سات مرتبہ دھونا برتنوں کی صفائی اور نظافت کیلئے ہے تاکہ مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے اور یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔

(احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام لابن دقیق العید، ج ۱، ص: ۲۷) خورد و نوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہ لانا چاہئے اسے گرا دینا چاہئے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ مسلم کی ایک روایت میں تو ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دار قطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہئے، حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا فتویٰ یہ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ لہذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے، وہی رائج ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتویٰ سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری، ج ۱، ص: ۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر یہاں حدیث مرفوع

اور صحیح کے مقابلہ میں ان کے مرجوح فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم نے اس سلسلے میں علامہ عینی رحمہ اللہ اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کے اعتراضات بارودہ کا کافی و شافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعیۃ، ج ۱، ص: ۴۴۹-۴۵۴)

(۹) وعن أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ فِي الْهَرَّةِ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَافِينِ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُرَيْمَةَ.

حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ”وہ نجس نہیں ہے کیونکہ یہ ہر وقت آمدورفت رکھنے والا گھریلو جانور ہے۔“ (اس روایت کو چاروں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فی الهرۃ﴾ اس کا مطلب ہے کہ بلی کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ہرۃ کے علاوہ اسے قط اور سنور بھی کہتے ہیں۔ ﴿الطوافین﴾ ”واؤ“ کی تشدید۔ واحد اس کا طواف ہے اور یہ ایسا جانور ہے جن کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے اور وہ گھر کا خادم ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہ دینے سے مقصود یہ اشارہ کرنا ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلہ میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کیلئے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور دقت کے دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے کی بدولت ہی اس کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا۔ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی تو حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تاکہ بلی آسانی سے اور سیر ہو کر پی لے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ”بلی نجس نہیں ہے۔“ اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ابو قتادہ رحمہ اللہ﴾ ابو قتادہ رحمہ اللہ ان کی کنیت ہے۔ اصل نام حارث بن ربیع ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی رحمہ اللہ ہیں۔ (فارس رسول اللہ ﷺ) کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوہ احد وغیرہ میں شریک جنگ رہے۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۰ھ بعض نے ۵۳ھ بیان کیا ہے۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔ (تہذیب الاصابہ)

(۱۰) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ أَعرَابِي، ائیک بدوی آیا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنا

فَبَالَ فِي طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ شروع کر دیا تو لوگوں نے اسے ڈانٹا۔ لیکن نبی ﷺ النَّاسُ، فَتَهَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا، جب وہ بدوی فلما قَضَى بَوْلَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرت ﷺ نے پانی کا بِذُنُوبٍ مِنْ مَّاءٍ فَأَهْرِيقْ عَلَيْهِ. مَنَعُوا ایک ڈول طلب فرمایا اور اس جگہ پر بہا دیا (جہاں علیہ۔ اس نے پیشاب کیا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعرابی﴾ اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی و دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذوالخویصرہ یمانی تھے اور وہ بڑے پیٹ والے آدمی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ ﴿طائفة المسجد﴾ مسجد کا کوئی کونہ یا کنارہ۔ مسجد کی کسی جانب۔ ﴿فزعجه الناس﴾ لوگوں نے اسے ڈانٹا، بھڑکا، سختی سے منع کیا۔ ﴿فنهاهم رسول الله ﷺ﴾ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا مرد کی شرم گاہ کیلئے ضرر رساں ہے اور بسا اوقات ایسا کرنے کی وجہ سے گردہ اور مثانہ کا خبیث مرض لاحق ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی آپؐ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ پیشاب کا منقطع کرنا بدن، لباس اور مسجد کے دوسرے حصے جہاں پیشاب نہیں کیا کے نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ادھورا پیشاب لے کر بھاگ کھڑا ہوتا تو اس کے اپنے کپڑے اور بدن کے علاوہ مسجد کے دوسرے حصوں میں پیشاب کے چھینٹوں کا گرنا ممکن تھا جس سے گندگی زیادہ پھیلتی۔ ﴿بذنوب﴾ ذال کے زبر کے ساتھ۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ ﴿فاهريق﴾ دراصل اریق تھا ”ہا“ کو حمزہ سے بدل کر اس پر مزید ایک حمزہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں انڈیل دیا گیا۔

حاصل کلام: ترمذی نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے نیز یہ بھی مسئلہ ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ زمین نرم و سبیل ہو یا سخت و صعب۔ مزید برآں اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام، نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا سختی اور درشتی نہ کرنا، حضور ﷺ کا حسن خلق اور نہایت عمدہ طریقہ سے تعلیم دینا وغیرہ باتیں نمایاں ہیں۔

راوی حدیث: ﴿حضرت انس رضی اللہ عنہ﴾: حضور ﷺ کے خادم خاص ہیں ان کی والدہ ام سلیم نے آپؐ کی خدمت کیلئے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ مدنی زندگی میں آخری سانس تک خدمت کرتے رہے۔ ابو حمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلہ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ وہ ۹۱ھ کو فوت ہوئے اور بصرہ میں ہی دفن ہوئے۔

(۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مِمْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمِمْتَتَانِ فَالْجَرَادُ وَالْحُوثُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطَّحَالُ». آخرجه أحمَدُ وأَبْنُ مَاجَه، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ دو مری ہوئی چیزیں (جنہیں ذبح نہ کیا گیا) ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔ باقی رہے دو خون تو اس سے مراد ایک جگر اور دوسری تلی ہے۔“ (احمد اور ابن ماجہ نے اسے

روایت کیا ہے اور اس میں کمزوری ہے)

حاصل کلام: مصنف نے اس روایت کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مرجائیں خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ، وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند عبدالرحمن بن زید بن اسلم وہ اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ جیسا کہ امام ابو زرعہ اور ابوحاتم نے کہا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد یعنی عبداللہ اور عبدالرحمن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان (یعنی زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے البتہ امام احمد بن حنبل ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ گو اس حدیث کا سند موقوف ہونا صحیح ہے، مگر یہ مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا ”أُحِلَّتْ لَنَا“ کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے یا ”حرم علینا“ کہنا اسی طرح حکماً مرفوع ہے جیسے ”أمرنا“ یا ”نہینا“۔

یہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ ٹڈی بہر صورت حلال ہے۔ خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سب سے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث بالا امام صاحب کے فتویٰ کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کی تردید کرتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو خواہ دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو۔ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مرجائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو حلال نہیں حرام ہے۔ حدیث بالا احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداؤد کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دل دونوں حلال ہیں چاہے خود مرجائیں یا کسی طریقہ سے مار دیا جائے دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں، ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مِمْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمِمْتَتَانِ فَالْجَرَادُ وَالْحُوثُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطَّحَالُ». آخرجه أحمَدُ وأَبْنُ مَاجَه، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تمہارے کسی

﴿عَلَيْهِ السَّلَامُ﴾: «إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابٍ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءٌ، وَفِي الْآخَرِ شِفَاءٌ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَزَادَ: «وَأِنَّهُ يَبْقَى بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہئے اس لئے کہ اس کے ایک پر میں مرض (کے جراثیم) ہوتے ہیں اور دوسرے میں شفا و علاج کے۔“ (اس کو بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔) ابوداؤد کی روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ مکھی مشروب میں اپنا وہ پر ڈبوئی ہے جس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

لعوی تشریح: ﴿الذباب﴾ پیش اور تخفیف کے ساتھ۔ سب کے جانی پہچانی۔ یعنی مکھی۔ ﴿شراب﴾ پینے کا ہر مشروب۔ ﴿فلیغمسہ﴾ ”میم“ کے زیر کے ساتھ۔ ﴿غمس﴾ سے۔ ”غمس“ کے معنی پانی یا مائع یعنی بننے والی چیز میں غوطہ لگانا، ڈبکی مارنا۔ ﴿لینزعہ﴾ نزع سے۔ باہر نکالنا، کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں پر لام، لام امر ہے اور معنی ہوئے کہ غوطہ دینا اور نکالنا چاہئے۔ ﴿والجنح﴾ سے مراد پر، جس کے ذریعہ پرندہ پرواز کرتا ہے، اڑتا ہے۔ ﴿داء﴾ بیماری اور مرض اور ایک روایت میں ”سما“ بھی منقول ہے۔

حاصل کلام: ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ مکھی اپنا وہ پر بچا کر رکھتی ہے جس میں بیماری اور مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یعنی مکھی جب مشروب میں پر ڈالتی ہے تو اپنا بیماری والا پر اس لئے ڈالتی ہے کہ اپنا آپ بیماری سے بچالے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ ہے کہ مکھی زہر والا پر آگے کرتی ہے اور جس میں شفاء ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ غوطہ دینا اور ڈبکی دے کر نکالنے میں مقصود بیماری کو توڑنا اور زہر کو شفا کے ذریعہ زائل کرنا ہے۔

حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مکھی اگر کسی سیال چیز میں گر کر مرجائے تو وہ نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس میں بننے والا خون ہی جسم میں موجود نہ ہو۔ مثلاً شہد کی مکھی، مکڑی، بھڑ وغیرہ اور انہیں سے ملتے جلتے دیگر پرند۔ تو ان کے کسی مشروب یا بہہ نکلنے والی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس اور ناپاک نہیں ہو جاتا، کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو بہہ جانے والا خون ہے جو اس کی موت کے وقت جسم سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور مذکورہ حیوانات میں یہ سبب یعنی خون ہی موجود نہیں۔ اس لئے ان کے مائع قسم کی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفع ضرر کیلئے مکھی کا مارنا جائز ہے ورنہ بغیر کسی ضرورت معقول کے کسی کو مارنا ناروا فعل ہے۔ یہ تو معلوم حقیقت ہے کہ اکثر اوقات مکھی گرم چیز میں گر کر مرہی جاتی ہے اور بعض اوقات ٹھنڈی چیز میں ڈبکی دینے سے بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پینے کی کسی چیز میں مکھی کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہیں ہو جاتی بلکہ اس صورت میں اسے ڈبکی دے کر باہر پھینک دینا

چاہئے۔

(۱۳) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيمَةِ، وَهِيَ حَبِئَةٌ، فَهُوَ مَيْتٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور وَالتَّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿ما قطع﴾ یہاں ”ما“ موصولہ ہے اور ”قطع“ فعل بنی مفعول کے لئے ہے۔ یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا۔ ﴿البہیمۃ﴾ ہر چار پاؤں پر چلنے والا جانور مگر چیر پھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ ﴿وہی حیۃ﴾ اس میں ”واو“ حالیہ ہے یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا بلکہ زندہ ہو۔ ﴿فہو﴾ سے مراد زندہ جانور سے جو کچھ کاٹ کر الگ کر لیا گیا وہ مردہ ہے، اس کا کھانا حرام اور نجس ہو جاتا ہے۔ پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

حاصل کلام: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کانا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے۔ لہذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو واقد لیثی﴾ ابو واقد کنیت ہے اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنی عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں اس لئے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بدر کے غزوہ میں شریک تھے۔ بعد میں مکہ کی رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ھ / ۶۸ھ میں وفات پائی۔ جبکہ ان کی عمر ۵۵ برس تھی۔ فسنج میں مدفون ہوئے۔

برتنوں کا بیان

۲ - بَابُ الْآيَةِ

(۱۴) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَشْرَبُوا فِي آيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور ان کے پیالوں میں کھایا بھی نہ کرو۔ دنیا میں یہ کافروں کیلئے ہیں اور آخرت میں فقط تمہارے لئے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الانیۃ﴾ انیۃ، اناء کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ ”ابواب الطہارت“ کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنہیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاکباز

انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿صحافہا﴾ صحاف صحفہ کی جمع ہے جس کے معنی پیالہ کے ہیں۔ ﴿لہم﴾ سے مشرکین مراد ہیں۔ ﴿فی الدنیا﴾ یعنی دنیا میں یہ برتن ان کیلئے ہیں، کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کیلئے حلال ہیں بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ جس پر یہ مشرکین عملاً کاربند ہیں۔ یعنی دنیا میں یہ برتن مشرکین کے استعمال میں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا، پینا حرام ہے اور ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا عموم کے اعتبار سے حرام ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں، ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہرات و یاقوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا اور پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہر حال بہتر اور اولیٰ ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا یا ان برتنوں کے پانی سے وضو و غسل کرنا سب حرام ہے۔
راوی حدیث: ﴿حضرت حذیفہؓ﴾: حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابی باپ یمانؓ کے بیٹے ہیں اور راز دان رسالت مآب ﷺ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمانؓ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۶ یا ۳۵ھ میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(۱۵) وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَدَّثَتْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ بَرْتَنٍ فِي جَنَّمَ كَيَوْمَ يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ» (بخاری و مسلم)
حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اندھیلتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بجرجر﴾ ”جرجرہ“ سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت گلے میں پانی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے ”جرجرہ“ کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کیلئے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نار جہنم کا اندھن ہوں گے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلمہؓ﴾ ان کا نام ہند بنت ابی امیہ۔ ابو سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسود الحزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں۔ غزوہ احد میں ابو سلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے یہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ھ میں حضور ﷺ نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ۵۹ھ میں یا ۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ بقیع قبرستان میں

دفن ہوئیں۔

(۱۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا رَوَايَتُ كَرْتِے ہں اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا دُبِغَ الْإِهَابُ فَقَدْ حُزِرَ» (مسالہ لگا کر) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو طہر۔ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الْأَرْبَعَةِ جاتا ہے۔ (مسلم) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ منقول «أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ» ہیں کہ ”جو نسا چڑھ بھی رنگا جائے۔“

لغوی تشریح: ﴿دبغ﴾ دبغ سے ماخوذ ہے۔ یہاں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ چڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدلو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ ﴿الاہاب﴾ بروزن کتب۔ مطلق چڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ہنوز رنگ نہ گیا ہو۔ ﴿ایما اہاب دبغ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام چڑے شامل ہیں۔ ”ایما“ عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

حاصل کلام: پس حدیث اپنے عموم پر رہتے ہوئے یہ مطلب دے رہی ہے کہ ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چڑے اس میں شامل ہیں اور خنزیر یعنی سور کا چڑھ بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چڑھ بھی اس زمرے میں شامل ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چڑھ بھی اس میں شامل ہے جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چڑھ پاک ہو جاتا ہے، وہ چڑھ خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا ہو، جانور خواہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا، مثلاً خنزیر کا چڑھ ہے اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چڑھ ہے اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے، تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انہیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح رائے نہیں ہے اسی طرح احناف کا کتے کے چڑے کو دباغت کے بعد حلال قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ، بال، دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جاسکتی ہیں نیز ان کی تجارت بھی کی جاسکتی ہے۔

(۱۷) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبَّبِ حَضْرَتِ سَلَمَہ بن محبّق رَوَايَتُ كَرْتِے ہں کہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ الْمَيِّتَةِ» (مردہ جانوروں کے چڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔) (ابن حبان طہورُہا۔ صَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ۔ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿سَلَمَةُ﴾ ”سین“ ”لام“ اور ”میم“ کے زبر کے ساتھ۔ ﴿الْمَحْبِقُ﴾ ”میم“ کی پیش، حاء کی زبر، ”باء“ کی تشدید اور زیر کے ساتھ، مگر محدثین ”با“ پر فتح کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابوسفیان ان کی کنیت ہے۔ بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ ہذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انہیں ان کے بیٹے ”سنان“ کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے فرمایا۔ جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بَشَاةٍ يَجْرُونَهَا، فَقَالَ: «لَوْ أَخَذْتُمْ إِيَّاهَا» فَقَالُوا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ، فَقَالَ: «يَطْهَرُهَا الْمَاءُ وَالْقَرْطُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ.

”اس کو پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دیتی ہے۔“
(ابوداؤد - نسائی)

لغوی تشریح: ﴿القرط﴾ ”قاف“ اور ”راء“ کے زیر کے ساتھ۔ کیکر کے پتے، چھال۔ عرب میں اس کے ساتھ چڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔

حاصل کلام: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے برتنوں سے وضو وغیرہ بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ مردار چوپایوں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے لہذا ایسی کھال سے ڈول وغیرہ بنانا جائز ہے۔

(۱۹) وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْحُسَيْنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا بِأَرْضِ قَوْمٍ أَهْلُ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي آيَتِهِمْ؟ قَالَ: «لَا تَأْكُلُوا فِيهَا إِلَّا أَنْ لَا تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاعْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا».

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ثعلبہؓ "خشنی رحمہ اللہ" روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں کیا ہم ان کے استعمال کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ جواب میں آپؐ نے فرمایا "ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، البتہ اگر ان کے ماسوا اور برتن میسر نہ ہو سکیں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔" (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿انا﴾ مرہزہ کے کسرہ ”نون“ کی تشدید کے ساتھ، ضمیر متکلم کے ساتھ حرف تاکید ہے، ﴿اہل الکتاب﴾ کتاب والے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور یہ لفظ ان کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ ﴿افساکل فی انیتھم﴾ ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب پیتے ہیں۔ ابو داؤد اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت و وضاحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے پینے کے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ”پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ، پیو۔“ آپؐ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خورد و نوش سے احتراز کرنا چاہئے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آجائے۔ پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو پھر بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کیلئے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کیلئے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندگی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا، ان میں پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ناپاک اور نجس چیزیں ان میں پکاتے ہیں۔ جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود، دھریوں اور ملحدوں کے ان برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہئے جن میں ناپاک و نجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راوی حدیث: ﴿ابو ثعلبۃ الخشنی﴾ ”خاء“ کے پیش اور ”شین“ کی زیر کے ساتھ، خشین بن نصر جس کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا، کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشنی کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ہیں کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ﷺ وَأَصْحَابَهُ تَوَضَّؤُوا مِنْ مَرَادَةِ مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر اس سے امْرَأَةٍ مُشْرِكَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ. وضو کیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا طویلہ ہے۔)

لعوی تشریح: ﴿مزادۃ﴾ میم کے زبر اور زائے معجمہ کے ساتھ۔ مشکیزہ کے معنی میں آیا ہے۔ جس کی

ساخت چمڑے سے ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے بھی زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی جانب راہنمائی ملتی ہے اور یہ اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزہ سے آپؐ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضہ میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذباحہ تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز و درست ہے اور اس حدیث سے دباغت شدہ کھال کے پاک ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمران بن حصینؓ﴾ خزاعی کعبی تھے۔ ان کا شمار اکابر صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ ان کی کنیت ابو نجد تھی۔ غزوہ خیبر کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی۔ -

(۲۱) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ
 اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ قَدْحَ النَّبِيِّ ﷺ
 انْكَسَرَ فَأَتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً
 مِنْ فِضَّةٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی
 کریم ﷺ کا ذاتی پیالہ ٹوٹ گیا تو آپؐ نے اس ٹوٹی
 جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿القدح﴾ ”قاف“ اور ”دال“ دونوں پر زبر۔ چھوٹا ”پیالہ“۔ ﴿الشعب﴾ ”شین“ کے زبر اور ”عین“ کے سکون کے ساتھ۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ ﴿سلسلۃ﴾ دونوں جگہ سین پر زبر۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا، جوڑنا اور دونوں جگہ سین کے زیر کے ساتھ بھی ہے تو اس صورت میں لڑی، زنجیر وغیرہ کے معنی ہوں گے۔ وہ لوہے کی زنجیر دھاگے کی طرح باریک ہوگی۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کیلئے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورت اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو، غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ سونے، چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور تعلیٰ کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور تعلیٰ خالق کائنات کو پسند نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ کو تار کے ذریعہ پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کبر و مغرور اور تعلیٰ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

دور کرنے کا بیان

(۲۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَى عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَارِءِ بْنِ رَافِعٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا» . عَنْ الْحَمْرِ تَتَّخِذُ خَلًا؟ قَالَ: «لَا» .

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَارِءِ بْنِ رَافِعٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا» . عَنْ الْحَمْرِ تَتَّخِذُ خَلًا؟ قَالَ: «لَا» .

بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ایسا کرنے سے اَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ منع فرمایا۔ (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن الخمر﴾ یعنی حرمت شراب کے بعد۔ شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ﴿خل﴾ ”خاء“ کے فتح اور لام کی تشدید، شراب یا انگور وغیرہ کے شیرہ سے تیار کردہ سرکہ، یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنا لینا جائز ہے یا نہیں؟ ﴿فقال: لا﴾ اس کے جواب میں فرمایا ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نبی تحریم کیلئے ہے۔

حاصل کلام: اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔ البتہ اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ شراب جب سرکہ بن جاتا ہے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں کیا رائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن شراب کا سرکہ بنانا ممنوع ہے۔

اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کے حکم آنے کے بعد انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اس نقصان سے بچنے کیلئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں آپ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ اس حدیث (اور دیگر اولہ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَتَدَاي: أَنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ، فَإِنَّهَا دُونُ تَمْهِيسٍ غَيْرِ لُحُومِ الْبُحَارِ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جس روز غزوہ خیبر تھا رسول اللہ ﷺ نے ابو طلحہ کو حکم دیا (کہ لوگوں کو مطلع کر دیں) انہوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ دونوں تمہیں گھریلو گدھوں کے گوشت کو کھانے سے منع فرماتے ہیں، کیونکہ وہ رجس (نپاک) ہے۔ (بخاری

و مسلم

لغوی تشریح: ﴿یوم خیبر﴾ سے غزوہ خیبر کے روز مراد ہے۔ خیبر مدینہ کے شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم ۷ھ میں یہ غزوہ یہود کے ساتھ واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو یتاء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ﴿یسہانکم﴾ میں تنزیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ ﴿الحمرة﴾ ”حاء“ اور ”میم“ کے پیش کے ساتھ۔ اس کا واحد حمار ہے۔ اردو میں جسے گدھا کہتے ہیں۔ ﴿الاهلیہ﴾ ”گھریلو (جنگلی نہیں) اہلیہ“ کی نسبت اہل کی طرف ہے یعنی وہ جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کے ہاں پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ ﴿رجس﴾ راء کے زیر سے۔ ہر وہ چیز جسے ایک انسان گندگی تصور کرتا ہے خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو۔ لہذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

حاصل کلام: گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے جازز سمجھتے ہیں۔ گدھے کا جوٹھا ائمہ اربعہ کے نزدیک پاک ہے۔ بعض فقہاء مثلاً امام حسن بصری رضی اللہ عنہ اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہ وغیرہ اسے ناپاک کہتے ہیں۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے قابل ترجیح اور زیادہ قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ﴾: ابو طلحہ کنیت۔ نام زید بن سہل بن الاسود بن حرام انصاری، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور اس کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ احد میں حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ہاتھ شل ہو گیا۔ معرکہ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ھ یا بقول بعض ۵۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۴) وعن عمرو بن خارِجَةَ حضرت عمرو بن خارِجَةَ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: حَظَبْنَا اللّٰهَ ﷺ نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنًى وَهُوَ عَلٰی خُطْبٍ فرمایا اور اس اونٹنی کا لعاب دہن میرے رَاحِلَتِيْ، وَلُعَابُهَا يَسِيْلُ عَلٰی كَتِفِيْ. کندھوں پر بہتا تھا۔ (احمد و ترمذی۔ اور ترمذی نے اس کو اَخْرَجَهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔ صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿بمنی﴾ تنوین کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ساتھ یہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے مشہور ترین شعائر میں سے قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ﴿لعابها﴾ ”لام“ کے ضمہ کے ساتھ۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی اور گرتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن خارجه بن منتفق اسدی﴾: بقول بعض اشعری اور بقول شخصے انصاری اور کسی کے بقول جمحی قبیلے سے ہیں۔ ابوسفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اسدی ہونے کے بارے میں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتْ عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَغْسِلُ الْمَنَى ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ فِي ذَلِكَ الثَّوْبِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى أَثَرِ الْغَسْلِ فِيهِ. متفق علیہ. آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

ولمسلم: «لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَرَكًا، فَبَصَلْتَنِي فِيهِ. وَفِي لَفْظٍ لَهُ: «لَقَدْ كُنْتُ أَحْكُهُ بِإِبْسَاءٍ يُطْفِرِي مِنْ ثَوْبِهِ»۔ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپؐ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: ﴿افركه﴾ اس میں ضمیر متصل ”ء“ سے مراد منی ہے۔ راء کے کبھی پیش سے اور کبھی زیر کے ساتھ۔ باب نصر ینصر اور ضرب یضرب دونوں سے آتا ہے۔ ﴿الفرک﴾ کے معنی مل کر صاف کرنا کہ اس کا اثر زائل ہو جائے۔ ﴿احکھ﴾ میں بھی ضمیر متصل ہ سے مراد منی ہے۔ ”حاء“ کے پیش کے ساتھ ”حک“ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنا کے آتے ہیں۔ ﴿یباسا﴾ حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

حاصل کلام: اس بارے میں وارد تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ وہ خشک ہو یا تر، بلکہ اس کو زائل کرنے کیلئے جبکہ وہ خشک ہو اتنا کافی ہے کہ اسے صاف کر دے ہاتھ سے یا کپڑے کے ٹکڑے سے یا اذخر گھاس سے اور ان دونوں جیسی چیزوں مثلاً لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے۔ ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تعبداً منی کو دھو کر ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے، اسے مل کر، رگڑ کر وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کا نجس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا۔ پس صحیح موقف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے لہذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعہ سے اس کو پاک کیا جائے۔

مگر علامہ شوکانی نے المسیل الجرار اور الدرد البہیمہ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ اس میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آبِ بنی اور لعبِ دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی امام شافعی رحمہ اللہ، داؤد ظاہری رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ ائمہ میں سے اور صحابہ میں سے حضرت علی رحمہ اللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ، حضرت ابن عمر رحمہ اللہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رحمہ اللہ کرتی ہیں اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کرتے ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خشک منی کھرج دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرج دینا ہے، اس کے بعد چونکہ کپڑا دھویا نہیں گیا اس لئے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد ص: ۱۱۹-۱۲۶ ج ۳ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما﴾: ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی اہ میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ یا ۵۸ھ کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ بکفرت احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی برأت آسمان سے نازل ہوئی۔ جس کا قرآن مجید کی سورہ نور میں ذکر ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے حجرہ میں مدفون ہیں۔

(۲۶) وَعَنْ أَبِي السَّمْعِ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ، وَبِرْسُ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابو السمع رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”لڑکی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں گے۔“ (اسے داؤد و التیمی، و صححہ الحاکم۔

لغوی تشریح: ﴿من بول الجارۃ﴾ اس میں ”من“ تعلیل یعنی علت و وجہ کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے، بدن وغیرہ پر لڑکی کے پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ ﴿الجاریۃ﴾ لڑکی، بچی کے معنی۔ ﴿برس﴾

”رش“ سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور معنی اس کے چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصہ پر پانی غالب آئے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

حاصل کلام: حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں شرعی حکم الگ الگ ہے۔ لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونے کا اور لڑکے کے پیشاب کیلئے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کے پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خواری کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خواری کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، ابن وہب رحمہ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری رحمہ اللہ اور اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دھونا قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوالسمع﴾ ”سین“ پر زبر اور ”میم“ ساکن۔ ابوالسمع اس کی کنیت ہے۔ ایاد (ہمرہ کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے خادم تھے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گم ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲۷) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا روایت کرتی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کا خون جو کپڑے کو لگ جائے کے متعلق فرمایا۔ ”پہلے اسے کھرچ ڈالو پھر پانی التَّوْبَ: «تَحْتُهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالْمَاءِ، سے مل کر دھو لو پھر اس پر کھلا پانی بہاؤ پھر اس میں ثُمَّ تَنْصَحُهُ، ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ». مُتَّفَقٌ نماز پڑھ لو۔“ (بخاری و مسلم) عَلَيَّہِ

لغوی تشریح: ﴿تحتہ﴾ ”تا“ کے فتح ”حاء“ کے ضمہ اور دوسرے ”تا“ کے تشدید اور ضمہ کے ساتھ باب نصر سے صیغہ مؤنث ”حت“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی تلنا اور کھرچنا ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کھرچ کر دور کر دینا اور ”ہ“ کی ضمیر منصوب ”دم“ کی جانب راجع ہے۔ ﴿ثم تقررہ﴾ اس میں ”ہ“ کی ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے ”ر“ پر ضمہ ہے، باب نصر سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا

جائے۔ یعنی عورت اس کپڑے پر پانی ڈال کر اچھی طرح بھگو کر ترکر لے پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اطراف کے ساتھ اچھی طرح مل کر دھوئے، تاکہ خون کا جتنا حصہ کپڑے میں جذب ہو چکا تھا وہ اس سے خارج ہو جائے۔ ﴿ثم تنضحه﴾ ”ضاد“ پر فتح اور اسے کسرہ دینا بھی جائز ہے۔ فتح بفتح اور ضرب بضرب سے۔ معنی یہ ہوئے کہ آخر میں اس پر اچھی طرح پانی بہاؤ۔

حاصل کلام: خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے، تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے پھر اسے دھونے کا حکم ہے، تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھا۔ نضح کا اس مقام پر موقع کی مناسبت سے معنی غسل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ باب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔

خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جاسکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول ﷺ کی بڑی بہن۔ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۷۳ھ میں اپنے بیٹے عبد اللہ کے قتل کئے جانے کے ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت گرا اور نہ ہی عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَتُ خَوْلَةَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَإِنْ لَمْ يَذْهَبِ الدَّمُّ؟ اَجْهِيَ طَرَحَ مَلَّ كَرْدَهْوَنَ كَ (اگر خون آلود کپڑے کو اچھی طرح مل کر دھونے کے باوجود خون کا نشان ختم نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا ”بس تیرا اس پر اچھی طرح پانی بہانا کافی ہے، اس کا نشان تیرے لئے ضرر رساں نہیں۔“ (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿فان لم يذهب﴾ یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے، رگڑنے اور کھرچنے کے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا اثر نہ جائے۔ ﴿يكفيك الماء﴾ یعنی پانی کے ساتھ دھونا تیرے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی تذبذب، تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی ماندہ اثرات و نشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں چونکہ ابن لہیعہ ایک ایسا راوی ہے جسے علماء فن رجال نے ضعیف قرار دیا ہے ورنہ جہاں تک حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے وہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿خولہؓ﴾ خاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبد البر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی۔ مگر مولف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الاصابہ)

وضو کا بیان

۴ - بَابُ الْوُضُوءِ

(۲۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ «لَوْلَا أَنِ أَشَقُّ عَلَى أُمَّتِي لِأَمْرِهِمْ بِالسُّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ». أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَلْقِيفًا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اگر مجھے اپنی امت کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔“ (مالک، احمد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اس کو تعلقاً نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿باب الوضوء﴾ ”واؤ“ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو دھونا۔ مطلقاً اور شرعاً دونوں طرح دھونے کو شامل ہے۔ وضو کا عمل اس سے سب واقف ہیں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر وضو میں ”واؤ“ کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی اس برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

﴿لو لا ان اشق﴾ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو کہیں تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ کر دوں۔ ﴿لا امرتهم﴾ تو میں ان کو حکم دیتا۔ اس میں امرایجاب کے حکم میں۔ یعنی میں واجب قرار دیتا۔ ایسا حکم صادر ہے۔ فرمانے سے رکنارفع مشقت کی مصلحت کے پیش نظر اس کا مقتضی ہے۔ مسواک کرنا مننون ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مننون ہے۔ مسلم اور ابوداؤد میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔ مزید یہ کہ مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ مسند امام احمد، ابن خزیمہ، حاکم اور دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب

بے مسواک نماز سے سترگنا زیادہ ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر پہلے سے وضو موجود ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے مسواک کر لینی چاہئے تاکہ اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(۳۰) وَعَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ عُثْمَانَ دَعَا بَوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضَّمَصَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْشَرَهُ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا. مَثَقُ عَلَيْهِ.

حضرت حمران مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ پہلے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں۔ پھر منہ میں پانی ڈال کر کلی کی پھر ناک میں پانی چڑھایا اور اسے جھاڑ کر صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر اپنا دایاں اور بایاں پاؤں ٹخنوں تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح ابھی میں نے وضو کیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بوضوء﴾ ”واؤ“ کے فتح کے ساتھ۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ ﴿تمضمض﴾ المضمضہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے وہیں گردش کرائے۔ پھر باہر پھینک دے۔ ﴿استنشق﴾ استنشاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کا ناک کے داخلی حصہ میں پہنچا کر بذریعہ سانس سے اوپر چڑھانا۔ ﴿استنشر﴾ ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا۔ ﴿المرفق﴾ کمرہ کے ساتھ۔ ”ر“ ساکن اور ”قا“ کی فتح کے ساتھ۔ بازو کی ہڈی یعنی کلائی کے جوڑے بازو کے اوپر والے حصے کا ہڈی کا جوڑے۔ یعنی کہنی۔ ﴿الی الکعبین﴾ ٹخنوں تک۔ پنڈل اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنہیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ ان کا تعلق وضو سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: من تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهَا نَفْسَهُ غُفْرَانَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ کہ ”جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا، پھر اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے اعضاء وضو میں سے ہاتھ منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا

عَاصِمٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

متعلق مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھ سر کے آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی جانب واپس لے آئے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي لَفْظٍ لَّهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَا، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ.

ایک روایت میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ آپ سر کے اگلے حصہ سے شروع کر کے ہاتھوں کو سر کے پیچھے حصہ یعنی گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لَعْنَى تَشْرِحَ: ﴿اقْبَلْ بِيَدَيْهِ وَادْبِرْ﴾ یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصہ سے شروع کیا اور سر کے آخری حصہ تک لے جا کر واپس اسی مقام پر لے آئے۔ اس کی وضاحت ﴿بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ﴾ کا جملہ کرتا ہے۔ ﴿قَفَا﴾ سر کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کے پیچھے حصہ کے ساتھ ملحق ہے۔ ﴿رَجَعَ﴾ جمع سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

حَاصِلُ كَلَامٍ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سر کے مسح کا آغاز سر کے اگلے حصہ سے کیا جانا چاہئے۔ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ) کے علاوہ اسحاق بن راہویہ کی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت جسے ترمذی نے حسن کہا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پیچھے حصہ سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حائظی کی وجہ سے جرح کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن زید بن عاصم رحمہ اللہ﴾ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے۔ غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت میلہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ھ میں معرکہ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ یہاں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ عبداللہ بن زید وہ ہیں جنہوں نے خواب میں اذان سنی تھی۔ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ تھے۔ گویا دادا دونوں کے الگ الگ تھے۔ ابن عبد ربہ کا ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے وضو کی کیفیت کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے اپنے سر کا مسح

أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظٌ كَے برتن میں نہ ڈالے۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں کہ رات بھر ہاتھ کہاں کہاں گردش کرتا رہا (اور کس کس چیز کو چھوتا اور مس کرتا رہا) ”(بخاری و مسلم، منسلح)۔

مذکورہ بالا حدیث میں مذکورہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿فلا یغمس﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ معنی ہیں کہ داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ اسے واجب قرار دیتے ہیں اور جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ کا دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں مذکور لفظ فی الاناء اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کیلئے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لئے ہے البتہ نہراور بڑا حوض و تالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں یہی بیان کیا ہے۔

(۳۶) وَعَنْ لَفِیْطِ بْنِ صَبْرَةَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللہِ ﷺ: «أَسْبَغَ الْوُضُوءَ، وَخَلَّلَ بَيْنَ الْأَصَابِعِ، وَبَالَغَ فِي الْأَسْتِشْقَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ. وَلَا يَبْنِي دَاوُدُ فِي رَوَايَةٍ: «إِذَا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمُضٌ». حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”وضو اچھی طرح پورا کرو اور انگلیوں کا خلال کرو، ناک میں پانی اچھی طرح چڑھایا کرو مگر روزے کی حالت میں (ایسا نہ کرو)“ (اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ ہیں ”جب تو وضو کرے تو کلی تَوَضَّأْتَ فَمَضْمُضٌ“۔

کر۔“

لعنوی تشریح: ﴿اسبغ﴾ اسبغ سے فعل امر ہے۔ اسبغ کے معنی ہیں، اعضاء وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔ ﴿خلل﴾ تخلیل سے فعل امر ہے۔ ”خلال“ یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ ﴿الان تکون صائما﴾ روزے دار کو پانی اتنا اوپر نہ چڑھانا چاہئے، تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ ناک کے اندرون پانی مبالغہ سے چڑھانا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اعضاء وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا، تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ﴾ ”لام“ کے فتح اور ”قاف“ کے کسرہ سے۔ صبرہ ”صاد“

کے فتح اور ”باء“ کے کسرہ کے ساتھ۔ نسب نامہ یوں ہے لقیط بن صبرہ بن عبد اللہ بن المنفق بن عامر العامری رضی اللہ عنہ۔ وفد بنی المنفق کے قائد تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں جو ابورزین العقیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ابن عبد البر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام مسلم رضی اللہ عنہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (الاصابہ۔ تہذیب)

(۳۷) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عُمَانَ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو تعالیٰ عنہ: أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَخْلُلُ کرتے ہوئے اپنی داڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔ لِحْيَتُهُ فِي الْوُضُوءِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، (ترمذی۔ اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

حاصل کلام: داڑھی کا خلال نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون ہے واجب نہیں۔

(۳۸) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بِثُلَاثِي مُدٍّ فَجَعَلَ يَذْلُكُ ذِرَاعِيهِ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپؐ نے دھونے کیلئے بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اسی﴾ مفعول واقع ہوا ہے۔ ﴿مد﴾ میم کے ضمہ اور وال کی تشدید کے ساتھ۔ پانی کا پیمانہ جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سمائے۔ آج کل کی اصطلاح میں چھ سو گرام وزن بنتا ہے۔ ﴿یدلک﴾ ملتے ہوئے دھونا۔ ﴿ذراعہ﴾ ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو ذراع یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

حاصل کلام: دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اتنے پانی سے وضو کیا اور ایک روایت میں ایک مد سے وضو کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حجازی مد، انگریزی سیر اور کلو سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

(۳۹) وَعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ
يَأْخُذُ لِأَذُنِهِ مَاءً خِلَافَ الْمَاءِ الَّذِي
أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَقَالَ:

إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضًا. لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ اور مسلم کے ہاں اسی سند سے یہ روایت بایں الفاظ بِلَفْظٍ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلٍ منقول ہے کہ ”آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا“ یعنی نیا پانی استعمال کیا اور یہی مسلم کی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿وہو عند مسلم﴾ سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مسلم کتاب الطہارت باب وضو النبی ﷺ) ﴿من هذا الوجه﴾ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ ﴿بماء﴾ حمزہ مجرور ہے۔ تنوین کے ساتھ۔ گرائمر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور ﴿غیر فضل بدیدہ﴾ اس کی صفت ہے اور ﴿الفضل﴾ کے معنی ضرورت سے زائد بچا ہوا یعنی وضو پوری طرح مکمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا، بلکہ مسح کیلئے نیا پانی لیا۔ ﴿وہو الم محفوظ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مشروع ہے مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”زاد المعاد“ میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کیلئے نیا پانی لینا ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج ۱، ص ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث سے واقف نہیں جس میں یہ بیان ہو کہ آپؐ نے کانوں کیلئے نیا پانی لیا اور اس پر کلام نہ ہو۔ ہاں! ابن عمر رحمہ اللہ کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں نافع کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کیلئے نیا پانی لیتے تھے۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا چاہئے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کیلئے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی، ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے کہ فمسح براسہ واذنیہ کہ آپؐ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۴۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے

نَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”قیامت ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ گے کہ وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے ہاتھ الْوُضُوءِ، فَمَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ تم میں سے جو شخص اس چمک يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ اور روشنی کو زیادہ بڑھا سکتا ہو اسے ضرور بڑھانی لُمُسِّلِمٌ۔ چاہئے۔“ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿غرا﴾ یاتوں کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اعراب اس طرح ہے کہ غین پر ضمہ اور راء پر تشدید ہے اور اغر کی جمع ہے اور ”اغر“ اسے کہتے ہیں جس کے سفیدی ہو اور ﴿غرہ﴾ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ ﴿محجلین﴾ تحجیل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں دمک اور چمک رہے ہوں گے۔ ﴿یطیل﴾ اطلاع سے ماخوذ ہے۔ دراز کرنے، لمبا کرنے اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿غرته﴾ اپنی چمک، روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک پانی پہنچانا ضروری و لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچانا۔

حاصل کلام: اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اعضاء وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا مثلاً ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں مگر امام مالک رضی اللہ عنہ اسے مستحب نہیں سمجھتے، وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین، تین مرتبہ دھوئے اور ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے اور ہر وقت با وضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ اس آخری جملہ کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور فتح الباری میں ہے۔ اس لئے اس سے مقررہ حد سے زائد حصہ کو دھونے پر استدلال محل نظر ہے۔ (اغاثۃ اللہفان، ص: ۲۰۰، ج: ۱)

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ جُوتَا پینے، بالوں میں کنگھی کرنے اور وضو کرنے ﷺ يُعَجِّبُهُ التَّيْمُنُ فِي تَعْلِهِ وَتَرَجُّلِهِ بلکہ ہر کام کیلئے دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ “ وَطُهورِهِ، وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿يعجبه التمين﴾ یعنی آپ کو دایاں آگے کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ ﴿فی تعله﴾

انس رضی اللہ عنہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، حسن بصری رضی اللہ عنہ، کھول رضی اللہ عنہ، ابو ثور رضی اللہ عنہ، امام احمد رضی اللہ عنہ، اوزاعی رضی اللہ عنہ، اسحق بن راہویہ رضی اللہ عنہ اور وکیع رضی اللہ عنہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ محض پگڑی پر مسح کو ناکافی سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ یا ابو عیسیٰ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ غزوہ خندق کے ایام میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ یہ ان کا پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے اور ۵۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

(۴۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حَدَّثَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا - فِي صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ ﷺ: «ابْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ هَكَذَا. (نسائی نے امر کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے یعنی حکماً فرمایا کہ ”ابتدا کرو“ جبکہ امام مسلم نے جملہ خبریہ میں اسے بیان کیا ہے یعنی ہم شروع کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی صفة حجة النبی ﷺ﴾ دراصل یہ اشارہ ہے اس لمبی حدیث کی طرف جو کتاب الحج میں بیان ہوئی ہے۔ ﴿ابدؤا وبما بدا اللہ بہ﴾ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے فرمایا ہے۔ اسے عملاً پہلے انجام دیا جائے اور یہ بات معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا جب آپؐ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا عزم کیا کہ پہلے صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے۔ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صفا کا ذکر پہلے کیا ”ان الصفا والمروة من شعائر اللہ“ (۲: ۱۵۸) لیکن مصنف حدیث کا اتنا ٹکڑا وضو کے باب میں اس لئے لائے ہیں کہ لفظ کے عموم کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ لفظ عام ہے کسی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سعی کے مسئلہ کے بارے میں مخصوص طور پر ذکر کیا ہے لیکن اس کے لفظ کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ کے ضمن میں وضو کی آیت بھی داخل ہے اور وہ ہے: ”فاغسلوا وجوهکم وابدیکم الی المرافق وامسحوا برؤوسکم وارجلکم الی الکعبین۔ (۷: ۵) اس بنا پر وضو میں چہرہ پہلے دھویا جائے گا اور باقی ماندہ اعضاء علی الترتیب دھوئے جائیں گے اور لفظ الخبر لانے سے مراد ہے کہ ابدئوا کی بجائے ببدأ سے کہنا چاہئے۔ چنانچہ نسائی نے صیغہ امر (ابدؤوا) کے ساتھ اور مسلم نے جملہ خبریہ یعنی (ببدأ) سے نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو باب الوضو میں لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اعضاء وضو کے دھونے میں

بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہئے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ”ان الصفاء والمروء“ یعنی سعی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور آیت وضو میں چہروں کا دھونا پہلے مذکور ہے ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں۔ اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ ”سلم“ سے تعلق کی بنا پر انصاری سہمی کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ ۷۴ھ میں ۹۳ برس کی عمر پر کوفت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(۴۵) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ إِذَا تَوَضَّأَ أَذَارَ الْمَاءَ عَلَى مِرْفَقَيْهِ. نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی ڈالتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس أَخْرَجَهُ الدَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ادار الماء﴾ پانی بہانا۔ اس حدیث کی سند میں قاسم بن محمد بن عقیل متروک راوی ہے۔

(۴۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ». حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”وضو کا آغاز کرتے وقت جس نے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی اس کا کوئی وضو نہیں۔“ (اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان کی بیان کردہ سند ضعیف ہے اور ترمذی نے یہ حدیث سعید بن زید سے روایت کی ہے اور اسی طرح اسے ابوسعید سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے ضعیف۔)

کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں) لغوی تشریح: ﴿لا وضوء﴾ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ کا پڑھنا وضو کیلئے رکن ہے یا شرط ہے۔ کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے۔ جیسا کہ لا (جو) نفی جنس پر دلالت کرتا ہے) کی ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے گویا کہا ہے کہ اس باب میں کوئی چیز ثابت نہیں مگر اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن الصلاح، ابن کثیر اور علامہ عراقی وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر میں علامہ البانی حفظہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے وضو کی ابتدا میں بھی ہر نوع بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عدا بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔

راوی حدیث: ﴿سعید بن زید رحمہ اللہ﴾ اس سے مراد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہے۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان خوش قسمت دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں لسان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں آنے کا یہ دونوں حضرات ذریعہ اور سبب بنے۔ معرکہ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵ھ میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(۴۷) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصْرَفٍ حضرت طلحہ بن مصرف رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ مضمضہ کو بچشم خود دیکھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھلی اور ناک کیلئے وَالْإِسْتِنْشَاقِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ (اس روایت کو ابو داؤد نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یفصل﴾ یفرق کے معنی میں، جس کے معنی فرق کرنا ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھلی کرنے کیلئے پانی الگ لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے الگ لیتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کھلی کے الگ اور ناک کیلئے الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ مصرف نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور یث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس بخاری اور مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کھلی بھی کر لیتے تھے، جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آ رہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحہ بن مصرف﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو عبد اللہ ہے۔ مصرف کا اعراب۔ ”میم“ کا ضمہ اور ”راء“ پر کسرہ اور تشدید۔ تابعین میں ثقہ شمار کئے گئے ہیں۔ طبقہ خامسہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت ہیں۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کے والد مصرف مجہول الحال ہیں۔

﴿عن جدہ﴾ ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن مجدب الیامی رحمہ اللہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ ”یام“ کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبد البر کے قول کے مطابق انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

وَالنَّسَائِي.

(۴۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ :- ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفِّ وَاحِدٍ، يَفْعَلُ ذَلِكَ ثَلَاثًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے وضو کے سلسلہ بیان میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا، ایک ہی چلو سے، ایسا آپؐ نے تین مرتبہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: دونوں احادیث کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے ایک ہی چلو کے کفایت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ طلحہ بن مصرف کی حدیث علیحدگی اور تفریق کی متقاضی ہے، لیکن وہ مصرف کے مجہول الحال ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ صاحب البیہ نے اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ دونوں طرح کی روایات یعنی جمع اور عدم جمع کے بارے میں اقرب بات یہ ہے کہ اختیار دیا گیا ہے، دونوں میں سے جس پر عمل کر لے۔ دونوں مسنون ہیں۔ اگرچہ جمع کرنے کی روایات تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحیح بھی ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ جو روایات صحیح اور متعدد ہیں وہ رائج اور دوسری مرفوح ہیں۔

(۵۰) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حَضْرَتِ اَنْسِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

عنه قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا وَفِي قَدَمِهِ مِثْلُ الظُّفْرِ لَمْ يُصْبِهِ الْمَاءُ، فَقَالَ: «ارْجِعْ فَأَحْسِنْ وَضُوءَكَ». (اسے ابو داؤد والنسائی۔
 طریق سے وضو کرو۔“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کیلئے آگ ہے۔ ابو داؤد میں بھی خالد بن معدانؒ سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپؐ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ جا پہلے تازہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے، مسح ناکافی ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے ان کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

(۵۱) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْذَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
 حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ”مد“ پانی سے وضو اور ”صاع“ یعنی چار سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الصَّاع﴾ چار مد کا ہوتا ہے اور مد ۳/۱ ارطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجود زمانہ کے پیمانہ کے حساب سے ۲۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہر طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کیلئے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

حاصل کلام: وضو اور غسل کیلئے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جتنا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا۔ جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلم میں ایک ”فرق“ پانی سے آنحضور ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ فرق ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً ساڑھے نو سیر پانی آتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں تو یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضور ﷺ دونوں ایک فرق سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ ذکر کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔

(۵۲) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيَسْبِغُ الوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلَّا فَتَحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ».

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرمایا: ”تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر یوں کہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور نیز میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، مگر اس کیلئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ اب جس دروازے سے چاہے داخل جنت ہو۔“ (مسلم، ترمذی) اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”اے اللہ مجھے توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں میں سے کر دے۔“

لغوی تشریح: ﴿الافتحت﴾ یہ الاستثناء کا ہے۔ اس سے مراد کلام اول میں جو حصر ہے اس کی نفی مقصود ہے اور ﴿فتحت﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغہ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے جس طرح ماضی کے گزر جانے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لا بدی امر ہے۔ ﴿وزاد﴾ سے مراد یہ ہے کہ ترمذی نے ﴿محمد عبدہ ورسولہ﴾ نقل کرنے کے بعد ”اللہم اجعلنی... الخ“ کے الفاظ مزید نقل کئے ہیں اور ﴿التواب﴾ میں ”واو“ مشدود ہے جس کے معنی ہیں جو شخص کثرت سے توبہ کرنے والا ہو۔

راوی حدیث: ﴿عمر رضی اللہ عنہ﴾ سے مراد عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ رضی اللہ عنہ۔ کنیت ابو حفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے آفاق ارض کو حکم، عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے سفیر تھے۔ ۶ نبوت ذی الحجہ کو دار ارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ اور بن فاطمہ رضی اللہ عنہ کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے مگر تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق، فارس، شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لولو کے اقدام سے مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ شہادت کا واقعہ ۲۴ھ محرم کا ہے۔

۵ - باب المَسْحِ عَلَى الْخُفَيْنِ۔ موزوں پر مسح کرنے کا بیان

(۵۳) عَنْ الْمُعْبِرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفِّيهِ، فَقَالَ: «دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا، آپ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپ کے موزے اتارنے کیلئے لپکا۔ آپ نے فرمایا ”چھوڑ دو میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔“ پھر آپ نے ان پر مسح فرمایا۔

لغوی تشریح: ﴿فاهویت﴾ میں نے اپنے ہاتھوں سے مدلی، سارا لیا یا پھر یہ معنی ہیں، حالت قیام سے نیچے کی طرف بیٹھنے کیلئے جھکا۔ ﴿لانزع﴾ اخرج کے معنی میں ہے کہ میں نکالوں۔ ﴿خفیه﴾ آپ کے موزے پاؤں سے نکالوں۔ ﴿دعہما﴾ اترک کے معنی میں آیا یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ ﴿طاهرتین﴾ حال واقع ہو رہا ہے معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک ہیں۔ اس لئے موزوں کو نہ نکالو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کئے ہیں اس وقت وہ پاک تھے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔

(۵۴) وَلِلْأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلَّا النَّسَائِيَّ: نَسَائِيَّ كَ عِلَادِهِ بَاقِي سَنَنِ كِي چَارُون كِتَابُون مِيں مَغِيرَه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الْخُفِّ ﷺ هِي سَ عِي الْفَاظ مَنَقُول هِيں كَ نَبِي ﷺ نَ مَوزُون كَ اَوَپر اَوَر نِيچَ دُونُون جَانَب مَسَح وَأَسْفَلَهُ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

نسائی کے علاوہ باقی سنن کی چاروں کتابوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہئے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح حسن روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثور بن یزید ہے جو رجاء بن حیوۃ کے واسطے سے بیان کرتا ہے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

(۵۵) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَا الدِّينُ بِالرَّأْيِ. دَارُودَار رَاۓ اَوَر عَقْل ۾ ہوتا تو پھر موزوں کی کھلی لَکَانَ اَسْفَلُ الْخُفِّ اَوَّلَى بِالْمَسْحِ. سَطَح ۾ مسح اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں

مِنْ أَعْلَاهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. أَخْرَجَهُ مَسْحُ كَرْتِے دیکھا ہے۔“ (ابوداؤد نے اس کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الہی پر ہے عقل و رائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کبھی جائز نہ ہوتا، بلکہ ٹخلی سطح پر ہوتا، کیونکہ گندگی سے آلودہ نچلا حصہ ہوتا ہے۔ لہذا نص صحیح کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(۵۶) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفَرًا أَنْ لَا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلِيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبُولٍ وَنَوْمٍ. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَابْنُ خُرَيْمَةَ وَضَحَّاهُ

ترمدی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمدی میں منقول روایت کے ہیں۔ ترمدی اور ابن خزیمہ دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿سفر﴾ یعنی مسافرین سین کے فتح اور ”فء“ کے سکون کے ساتھ۔ مسافر کی جمع ہے جسے ”رکب“ اور ”تجر“ راکب اور تاجر کی جمع ہے اور ﴿خفاف﴾ خف کی جمع ہے اور ﴿الامن جنابه﴾ اور ﴿ان لا ننزع﴾ میں جو نفی ہے اس سے استثناء ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں۔ خواہ ابھی مدت پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تین شب و روز مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

حاصل کلام: موزوں پر مسح بلا اختلاف جائز ہے۔ موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہؓ کی تعداد اسی (۸۰) کے لگ بھگ ہے۔ جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے ان کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے مسافر کیلئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہوگا، موزہ پہننے کے وقت سے نہیں، مثلاً ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کیلئے آغاز مدت

شام کا وقت ہوگا۔ مسح کا طریقہ اس طرح ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پانی سے تر کر کے ان کے پوروں کو پاؤں کی انگلیوں سے پٹنڈی کے آغاز تک کھینچ لے جائے۔ حدث لاحق ہونے کی صورت میں اگر موزہ اتار لیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اختتام مدت کے بعد بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿صفوان بن یثیر﴾ ”صاد“ کی فتح اور ”فاء“ کے سکون کے ساتھ۔ بن عسال عین کے فتح اور سین کی تشدید۔ صفوان بن عسال مرادی الجملی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ نبی ﷺ کی قیادت میں لڑے جانے والے ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے صحابہ کرامؓ میں سے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے۔

(۵۷) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ نَافِلَةٍ لِّلْمَسَافِرِ، وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِّلْمُقِيمِ، يَغْنِي فِي الْمَسْحِ عَلَى هَاتَيْنِ رِجْلَيْهِمَا مَسْحٌ وَاحِدٌ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسافر کیلئے موزوں پر مسح کے لئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات مدت مقرر فرمائی (مسلم)

(۵۸) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَرِيَّةً فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوا عَلَى الْعَصَائِبِ، يَغْنِي الْعَمَائِمَ، وَالتَّسَاخِينَ، يَغْنِي الْخِفَافَ. رَوَاهُ صَحِيحٌ قَرَارٌ دِيَا هِي.

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سریہ (یعنی چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور انہیں پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿سریہ﴾ سین پر فتح ”راء“ پر کسرہ اور ”یا“ پر تشدید۔ چھوٹا سا لشکر جسے دشمن کے علاقہ میں بھیجا جاتا۔ اہل مغازی نے سریہ اس کو قرار دیا ہے جس میں رسول اکرم ﷺ بنفس نفیس شامل نہ ہوئے ہوں اور جس میں آپؐ نے شمولیت بصورت قیادت فرمائی اسے علمائے مغازی کی اصطلاح میں غزوہ کہتے ہیں اور اس مقام پر اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ ﴿عصائب﴾ عصابة کی جمع ہے اور ﴿عمائم﴾ عمامہ کی جمع ہے۔ عصابة کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سر کو باندھا جاتا ہے اور ﴿تساخین﴾ ”تاء“ کے فتح کے ساتھ تسخان کی جمع ہے۔ جن کے معنی بالترتیب کسی راوی نے پگڑی اور موزہ کے کٹے ہیں۔ عصابة تو دراصل بیٹوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مرادی معنی ہیں۔ ابن ارسلان نے کہا کہ التساخین ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکیں خواہ وہ موزہ ہو یا جراب۔

حاصل کلام: بیٹوں سے مراد ایسی بٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو زخمیوں کے زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا باوزیا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں انہی کو عصاب کہا جاتا ہے۔ جنگ کیلئے روانہ کرتے وقت اس قسم کا حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران زخمی حضرات اعضاء وضو دھونے کی بجائے زخم کی بیٹوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ابو داؤد میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ نے سردی کی شکایت کی تو آپؐ نے پگڑی اور تساخین پر مسح کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿ثوبان بن جحدہ بن جحدہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ ثوبان کا اعراب "ثاء" پر فتح "واؤ" ساکن۔ اور بجحدہ میں "با" کے ضمہ جیم ساکن اور دال اول پر ضمہ اور دال ثانی ساکن اور بن جحدہ میں جیم پر فتح "حاء" ساکن، دال پر فتح۔ یہ سراقہ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ حمیر قبیلہ میں سے تھے۔ زندگی بھر حضور و سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجالاتے رہے۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے خرید کر آزادی سے ہسکار کیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۵۹) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مَوْفُوفًا، وَأَنْسِ مَرْفُوعًا: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَيْسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلَا يَحْلَعُهُمَا إِنْ شَاءَ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطَنِيُّ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "جب تم میں سے کوئی موزے پہن کر وضو کرے تو ان پر مسح کر لینا چاہئے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے، الا یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿لَا يَحْلَعُهُمَا﴾ یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے انہیں نہ نکالے۔

(۶۰) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْمًا وَلَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَيْسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطَنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے مسافر کیلئے (مسح کی مدت) تین دن اور تین راتوں کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات۔ اس حالت میں کہ اس نے با وضو ہو کر موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کر لینا چاہئے۔ (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿ابوبکرہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام نفع (تغیر نافع کی) بن حارث ہے۔ یہ طائف کے قلعہ سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعہ باہر آئے۔ اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ کبار و فضلاء صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۵۱ یا ۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھے۔

(۶۱) وَعَنْ أَبِي بَنْ عِمَارَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: يَوْمًا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ثَلَاثَةً؟ قَالَ: نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ.

حضرت ابی بن عمارہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا ”ہاں کر سکتے ہو“ عرض کیا ایک دن؟ آپ نے فرمایا ”ہاں ایک دن“ عرض کیا دو دن؟ آپ نے فرمایا ”ہاں دو دن“ میں نے عرض کیا تین دن؟ آپ نے فرمایا ”ہاں تین دن اور جب تک تیری مرضی ہو“۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے

اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث جو مدت کی تعیین کرتی ہیں کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ چونکہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں مسافر کیلئے تین دن، تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو ”شرح المہذب“ میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں۔ ابن الجوزی نے تو اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن عمارہ رضی اللہ عنہ﴾ حمزہ کے ضمہ ”باء“ کے فتح اور ”یاء“ پر تشدید۔ عمارہ عین کے نیچے کسرہ اور کبھی اوپر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینہ کے انصار میں سے مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر اس کی حدیث و سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

۶ - بَابُ نَوَاقِصِ الْوُضُوءِ وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

(۶۲) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ. حَتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُمْ، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں صحابہ کرامؓ نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی

لغوی تشریح: ﴿استحاض﴾ صیغہ مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کے اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ ﴿افداع﴾ اس میں مہرزہ استفہام کا ہے اور ”فناء“ تعقیب کیلئے ہے اور ﴿ادع﴾ ودع سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ ﴿انما ذلک﴾ اس میں ”کاف“ کے نیچے کسرہ ہے۔ اس لئے کہ مخاطب عورت ہے اور معنی یہ ہیں۔ خون کا بہنا۔ ﴿عرق﴾ عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ معنی یہ ہوئے رگ سے خون بننے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عازل یا عازر ہے۔ ﴿ولیس بحیض﴾ یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ﴿فاذا اقبلت حیضتک﴾ ”حا“ پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ ﴿فدعی﴾ چھوڑ دو۔ ﴿واذا ادبرت﴾ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ فاعل واقع ہو رہا ہے اور ضمیر حیض کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے جب خون بند ہو جائے۔ ﴿ثم توضئى لکل صلاة﴾ پھر ہر نماز کیلئے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حاصل کلام: عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض کا خون، یہ خون ہر ماہ عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوسرا نفاس کا خون ہے یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن، یا اس سے کم و بیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے، یہ خون متذکرہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے یہ ایک عازل نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے، ساری عمر بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا﴾ حبشہ - حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ قبیلہ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبد العزی بن قصی۔ یہ عبد اللہ بن حبش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انہوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(۶۴) وَعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كُنْتُ کے خارج ہونے کا مریض تھا۔ میں نے مقدار رضی اللہ عنہ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ سے کہا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق النَّبِيِّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: فِيهِ دریافت کریں۔ مقدار رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے الْوُضُوءِ. مُتَقَرَّرٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْمَخَارِجِ. بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہو گا یا غسل جنابت؟) آپ نے فرمایا ”ایسی حالت

میں وضو ہی ہے۔“ (بخاری و مسلم، البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

نغوی تشریح: ﴿مذاء﴾ ذال پر تشدید۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی خارج ہوتی رہتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید، رقیق لیس دار پانی ہے جو بیوی سے چھٹیڑ چھاڑ کے وقت اور جماع کے ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿فامرت المقتداد﴾ مقدار کو مسئلہ کی بابت پوچھنے کیلئے کہا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم ﷺ کی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیا داری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

راوی حدیث: ﴿مقداد رضی اللہ عنہ﴾ مہم کے کسرہ کے ساتھ۔ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ البھرائی الکندی۔ ان کی کنیت ابو الاسود یا ابو عمرو ہے اور مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں اور اسود سے مراد اسود بن عبد یغوث الزہری ہے۔ اس لئے کہ اس نے مقداد کو متبنی بنا لیا تھا اور جاہلیت میں اس کے ساتھ خلیفانہ تعلقات و روابط قائم کر لئے تھے۔ اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر چھٹا ہے۔ دو مرتبہ ہجرت کے شرف سے شرف یاب ہوئے۔ کبار، فضلاء اور بہترین اوصاف و خصائل کے مالک صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں واقع ہونے والے تمام غزوات میں شریک رہے۔ معرکہ بدر کے روز گھڑسواروں میں شامل تھے۔ فتح مصر میں حاضر تھے۔ ۳۳ھ میں جوف کے مقام پر جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، وفات پائی۔ ان کی میت کو اٹھا کر مدینہ لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان بقیع میں دفن کئے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ برس کی تھی۔

(۶۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبْلَ
بَعْضِ نِسَائِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ
وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَصَعَّفَهُ
الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ابراہیم تمبی کرتے ہیں مگر ابراہیم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں سنا۔ اس لئے یہ مرسل اور کمزور ہے۔ مگر بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدہ کیلئے جانے سے پہلے میرے پاؤں کو آپ اپنے ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضاء جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ لینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں اور ائمہ میں

سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(۶۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ، أَخْرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لَا؟ فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ، حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». أخرجه مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کیلئے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے، تاوقتیکہ (یقین نہ ہو جائے) ہوا کے خارج ہونے کی آواز یا بدبو سے محسوس کرے۔“

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وجد فی بطنہ شیء﴾ اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا۔ گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ ﴿اشکل﴾ مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ ﴿اخرج﴾ حمزہ اس میں استفہام کا ہے۔ یعنی اسے یہ شک میں مبتلا کر دے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ ﴿فلا یخرجن﴾ محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ ﴿حتی یسمع﴾ تاآنکہ وہ ہوا کے باآواز خارج ہونے کو سنے ﴿او یجد ریحاً﴾ یا پھر بے آواز ہوا کا پیٹ سے خارج ہونے والی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ اس باب میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم پر قائم رہتی ہے، تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

(۶۷) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسَسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلَاةِ أَعْلَيْهِ وَضُوءٌ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِنْكَ». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ، وَقَالَ ابْنُ الْمَدِينَةِ: هُوَ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہئے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں“ وہ تو تیرے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔“ ابن مدینی کہتے ہیں

أَحْسَنُ مِنْ حَدِيثِ بُسْرَةَ. (بسرہ کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوقال﴾ اس میں فاعل وہ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ ﴿الرجل یمس﴾ مبتداء اور خبر ﴿بضعة﴾ ”باء“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور ”ضاد“ ساکن ہے معنی اس کے گوشت کا ٹکڑا۔ ﴿منک﴾ سے مراد ہے کہ تیرے جسم کا ٹکڑا ہے جس طرح دیگر اعضاء جسم میں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصہ کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

حاصل کلام: علی بن عبد اللہ جو ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۳ھ میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ اور ابو داؤد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے بہت سے صحابہؓ اور تابعینؓ مس ذکر (یعنی شرم گاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ علی بن عبد اللہ یعنی ابن المدینی اور ابن المبارک اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دوسری طرف بہت سے صحابہؓ و تابعینؓ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں، ان کی دلیل بسرہ کی روایت ہے جو آئندہ آرہی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿طلق بن علی علیہ السلام﴾ ابو علی ان کی کنیت ہے۔ ”طاء“ پر فتح، ”لام“ ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی، یحییٰ، یمامی۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اسی وقت یہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبویؐ کی تعمیر میں زور و شور اور شوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

(۶۸) وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ بسرہ بنت صفوان رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ رضی اللہ تعالیٰ عنہا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». وضو کرنا چاہئے۔ ”(اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ أخرجه الخمسة، وَصَحَّه التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جَبَّانَ، ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کی وَقَالَ الْبُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا الْبَابِ. رائے یہ ہے کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے)

لغوی تشریح: ﴿من مس ذكره﴾ جس نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا یا ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ﴿فليتوضأ﴾ اسے وضو کرنا چاہئے یعنی نئے سرے سے نماز کیلئے وضو کرنا چاہئے۔

حاصل کلام: یہ حدیث صریح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے، اس لئے کہ کلام میں ایک مقرر حکم ہے، اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ متیقن

پڑے گی۔ ﴿وہو فی ذلک لا یتکلم﴾ اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بناء کیلئے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بناء نہیں کر سکتا، از سر نو پوری نماز پڑھنا ہوگی۔

حاصل کلام: مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں البتہ قے آنے، پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستہ سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بناء کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بناء والی حدیث ضعیف ہے اور مرسل ہے۔ نیز احادیث صحیحہ کے معارض و مخالف بھی ہے، لہذا اس کے ذریعہ حجت قائم نہیں ہوتی۔

ائمہ و فقہاء کا بناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں بناء کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب نمازی بے وضو ہو گیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بناء کس پر ہوگی۔ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن عمرؓ، جابر بن یزیدؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابن ابی اونیؓ، ابو ہریرہؓ اور تابعین میں ابن مسیبؓ، کھول رحمہ اللہ اور ربیعہ رحمہ اللہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔

(۷۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوْضَأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ. قَالَ: أَتَوْضَأُ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ. أَخْرَجَهُ اور اونٹ کے گوشت سے؟ فرمایا ”اونٹ کا گوشت منسئم۔“

کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاتوضاء﴾ حمزہ استفہام اس جگہ حذف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ ﴿من لحووم الغنم﴾ یعنی بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔ عام طور پر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا

لغوی تشریح: ﴿قال احمد﴾ سے مراد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ ﴿لا یصح شئی فی هذا الباب﴾ اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں کو دھولینا ہی کافی ہے۔“ (حاکم، بیہقی)

حاصل کلام: صحیح یہ ہے کہ ﴿من غسل میتا فلیغتسل﴾ میں حکم استحباب کیلئے ہے یعنی میت کو نہلانے والے کیلئے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دارقطنی اور مسند احمد میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما، عائشہ رضی اللہ عنہا، حسن بصری رحمہ اللہ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ حَضَرْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِعَمْرٍو بْنِ حَزْمٍ: أَنْ لَا يَمَسَّ الْفُرَّانَ إِلَّا طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُتَسَلِّماً، وَهُوَ مَعْلُومٌ. حَبَانُ نَے اس کو موصول بیان کیا ہے، نسائی اور ابن حبان نے اس کو موصول بیان کیا ہے، دراصل یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿الاطاہر﴾ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہوا یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ﴿وهو معلول﴾ مصنف نے اس روایت کو معلول غالباً اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داؤد یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد خولانی ہیں اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس لئے حدیث معلول نہ ہوئی۔ (السل)

حاصل کلام: طہارت دو قسم پر ہے ایک طہارت تو وہ ہے جس کی تعبیر حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا، ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ محض بے وضو ہونے کی صورت میں اختلاف ہے بہتر ہے کہ با وضو ہاتھ لگایا جائے۔ راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ﴾ یہ عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری،

برائے مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔
 ﴿عمرو بن حزم رحمہ اللہ﴾ عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابو ضحاک ان کی کنیت ہے۔ غزوہ خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لئے بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم سکھائیں۔ قرآن مجید پڑھائیں، لوگوں سے ملاقات کی وصولی کیلئے حسابات و نصابات ان کو تحریر کر کے سپرد کئے۔ عمر فاروق رحمہ اللہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ جو تحریر نبی ﷺ نے ان کو دی تھی اس میں فرائض، سنن، صدقات اور دیات کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۰ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (ایسے مسلم نے ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ. رَوَاهُ روایت کیا اور بخاری نے اس کو تعلقاً نقل کیا ہے) مُسْلِمٌ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: مطلب اس کا یہ ہے کہ جماع، بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے باقی اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت کے ماسوا قرآن پڑھا کرتے تھے، زبان پاک ہے زبانی ذکر الہی ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

(۷۴) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اللہ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ کہم ﷺ نے کچھنے لگوائے اور نیا وضو کئے بغیر نماز اَحْتَجَمَ وَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے کمزور الدارقطني، وَلَيْتَهُ. کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿احتجم﴾ کچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سنگ یا کسی دیگر آلہ کے ذریعہ جسم کے حصہ سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں کے علاوہ دوسرے کسی ذریعہ سے اخراج خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ ﴿لینہ﴾ تسلیں سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کمزوری و ضعف کے ہیں۔ اس کے ضعف کی وجہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے قدرتی دونوں راستوں کے علاوہ بدن سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ وغیرہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۷۵) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْعَيْنُ وَكَاءُ السَّهْ، فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَزَادَ: «وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ».

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”آنکھوں کا کھلا رہنا ریح خارج ہونے کا بندھن ہے جب آنکھ سونے کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ (کھل جاتا ہے) (مسند احمد، طبرانی) (طبرانی نے اتنا اضافہ بھی اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ ”جس شخص کو نیند آجائے وہ از سر نو وضو کرے۔“

وَهَذِهِ الزِّيَادَةُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ دُونَ قَوْلِهِ: «اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ» وَفِي كَلَا الْإِسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اتنا اضافہ ابوداؤد کی اس روایت میں بھی ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کیا ہے البتہ اس روایت میں استطلق الوکاء ”یعنی بندھن کھل جاتا ہے“ والی عبارت نہیں ہے۔ (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں)

وَأَبِي دَاوُدَ أَيْضاً عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا مَرْفُوعاً: «إِنَّمَا الْوُضُوءُ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً». وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ أَيْضاً. حَدِيثٌ بَهِي ضَعِيفٌ هُوَ

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے ”وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔“ (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے)

لَعَوَى تَشْرِيحُ: ﴿وَكَاءُ السَّهْ﴾ الْوِكَاءُ وَآؤُ بِكَسْرِهِ أَوْ بِكَافٍ بِمَدٍّ. اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿وَالسَّهْ﴾ سِین پر فتح اور ”ہا“ مخفف۔ دیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿اسْتَطْلَقَ﴾ کھل جانا۔ ڈھیلا ہونا۔ ﴿مُضْطَجِعاً﴾ پہلو کے بل لیٹ کر۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک ”بقیہ“ نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضعف خفیف سا ہے۔ منذری، نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں موافقت و تطابق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضاء جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان

غالب ہوتا ہے، جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا ایسا نہیں۔ گہری جس صورت میں ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے اس لئے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راوی حدیث: ﴿معاویہ﴾ معاویہ سے مراد معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ ۶۰ھ ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(۷۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «يَأْنِي أَحَدَكُمْ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلَاةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَتِهِ، فَيَحْبِلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحَدٌ، وَلَمْ يُحْدِثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذَلِكَ فَلَا يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». أَخْرَجَهُ الْبَزَّازُ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ زَيْدٍ. وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوَهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال جاتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا۔ لہذا تم میں سے جب کوئی ایسا محسوس کرے تو رتج کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔“ (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری میں عبد اللہ بن زید اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان جیسے ہی الفاظ مروی ہیں۔

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا: «إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحَدَنْتَ، فَلْيَبْلُ: إِنَّكَ كَذَبْتَ». أَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ بَلْفِظَ: «فَلْيَبْلُ فِي نَفْسِهِ».

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطے سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ ”جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور ذہن میں وسوساں ڈالے کہ تو بے وضو ہو گیا تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔“ اس کو ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ ”وہ شخص اپنے دل میں کہے کہ تو جھوٹا ہے۔“

قضائے حاجت کے آداب کا بیان

۷ - باب آدابِ قضاءِ الحاجة

(۷۷) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. اَلْخَلَاءُ: الْاَزْبَعَةُ، وَهُوَ مَعْلُوفٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضاء حاجت کیلئے تشریف لے جاتے تو انگشتی (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب آداب قضاء الحاجة﴾ قضاء حاجت۔ بول و براز سے کنایہ ہے۔ ﴿الخلاء﴾ ”خاء“ کے فتح اور آخر پر الف ممدودہ۔ خالی جگہ۔ خالی مکان۔ پھر کثرت استعمال میں یہ قضاء حاجت کی جگہ کیلئے بولا جانے لگا۔ (بیت الخلاء) کیونکہ قضاء حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے اور اس لئے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کیلئے اس میں تنہائی میسر آتی ہے۔ ﴿وضع خاتمه﴾ اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے، کیونکہ اس میں ”محمد رسول اللہ“ منقش تھا اور اس میں تنبیہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگہوں سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ ﴿وهو معلول﴾ معلول اس لئے ہے کہ یہ روایت ہمام، ابن جریج، عن الزہری کے واسطے سے روایت کرتا ہے، حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی، بلکہ اس نے تو زیاد بن سعد کے واسطے سے زہری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے اتار دیا۔

حاصل کلام: اس روایت کو ابو داؤد نے معلول قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں ”ہمام“ راوی کو وہم ہوا ہے حالانکہ ابن معین ایسے نقاد حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے نیز یہ کہ اس حدیث کو ہمام کے علاوہ اور طرق سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ متن حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء وغیرہ ناپاک اور گندی جگہوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ دانستہ داخل نہیں ہونا چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(۷۸) وَعَنْ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے ”اللهم انی اعوذ بک من الخبث والخبائث“ اے اللہ! میں آپ کی پناہ پکڑتا ہوں، خبیث جنوں اور خبیث جنینوں سے۔

(اس کو ساتوں، یعنی بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿اذا دخل﴾ جب بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ ﴿الخبث﴾ ”خاء“ اور

”باء“ دونوں پر ضمہ۔ اور ”ہا“ پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خمیٹ کی جمع ہے۔ ﴿الخبائث﴾ خبیثہ کی جمع ہے۔ اول کا معنی ”ز“ شیطان اور ثانی کا معنی مادہ شیطان مراد ہے اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلاء قسم کی جگہیں ایک کنارے یا دور بنائے جاتے ہیں اور تذکرہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہیں بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو، تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلاء نہ ہو تو رفع حاجت کیلئے نیچے بیٹھنے کیلئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: گندے مقامات اور جگہوں پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بیرا کرتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے قضاے حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ انسان کی مقعد بھی چونکہ قضاء حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے، اس لئے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں، ان سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کی تعلیم دی۔

(۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَدْخُلُ
الْخَلَاءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي
إِدَاوَةً مِنْ مَاءٍ، وَعَنْزَةً فَيَسْتَنْجِي
اس پانی سے آپؐ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اداوۃ﴾ ہمرزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ﴿من ماء﴾ پانی سے بھرا ہوا۔ ﴿وعنزۃ﴾ منصوب۔ اداوۃ پر عطف کی وجہ سے۔ عین اور نون دونوں پر فتح۔ ایسا لبا عصا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا پھر چھوٹا سا تیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں مثلاً اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے سے خدمت لینا۔ پانی کے ساتھ استنجا کرنا۔ نیز پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ڈھیلا اور پانی دونوں سے استنجا کرنا تو افضل ترین ہے جیسا کہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔

(۸۰) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: خُذْ الْإِدَاوَةَ،
فَانْظُلِقْ حَتَّى تَوَارَى عَنِّي، فَقَضَى
حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿تواری﴾ چھپ گیا۔ آنکھوں سے او جھل ہو گیا۔

حاصل کلام: آنحضرت ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردہ کا انتظام کرنا چاہئے یا ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ”اگر رفع حاجت کھلی جگہ میں کرنا پڑے اور پردہ پوشی کیلئے کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو تو ریت یا مٹی وغیرہ جو چیز دستیاب ہو اسے اوٹ کیلئے استعمال کرے ورنہ شیطان اس کی مقعد کے ساتھ تسخر کرے گا۔“

(۸۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اتَّقُوا اللَّاعِنِينَ، الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ». (ان کے بیٹھنے آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضاء حاجت کرنے سے۔“ (مسلم)

وَرَأَى أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: رَوَايَتُ كِي هُ، اس میں اس طرح ہے کہ ”لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھٹاؤں پر، شاہراہ عام پر اور سایہ کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔“ اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے ”جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہئے۔“ (یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں)

وَأَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ: النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الْحَاجَةِ تَحْتَ الْأَشْجَارِ هُ، اس میں ہے کہ ”پھل دار و سایہ دار درخت المَثُورَةِ وَضَفَةِ النَّهْرِ الْجَارِي، مِنْ كِي نِيچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضاء حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. حاجت نہ کرے۔“ (اس کی سند میں بھی ضعف ہے)

لعنوی تشریح: ﴿اتَّقُوا﴾ پر ہیز کرو، اجتناب کرو۔ ﴿لَاعِنِينَ﴾ لاعن سے تثنیہ ہے۔ مطلب ہے ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لاعن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صاحب ابن کو لابن اور صاحب تمر کو ”تامر“ کہہ دیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لاعن ملعون کے معنی میں ہو۔ ﴿الَّذِي يَتَخَلَّى﴾ جو قضائے حاجت سے فارغ ہوتا ہے۔ ﴿فِي طَرِيقِ النَّاسِ﴾ لوگوں کے عام آمدورفت کے راستہ میں۔ یہ لعنت زدگی کے اسباب میں سے ایک ہے اور دوسرا ﴿اَوْ فِي ظِلِّهِمْ﴾ وہ مقام و جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں اور قیلولہ کیلئے استعمال میں لاتے ہوں اور

اپنے اترنے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کے طور پر استعمال کرتے ہوں اور اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سایہ کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضاء حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ ﴿الملاعن﴾ ملعن کی جمع ”میم“ پر فتح۔ ایسی جگہیں اور مقامات جو لعنت کا موجب ہوں۔ ﴿الشلانہ﴾ منصوب ہے، ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر۔ ﴿البراز﴾ ”باء“ پر فتح اصل میں تو کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں، مگر یہ ﴿الغائط﴾ یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والا فضلہ سے کنایہ ہے۔ اگر البراز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ﴿فی الموارد﴾ مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ یا مقام، چشمہ یا نہر وغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کیلئے حصول پانی کیلئے جاتے ہیں (جنہیں گھاٹ کہتے ہیں) ﴿قارعة الطريق﴾ ایسے کھلے راستہ کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے، پاؤں اور چوہاؤں کے ذریعے اسے پامال کرتے ہیں۔ ﴿اونقع ماء﴾ نون پر فتح اور قاف ساکن۔ جمع شدہ اور روکا ہوا پانی۔ ﴿فیہما ضعف﴾ دونوں سے۔ مراد ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابوسعید حمیری، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا، لہذا یہ روایت منقطع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے جب اس کی کتابیں خاکستر ہو گئیں تو اس نے روایات کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے، اس کا نام نہیں لیا گیا۔ ﴿تحت الاشجار المثمرة﴾ پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے مطلب ہے جو پھل پک کر نیچے گرے وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں انہیں اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کیلئے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ ﴿صفۃ النہر﴾ ضاد پر فتح اور ”فاء“ پر تشدید۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔ ﴿بسند ضعیف﴾ اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے وہ یہ ہیں: عام راستہ پر، سایہ دار درخت کے نیچے، پانی کے گھاٹ پر، پھل دار درخت کے نیچے، رواں دواں نہر کے کنارے۔ شارع عام پر عموماً رفع حاجت ممنوع ہے البتہ جو متروک ہو چکا ہو عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راوی حدیث: ﴿معاذ﴾ انصاری تھے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا، بڑے معزز اور بزرگ فقہاء صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو یمن کا والی

(گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ۷۱ھ میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ۸۱ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔

(۸۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلَانِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلَا يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَمْقُتُ عَلَى ذَلِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَقْلُوبٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب دو آدمی قضاء حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردہ میں ہونا چاہئے اور اس حالت میں ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں۔“ اس لئے کہ ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوئے ہیں۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطن نے اسے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿تغوط﴾ قضاء حاجت کیلئے نکلے اور اپنی حاجت پوری کی۔ ﴿فلیستوار﴾ اس میں لام امر کا ہے اور ”راء“ پر فتح ہے۔ معنی ہے کہ چھپنا چاہئے، پردہ میں ہونا چاہئے۔ ﴿ولا يتحدثا﴾ قضاء حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ ﴿يمقت﴾ مقت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔ ﴿على ذلك﴾ دونوں کے مابین آڑ اور پردہ کا نہ ہونا اور رفع حاجت کی صورت میں بات چیت کرنا مراد ہے۔ ﴿وهو معلول﴾ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے۔ البتہ امام مسلم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام: علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحییٰ بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ راوی ان کے نزدیک معلول ہے، حالانکہ عکرمہ کی روایت کو امام مسلم نے قبول کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سے استشہاداً روایت کی ہے۔ یہ حدیث واضح ثبوت ہے اس کا کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے نیز قضاء حاجت یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے اگر یہ فعل بقول بعض کے مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حضور ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کا مؤید ہے۔

(۸۳) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَمَسُّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَهُوَ يَبُولُ، وَلَا يَتَمَسَّحُ مِنَ الْخَلَاءِ»

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ”تم میں سے کوئی بھی پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو ہرگز نہ چھوئے اور قضاء حاجت کے بعد سیدھے

بِمِيْنِهِ، وَلَا يَتَنَفَّسُ فِي الْإِنَاءِ». مُتَّفَقٌ ہاتھ سے استنجا بھی نہ کرے نیز پانی پیتے وقت اس میں سانس بھی نہ لے۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے علیہ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ۔)

لغوی تشریح: ﴿لَا يَمْسُ﴾ مس سے نبی کا سینہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے۔ ﴿وَلَا يَتَمَسَّحُ﴾ یعنی استنجا نہ کر اور ﴿تَمَسَّحُ﴾ کے معنی ہیں ہاتھ کو بننے والی چیز کے ساتھ ملانا یا پھیرنا کہ گندگی دور ہو جائے یا ناپاک چیز سے لتھڑی ہو، اسے ہاتھ سے صاف کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب بھی اور کم ظرفی بھی اور دوسرا کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس لینا۔ برتن میں سانس لینا اس لئے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعہ خارج ہونے والے جراثیم پئے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدہ میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کیلئے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پئے اور سانس باہر نکالے۔

(۸۴) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِينِ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقْلٍ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضاء حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر، لید اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نَسْتَنْجِي﴾ الاستنجا سے ماخوذ ہے۔ یعنی پتھریا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اور ﴿الرجيع﴾ لید یا گوبر۔

راوی حدیث: ﴿سلمان﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہو گئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی ﷺ پر ایمان لے آئے۔ سلمان الخیر ان کا لقب تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ ان کے خلوص اور محبت دین کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا کہ ”سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ اللہ میں خیرات کر دیتے۔ ۳۲ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر ۲۵ یا ۳۵ برس تھی۔

(۸۵) وَلِلَّسَّبَعَةِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي حَضْرَتِ ابِوَابِوَابِ النَّصَارِيِّ رَوَاهُ مُسْلِمٌ

”قضاء حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب کرو۔“ (اس کو ساتوں (یعنی امام بخاری،

مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿لانتستدبروها﴾ اس کی طرف اپنی پشت بھی نہ کرو۔ ﴿ولکن شرقوا اوغربوا﴾ تشریق تقریب سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے اس طرح استقبال اور استبدار دونوں سے بچ جائے گا اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہو گا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ استقبال استبدار قبلہ سے بچنے کیلئے اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔ حکم کا دار و مدار اسی پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ﴿لَا تَسْتَقْبِلُوا وَلَا تَسْتَدْبِرُوا﴾ کا حکم نئی ایسی جگہ کیلئے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو تو وہاں کیلئے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واضح ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمشیرہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کیلئے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت فرما رہے تھے اور اس وقت آپؐ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف نہ کرے اور نہ پشت۔ یہ حکم تو اہل مدینہ کیلئے مخصوص ہے اس لئے کہ ان کیلئے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو ایوب انصاری﴾ ابو ایوب ان کی کنیت ہے، ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی کریم ﷺ کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار کبار اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوہ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ (۵۰ھ میں) ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔

(۸۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَنْ أَمَّا الْغَايُطَ فَلَيْسَ تَبَرًا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو غطاء حاجت کیلئے جائے اسے پردہ کر کے بیٹھنا چاہئے۔“ (ابوداؤد)

(۸۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ حَضْرَتَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا هِيَ سَـمَـوِی هَے كَہ نَبِی ﷺ

النَّبِيِّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْغَائِطِ . أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةَ وَصَحَّه أَبُو حَاتِمٍ وَالْحَاكِمُ . قَالَ : «غُفِرَانَكَ» .
جب قضاء حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو "غفرانک" فرماتے (اے اللہ! تیری بخشش اور پردہ پوشی مطلوب ہے) (اس روایت کو ہانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، ابوحاتم اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: «غفرانک» منصوب واقع ہوا ہے، فعل محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں یا پھر مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے بخش دے اچھی طرح بخشا۔

(۸۸) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ : أَتَى النَّبِيَّ ﷺ الْغَائِطُ ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثًا ، فَأَتَيْتُهُ بِرَوْثَةٍ ، فَأَخَذَهُمَا وَالْفَى الرُّوثَةَ ، وَقَالَ : «إِنَّهَا رِكْسٌ» . أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ . وَزَادَ أَحْمَدُ وَالْذَّارِقُطِيُّ «الَّتِي بَعَثَهَا» .
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کو چلے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کیلئے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً) گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپ نے دونوں پتھر تو لے لئے اور گوبر کے خشک ٹکڑے کو دور پھینک دیا اور فرمایا "یہ تو بذات خود پلیدی ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) احمد اور دارقطنی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ "اس کی بجائے اور لے آؤ۔"

لغوی تشریح: «بروثہ» چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ «رکس» "را" پر کسرہ "کاف" ساکن۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ «اللتی ببعثہا» "اتیان" سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضاء حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کیلئے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے۔ خواہ صفائی اس سے کم ہی سے حاصل ہو جائے اور اگر تین سے بھی مطلوب صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ (یعنی پانچ، سات علیٰ هذا القیاس) آج کل ٹشو پیپر سے بھی صفائی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعداد بھی اتنی ہی ہونی چاہئے۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی لہذا ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے۔ خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راوی حدیث: «ابن مسعود» نام ان کا عبد اللہ تھا۔ بزرگ اور نہایت عقلمند و دانش مند فقیہ صحابہ کرام میں شمار ہوتے تھے۔ غزوہ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم

خاص تھے۔ حضور سفر کے ساتھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ صاحب النعلین تھے۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔

(۸۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، فرمایا ہے، ”یہ دونوں پاک نہیں کر و قَالَ: «إِنَّهُمَا لَا يُطَهَّرَانِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ. دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿انہما لا یطہران﴾ (یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے) گوہر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے اور ہڈی میں چکناٹ ہوتی ہے۔ اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی اور تری کو خشک نہیں کر سکتی ہے اور ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنوں کا طعام ہے اور ﴿روث﴾ ان کے جانور کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

حاصل کلام: امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہڈی اور گوہر سے استنجاء کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپ نے فرمایا: نصیین کے علاقہ سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوہر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔ لہذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے، اسے گندنا نہ کرو۔ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی کھانے والی چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے یہ جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «اسْتَنْزَهُوا مِنَ الْبَوْلِ، فَإِنَّ أَكْثَرَ عَذَابِ الْقَبْرِ فِيهِ» (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے)

وَلِلْحَاجِمِ: «أَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ» وَمَوْجِبُهَا: «اسْتَنْزَهُوا» اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿منہ﴾ میں من تعلیلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب صَنِيعُ الْإِنْسَانِ۔ وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿استنزهوا﴾ اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿منہ﴾ میں من تعلیلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب

سے پرہیز اور اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے۔

(۹۱) وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے قضاء حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ ”ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر عَلَى الْيُسْرَى وَنَنْصِبُ الْيُمْنَى. رَوَاهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ (اس کو بھٹی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا

(ہے)

لغوی تشریح: ﴿علّمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے، صیغہ غائب ہے۔ ”نا“ ضمیر متکلم جمع کی ہے اور مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فی الخلاء﴾ قضاء حاجت کے آداب کے بارے میں۔ ﴿نصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑے کرنے، قائم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بسند ضعیف اس لئے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

حاصل کلام: حکیم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ حکمت خواہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بائیں پاؤں پر بیٹھنے کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کا معدہ بائیں طرف ہوتا ہے۔ بائیں پاؤں پر بیٹھنے سے اخراج فضلہ میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔ راوی حدیث: ﴿سراقہ﴾ سین پر ضمہ۔ سراقہ بن مالک بن جشم، جشم جیم پر ضمہ، عین ساکن اور شین پر ضمہ۔ قبیلہ مدج میں سے تھے، اس لئے مدجی کہلائے۔ ابوسفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جو ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ کو انعام کے لالچ میں گرفتار کرنے کیلئے آپ کے تعاقب میں نکلا اور جب آپ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ تو اس نے امان طلب کی۔ آپ نے امان دے دی۔ ۲۳ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(۹۲) وَعَنْ عِيْسَى بْنِ يَزْدَادَ حضرت عیسیٰ بن یزداذ بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے اللہ ﷻ: إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ“ جب کوئی پیشاب کرے تو عضو مخصوص کو تین مرتبہ ذَکْرَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ“۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ بِسَنَدٍ جَهَّازٍ لے۔ (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ ضعیف۔

روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلیتوضأ﴾ ”نشر“ سے ماخوذ ہے۔ جو کچھ ناک کے اندر ہو اسے جھاڑ کر نکالنا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ ”یزداد“ صحابی نہیں بلکہ مجہول راوی ہے اس کا بیٹا عیسیٰ بھی مجہول ہے۔

حاصل کلام: پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سونٹایا جھاڑنا اس لئے ہے کہ اگر قابل

خارج قطرہ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ یہ روایت گو ضعیف ہے مگر پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ عذاب قبر اس لئے ہو رہا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔

راوی حدیث: ﴿عیسیٰ بن یزید﴾ یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں۔ ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کا تعارف ہے۔ یزید کو باء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۹۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَاءٍ فَقَالَ: إِنَّ اللَّهَ يُنْشِي عَلَيْكُمْ. فَقَالُوا: إِنَّا نُنْشِ الْحَجَارَةَ الْمَاءَ. رَوَاهُ الْبَزَّازُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَضْلَهُ فِي أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، بِدُونِ ذِكْرِ الْحَجَارَةِ. حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے استعمال کے بعد مزید طہارت کیلئے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے ضعیف سند کے ساتھ بزار نے روایت کیا ہے۔ اس کی اصل ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اہل قباء﴾ سنال فعل کا مفعول ہے اور قباء قاف پر ضمہ اور آخر پر الف ممدودہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ﴿یشنی علیکم﴾ یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمہاری تعریف کی ہے کہ ﴿فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین﴾ (۱۰۸:۹) ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ﴿نشی الحجارة الماء﴾ یعنی پہلے ہم پتھر سے استنجاء کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی سے صفائی حاصل کرتے ہیں اور ﴿نشی﴾ باب افعال سے ہے اور ﴿الحجارة﴾ اس کا مفعول اول ہے ﴿الماء﴾ مفعول ثانی ہے۔ ﴿بسند ضعیف﴾ سے مراد ہے کہ چونکہ بزار نے محمد بن عبدالعزیز زہری سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شیبہ بھی ضعیف راوی ہے۔

حاصل کلام: مسند بزار کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند کے دو راوی محمد بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن شیبہ ضعیف ہیں۔ ”قباء“ مدینہ طیبہ سے تین میل بجان جنوب ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر آپؐ نے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استنجاء میں ڈھیلے کے ساتھ پانی استعمال کرنا افضل ہے۔

۸ - بَابُ الْغُسْلِ وَخُتْمُ الْغُسْبِ - غسل اور جنبی کے حکم کا بیان

(۹۴) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ». سے ہے۔ ”(یعنی جب تک منی کا خروج نہ ہو اس رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَخْلَهُ فِي الْبُخَارِيِّ).

روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ﴾ اس میں ”من“ تعلیل کا ہے اور بعض روایات میں ﴿انما الماء من الماء﴾ کلمہ حصر کے ساتھ۔ پہلے ماء سے معروف پانی مراد ہے اور دوسرے ”ماء“ سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہوگا اگر اتنے عمل کے باوجود بھی منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ ابتداء اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب صرف جماع سے غسل واجب ہوتا ہے، انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی، مگر الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے یہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں بھی جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کو احتلام کے بارے میں سمجھا گیا ہے جماع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب آدمی کو انزال ہو۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضاء مخصوص ایک دوسرے سے ملاپ کر لیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال کی نوبت پیش نہ آئی ہو۔

(۹۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شَعْبَيْهَا إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شَعْبَيْهَا چار شاخوں کے درمیان میں بیٹھے پھر اپنی پوری الْأُزْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ كُوشِش کر لے تو اس پر غسل واجب ہو گیا۔“ الْغُسْلُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَإِنْ لَمْ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ

”خواہ انزال نہ ہوا ہو۔“

بِزْنٍ۔

لغوی تشریح: ﴿اذا جلس﴾ یعنی مرد جب بیٹھ جائے ﴿بین شعبہا﴾ عورت کی شانوں میں۔ ﴿شعب﴾ شعبہ کی جمع ہے۔ شین پر ضمہ ہے عین پر فتح۔ درخت کی شاخ کیلئے استعمال ہوتا ہے یا کسی چیز کا کچھ حصہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ عورت کی چار شانوں سے مراد اس کے دو بازو اور دو پاؤں یعنی ٹانگیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عورت کے پاؤں اور رانیں ہیں اور یہ بھی ایک قول ہے کہ اس سے عورت کی دونوں پنڈلیاں اور دونوں رانیں مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہو مقصود اس سے عورت سے جماع سے کنایہ ہے اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ﴿والزرق الختان الختان﴾ بھی مروی ہے۔ (عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ سے ملاپ پر غسل واجب ہو جاتا ہے) ﴿ثم جهدھا﴾ اس میں کنایہ ہے مرد کے عضو مخصوص کا عورت کی شرم گاہ میں دخول سے۔

حاصل کلام: مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ حشفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خلفاء اربعہ، ائمہ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے۔ اس کو جماع پر محمول کیا جائے تو اس حدیث کو پہلی حدیث کا نسخ سمجھا جائے گا۔

(۹۶) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ - وَهِيَ ابْطَلَمُہُ کی اہلیہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ - قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! اللَّهُ تَعَالَى حَقِّ بِيَانِ كَرْنِ سِے اللہ! إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، حِيَاءٌ نَمِیں كِرْتَا تَوْتِنَامِیں كِیا عورت كو جب احتلام ہو فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلِهِ إِذَا جَاءَتْهُ اس پر بھی غسل فرض ہے؟ فرمایا ”ہاں! اَحْتَلَمْتُ؟ قَالَ: نَعَمْ، إِذَا رَأَتْ الْمَاءَ“، الْحَدِيثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

لغوی تشریح: ﴿لا يستحي من الحق﴾ ”حاء“ کے بعد دو یاء ہیں ”حاء“ اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق کے بیان کرنے سے رکتا اور حیا کی بنا پر اسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی مزید کہا۔ ایسے ہی مسائل جن کو دریافت کرنے سے عورتیں عموماً شرماتی ہیں اور عذر پیش کرتی ہیں۔ ﴿اذا احتلمت﴾ جب اسے احتلام ہو جائے ایک دوسری روایت میں ﴿اذا رأت ان زوجها جامعها في المنام﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات کئے ہوئے ہے۔ ﴿اذا رأت الماء﴾ جب نیند سے بیدار ہو تو منی دیکھے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلمہ رضی اللہ عنہا﴾ ان کا نام رمیماء یا غمیماء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نضر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہو گئیں۔ اس نے اپنے

وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَمِنْ الْحِجَامَةِ، وَمِنْ كُوْغْسِلِ دِينَ كِي وَجِهْ سَ۔ (ابوداؤد نے اسے روایت غُسلِ الْمَيْتِ۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ كِيَاہے اور ابن خزيمة نے صحیح قرار دیا ہے) ابن خزيمة۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ جمعہ کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے البتہ امام احمد اور امام مالک کا ایک قول یہ ہے کہ وہ فرض ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ابن خزيمة کا بھی یہی مسلک ہے اور حافظ ابن قیم کا زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ سیکنگی لگوانے سے غسل مسنون ہے فرض نہیں۔ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپؐ نے سیکنگی لگوائی اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ نے غسل تو کیا کبھی وضو بھی نہ لگوانے کے بعد نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل، تو پہلے اس کے بارے میں بھی گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے، فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی فیصلہ ہے۔

(۹۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بِنِ اسْلَامِ لَانِ كِ وَاقِعِ كِ مَتْلُقِ مَرُوى كِ كِ نَبِيْ اُثَالِ عِنْدَمَا اُسْلَمَ - وَامْرَهُ النَّبِيُّ كَرِيْمُ ﷺ نِ اسِ غَسْلِ كِرْنِ كِ اَحْكَمِ ارْشَادِ فرمایا۔ ﷺ اَنْ يَغْتَسِلَ۔ رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصْلُهُ (عبدالرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: کافر جب اسلام لانے کیلئے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہئے۔ یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ثمامہ بن اثال﴾ دونوں لفظوں کے پہلے حرف یعنی ”ثا“ اور ”الف“ دونوں پر ضمہ ہے۔ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گشتی شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ ان کو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انہیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین روز بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انہیں آزاد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان ہو گئے اور بہت عرصہ اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب اس کی قوم کے لوگ میلہ کذاب کے فتنہ کا شکار ہو گئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(۱۰۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے۔“ (اس کو ساتوں یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے) الشُّبَّةُ.

لغوی تشریح: ﴿محتلم﴾ بالغ کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو غسل یوم جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں ”واجب“ کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ مگر جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کیلئے سمجھتے ہیں۔

(۱۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز جس نے وضو کیا اس پر نَوَضًا يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِيهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنْ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ بِهَرِحالِ افضل ہے اور بہترین ہے۔“ (اس کو پانچوں یعنی احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے) زَوَاهِ الْخَنَسَةِ، وَحَسَنَةُ التَّرْمِذِيِّ.

اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فبها﴾ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ یہ طریقہ مسنون ہے یا پھر اسے رخصت پر محمول کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے کی اجازت و رخصت ہے یا یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ جمعہ کے روز وضو پر اکتفا کرنا ایک اچھی اور عمدہ عادت ہے۔ ﴿ونعمت﴾ کا بھی وہی مفہوم ہے جو ﴿فبها﴾ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مسنون بھی ہے یا اچھی اور عمدہ خصلت بھی اور یہ حدیث جمعہ کے روز غسل کے وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے، لیکن جو حدیث اس کے وجوب پر دال ہے وہ زیادہ صحیح اور راجح ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح، راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ اس لئے کہ واجب کو افضل نہیں کہا جاتا غالباً اسی وجہ سے جمہور علماء نے واجب سے لغوی معنی مراد لئے اصطلاحی نہیں۔ لغوی معنی کو تقویت مسلم کی روایت سے ملتی ہے جو اس کے فرض نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ نہایت اولیٰ بات یہی ہے کہ مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنے میں بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے۔ صاحب زاد المعاد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غسل کیلئے بہت تاکید ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ لفظ وجوب و تر کے سلسلہ میں اگر کچھ قوت رکھتا ہے تو غسل جمعہ کیلئے اس سے زیادہ باعث قوت ہے۔

راوی حدیث: ﴿سمرة﴾ سین کے فتح اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ﴿جندب﴾ جیم کے ضمہ، نون

ساکن اور وال پر ضمہ۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور فزار قبیلہ کے فرد ہونے کی وجہ سے فزاری کہلائے۔ انصار سے حلیفانہ روابط و تعلقات تھے۔ یہ ان حفاظ میں سے تھے جنہیں بکثرت احادیث و قرآن یاد تھا۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ خوارج کے گروہ حروریہ کے سلسلہ میں بڑے سخت تھے۔ ۵۹ھ کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۰۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَالَتِ جَنَابَتِ كَيْسِ عِلَافَةٍ رَوَاهُ زَوْاهُ پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَنُهُ، ترمذی کے ہیں اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے) وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہئے، چنانچہ امام ابو یعلیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ ”جس کسی کو جنابت لاحق ہو اس کیلئے مناسب یہی طریقہ ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔“

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَعِيدِ ابُو سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وَضُوءًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ الْحَاكِمُ: «فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعُودِ». اور حکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے اور سنن اربعہ (یعنی ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

اور حکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے اور سنن اربعہ (یعنی ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿انشط﴾ اسم تفعیل کا صیغہ ہے۔ بہت نشاط و مسرت اور فرحت و تازگی بخش ہے۔

اطیب اور اجود ہے تروتازگی اور عمدگی لذت طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ ﴿من غیروان یمس ماء﴾ اس جملہ میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ ہی غسل کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح اور صاف ہو گئی کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے وہ مستحب ہے، واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ ﴿وہو معلول﴾ اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواصلح کا ابوالاسود کے واسطے سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواصلح کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں لیکن امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی معلول اس لئے کہا کہ ان کے نزدیک بھی ابواصلح کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں مگر امام بیہقی رحمہ اللہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے، حدیث معلول نہیں رہتی۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ خورد و نوش اور مباشرت کیلئے عضو مخصوص دھو کر وضو فرما لیتے تھے۔ اکثر علماء امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں مستحب ہے۔

(۱۰۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَهُ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَاءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي أَصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَالنُّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے۔ پہلے ہاتھ دھوتے پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنا عضو مخصوص دھوتے۔ پھر وضو کرتے، پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعہ سر کے بالوں کی تہہ (جڑوں) میں داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے وجود پر پانی بہاتے (سب سے آخر میں) پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم، متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلَهُمَا فِي حَدِيثٍ مَيِّمُونَةٌ: «ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الْأَرْضَ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح ہے ”پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے اور (صاف کرتے)“ اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔ ”پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح

وَفِي رِوَايَةٍ: «فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ». وَفِي آخِرِهِ: «ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالْمِنْدِيلِ».

نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں البتہ اگر مسجد کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ گزرنے کا نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿الاعرابی سبیل﴾ ہے، یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے ہاں اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے اور حدیث سے مراد ٹھہرنے کی ممانعت ہے۔ نہ کہ گزرنے کی۔ امام احمد رحمہ اللہ تو آثار صحابہؓ کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہوگئی تو ایسے آدمی کیلئے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا جائز ہے۔

(۱۰۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَمَرْسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، غَسَلَ جَنَابَتِ كِرْلِيَا كَرْتَةً تَحْتَهُ اس برتن میں ہمارے تَحْتَلِفُ أَبَدَيْنَا فِيهِ، مِنَ الْجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے اتنا اضافہ مزید نقل کیا ہے کہ بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿تختلف ابدينا فيه﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے۔ مثلاً پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں حضور ﷺ کا یا پھر پہلے حضور ﷺ کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ ﴿من الجنابة﴾ جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ ﴿تلتقي﴾ مل جاتے، چھو جاتے، ایک دوسرے سے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کیلئے باعث نقصان نہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک برتن کے پانی سے میاں بیوی کا اکٹھے غسل کرنا بھی جائز ہے۔

(۱۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنْ نَحَتَ كُلُّ شَعْرَةٍ جَنَابَةً، (نیچے) میں جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے بالوں کو

فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا الْبَشَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَفَاهُ، وَلَاخْمَدٌ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوَهُ، وَفِيهِ زَاوٍ مَجْهُولٌ. روایت کیا ہے اور ساتھ ہی ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے)

لغوی تشریح: ﴿انقوا﴾ انقاء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (صاف کرو) ﴿البشر﴾ ”با“ اور شین پر فتح۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد و کھال کی اوپر والی سطح۔ ﴿وضعهما﴾ دونوں (ابوداؤد و ترمذی) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث ابن وجیہ نامی ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ حاصل کلام: حدیث مذکور اس کی دلیل ہے کہ غسل جنابت کی صورت میں سارا جسم دھونا فرض ہے البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ بہر حال حدیث ہذا کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتیٰ کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔



تیمم کا بیان

۹ - بَابُ التَّيْمُمِ

(۱۰۹) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا» حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دہدبے سے مدد دی گئی ہے۔ ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور

کیلئے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم درست ہے۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات جو زمین کا حکم رکھتی ہوں ان سے بھی تیمم کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ معدنیات غبار رکھنے والی ہوں۔

(۱۱۰) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي حَاجَةٍ، فَأَجَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ، فَتَمَرَعْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَعُ الدَّابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا، ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشَّمَالَ عَلَى الْيَمِينِ. وَظَاهَرَ كَفَّيْهِ وَوَجْهَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے کسی ضرورت و حاجت کے سلسلہ میں بھیجا۔ میں جنبی ہو گیا اور پانی مجھے دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ (ضرورت سے فارغ) ہو کر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپ سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا ”تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔“ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا پھر بائیں کو دائیں پر ملا اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر۔ (بخاری اور مسلم، اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ «وَضَرَبَ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ، وَفَنَخَ فِيْهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ.

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور پھونک مار کر گرد و غبار اڑا دیا پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: ﴿فاجنب﴾ میں جنبی ہو گیا۔ ﴿فتمرغت﴾ لوٹ پوٹ ہوا۔ حاصل کلام: یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے ایک ضرب ہی کافی ہے اور ہتھیلیوں کی بیرونی اور اندرونی سطح پر مسح کرنا ہے۔ کہنیوں تک نہیں۔ اس باب میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو دوسری روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کیلئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے، البتہ احناف اور شافعی دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کیلئے اور دوسری ہاتھوں کیلئے ہے۔ مذکورہ بالا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان کی دلیل ہے۔ اس باب میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ نیز عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و

دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے اس لئے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہئے۔ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں، لہذا جب نص قیاس کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کیلئے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک دیا۔ لہذا ضرب لگانے کے بعد پھونک دینا بھی مسنون ہے۔ ایک جنبی کیلئے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ﴾ عین پر فتح، میم پر فتح اور تشدید۔ ان کی کنیت ابو الیقظان تھی۔ اولین سابقین صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایہ ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ (یعنی ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ) غزوہ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا ”افسوس اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔“ ۳۶ھ میں معرکہ صفین کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۷ برس کی تھی۔

(۱۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «التَّيْمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الْأَيْمَنُ (اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے) وَفَقَّه.

حاصل کلام: ﴿التیمم ضربتان..... الخ﴾ والی حدیث کو حاکم اور بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ائمہ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کئے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشَرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ،» (اس کو بزار نے

وَلْيُمِسَّهُ بَشْرَتُهُ». رَوَاهُ الْبُزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْقَطَّانِ، وَلَكِنْ صَوَّبَ الدَّارَقُطْنِيُّ إِسْرَافَهُ، وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُهُ، وَصَحَّحَهُ وَالحَاكِمُ أَيْضًا.

روایت کیا ہے اور ابن القطان نے صحیح قرار دیا ہے، تاہم دارقطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست اور قرین صواب کہا ہے اور ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے

لعنوی تشریح: ﴿الصعيد﴾ پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ ﴿وان لم یجد﴾ اس میں ”ان“ وصلیہ ہے۔ ﴿عشر سنین﴾ دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ ﴿فلیستق اللہ﴾ اللہ سے ڈرنا چاہئے کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ ﴿ولیمسه﴾ امساس سے ماخوذ ہے۔ یعنی پانی پہنچائے۔ ﴿بشرتہ﴾ ”با“ اور شین دونوں پر فتح ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ ﴿صوب﴾ تصویب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔ یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جاسکتی ہیں۔ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدت کے قائل نہیں ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے، جب نماز سے فارغ ہوگا تو پھر ویسا ہی جنبی ہوگا جیسا کہ تیمم سے پہلے تھا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن المسیب، حسن بصری، زہری، سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذوری کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کیلئے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض جس کیلئے تیمم کیا گیا ہو ادا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح ہے ”ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا اس نہ آئی تو انہوں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا آپ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنجناب ﷺ کی خدمت میں عرض کی ابوذر رضی اللہ عنہ تو تباہ ہو گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ ”کیا ہوا؟“ ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا ”جسے پانی نہ ملے اس کیلئے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔“

راوی حدیث: ﴿ابودر بن اللہ﴾ ”راء“ پر تشدید۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں جیم پر ضمہ ہے۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو زاہد، دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتداء اسلام میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی ﷺ کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بہت متقی، پرہیزگار اور توکل علی اللہ کرنے والے تھے۔

(۱۱۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلَانِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيدًا طَيِّبًا، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِي الْوَقْتِ، فَأَعَادَا أَحَدُهُمَا الصَّلَاةَ، وَالْوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَذَكَرَا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: «أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجَزَأْتُكَ صَلَاتُكَ»، وَقَالَ لِلْآخَرِ: «لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيمِيُّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے، نماز کا وقت آگیا مگر ان کے ساتھ پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر پانی بھی دستیاب ہو گیا جبکہ ابھی نماز کی ادائیگی کا وقت باقی تھا ان میں سے ایک صاحب نے وضو بھی کیا اور نماز دوبارہ ادا کر لی مگر دوسرے نے نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی فرمایا ”تو نے سنت کے مطابق کیا اور تیری نماز کافی ہو گئی“ اور دوسرے سے فرمایا ”تجھے دو گنا اجر ملے گا۔“ (ابوداؤد، نسائی)

لغوی تشریح: ﴿اصبت السنة﴾ تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ ﴿اجزأتک﴾ یعنی تجھے کافی ہو گئی۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمم کر کے نماز ادا کر لی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔ جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دو گنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم غلط اجتہاد پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(۱۱۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الْجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْفُرُوحُ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ“ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب کسی شخص کو راہ خدا میں زخم اور گھاؤ لگے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے

فَيُجَنَّبُ، فَيَخَافُ أَنْ يَمُوتَ إِنَّ اور غسل کرنے کی صورت میں مرجانے کا اندیشہ ہو اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْفُوعًا تو وہ تیمم کر لے۔ (اس روایت کو دارقطنی نے موقوف، وَرَفَعَهُ الْبَزَّازُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ۔ بزار نے مرفوع اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مرضی﴾ مریض کی جمع۔ بیمار آدمی ﴿علی سفر﴾ علی فی کے معنی میں استعمال ہوا، یعنی مسافر ہو اور بعد کی آیت او جاء منكم من الغائط ولا مستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا (۶:۵) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں بیان فرمائی۔ کہ جب کسی انسان کو ایسا زخم لگے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو اور ﴿الفرج﴾ فرج کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں اور قرآنی آیت کی روشنی میں قروح ان زخموں اور گھاؤ کیلئے استعمال ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ان يمسسكم قرح فقد مس القوم قرح مثله ”اگر (آج) تمہیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔“

حاصل کلام: اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ اس آیت میں بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا پھنسی، خارش اور خراش تو بہر حال نہیں ہو سکتے لہذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ بیماری کس درجہ کی ہو تو تیمم جائز ہے اس بارے ائمہ کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری میں تیمم جائز درست ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصہ جسم کے ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

محدثین کی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملہ میں دارقطنی کی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ بزار نے اس روایت کو جریر بن عطاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے حالانکہ ابن معین نے کہا ہے کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظہ میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا اس اعتبار سے اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(۱۱۵) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا گٹ ٹوٹ گیا تو نَعَالِي عَنْهُ قَالَ: انْكَسَرَتْ إِحْدَى میں نے رسول اللہ ﷺ سے وضو کے بارے میں

ہوتا ہے، تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھر ان پر مسح کیا جاسکے۔

راوی حدیث: ﴿وفیه اختلاف علی راویہ﴾ اس راوی کا نام عطاء ہے۔ اس سے جابر کے حوالہ سے بھی مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بھی اور ایک نسخہ میں ﴿علی رواۃ﴾ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء کے نیچے یعنی عطاء کے شاگردوں میں اختلاف رائے ہے۔

(۱۱۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ كَتَمَ الرَّجُلُ تَيْمَمَ مِنْهُ إِذَا صَلَّى إِذَا صَلَّاهُ وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلَاةِ الْآخَرَى. (دارقطنی نے بت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے) رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جَدًّا.

لغوی تشریح: ﴿من السنة﴾ نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقہ۔

حاصل کلام: حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کے راوی حسن بن عمارہ ہیں اور وہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث نمبر ۱۳۰ اس کے بظاہر خلاف ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے۔ اس لئے تیمم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔

حیض (سے متعلق احکام) کا بیان

۱۰ - بَابُ الْحَيْضِ

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ دَمَ الْحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ، فَإِذَا كَانَ الْآخِرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالْحَافِظُ، وَاسْتَشْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضہ کی دائمی مریضہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کہ ”حیض کے خون (کی رنگت) سیاہ ہوتی ہے، آسانی سے پہچان ہو سکتی ہے۔ جن ایام میں یہ خون آ رہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب کوئی دوسرا ہو تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔“ (ابوداؤد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم کے نزدیک یہ منکر ہے)

وَفِي حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ: وَلَتَجْلِسَ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةَ فَوْقَ الْمَاءِ ابوداؤد میں مروی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں

فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا كَيْلَيْهِ اِيك غسل كر لے اور اسی طرح مغرب اور وَاِحْدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ عِشَاءً كَيْلَيْهِ اِيك غسل كر لے اور نماز فجر كَيْلَيْهِ غُسْلًا وَاِحْدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلًا الْكُ سے ايك غسل كر لے اور ان كے درميان ميں وَاِحْدًا، وَتَتَوَضَّأُ فِي مَا بَيْنَ ذَلِكَ. وضو كر لے۔

لغوی تشریح: (باب الحيض) حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینہ خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص دن میں ہوتا ہے، ناامیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ یعنی زیادہ عمر ہونے سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا ﴿يعرف﴾ معرفت سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے؟ یہ بھی ایک رائے ہے کہ ﴿يعرف﴾ باب افعال سے ہے۔ اس صورت میں ”یاء“ پر ضمہ اور ”راء“ مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ خون کی بو ہی بتا دے گی کہ کونسا خون ہے؟ ﴿فاذا كان ذلك﴾ کاف کے نیچے کسرہ۔ یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ ﴿فامسكى﴾ امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ معنی نماز سے رک جا۔ ﴿فاذا كان الاخر﴾ جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ ﴿واستنكر﴾ اسے منکر قرار دیا۔ اس کے منکر ہونے کی وجہ اس حدیث کی سند میں عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ ہے۔ اس کا دادا غیر معروف آدمی ہے۔ ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ﴿ممكن﴾ بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا) اس میں ”میم“ پر کسرہ اور ”کاف“ پر فتح ہے۔ ﴿فاذا رأت صفرة فوق الماء﴾ جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ ﴿فلتغتسل للظهر والعصر غسلا واحدا﴾ تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کیلئے ایک ہی غسل کر لینا چاہئے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کیلئے کر لے۔ ﴿وتتوضا فيما بين ذلك﴾ ان دونوں (ظہر اور عصر) اور مغرب و عشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کیلئے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

حاصل کلام: نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض (ایام ماہواری) دوسرا دم نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم و بیش جاری رہتا ہے اور تیسرا دم استحاضہ۔ استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس یوم کے علاوہ جاری رہے۔ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں

کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہو سکتا ہے۔ ملکی، موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ صائب ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا﴾ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی۔ وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا، جن سے ایک عبد اللہ ہے۔ غزوہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ذہن نشین رہے کہ عیسٰی عربی قوائد کی رو سے تغیر ہے)

(۱۱۹) وَعَنْ حَمَّةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحِيْضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَذْتَ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ أَوْ ثَلَاثَةً وَعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذَلِكَ يُجْزِئُكَ، وَكَذَلِكَ فَأَفْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيْضُ النِّسَاءُ، فَإِنْ قَوِيَتْ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظَّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَظْهَرِينَ، وَتُصَلِّينَ الظَّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعاً، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ الْعِشَاءَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ،

حضرت حمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے عارضہ استحاضہ میں مبتلا رہتی تھی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں استفسار کیلئے حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا ”یہ تو شیطان کی چوک (مار) ہے۔ لہذا تو چھ یا سات روز ایام حیض شمار کر کے پھر نہالے، جب تو اچھی طرح پاک و صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تیس روز نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔ یقیناً یہ تیرے لئے کافی ہے پس ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب پاک و صاف ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں کو اکٹھا کر پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر کے غسل کر لے اور جمع صلاتیں کر لے۔ تو ایسا کر لے (یعنی ایسا کرنے کی اجازت ہے) اور صبح کی نماز کیلئے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔“ پھر فرمایا ”دونوں

فَاعْمَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔“
وَتُصَلِّينَ، قَالَ: وَهُوَ أَعْجَبُ (اس کو سنائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی
الْأَمْرَيْنِ إِلَيَّ)۔ رَوَاهُ الْخَنَزُ إِلَّا الشَّائِئِي، نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے حسن کہا ہے
وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ الْبُخَارِيُّ۔

لعنوی تشریح: ﴿استغنی﴾ میں نے آپؐ سے فتویٰ پوچھا۔ ﴿رکضہ﴾ چوک مارنا وغیرہ۔ ﴿فتحیضی ستہ ایام او سبعة ایام﴾ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کسی کو سات روز۔ اس میں عمر اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ ﴿فاذا استنقأت﴾ جب تو پاک صاف ہو جائے۔ ﴿صومی و صلی﴾ روزہ رکھ، نماز پڑھ، فرض ہو یا نفلی جو جی میں آئے ﴿وہو اعجب الامرین الی﴾ الامرین سے مراد ہر نماز کیلئے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا (یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے)
حاصل کلام: اس حدیث سے حمنہ بنت جحشؓ کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایک ظہر اور عصر کیلئے دوسرا مغرب اور عشاء کیلئے اور تیسرا نماز فجر کیلئے۔ اس سے پہلی حدیث میں فاطمہ بنت ابی جحش کو ہر نماز کیلئے وضو کا حکم دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے البتہ ہر نماز کیلئے از سر نو وضو فرض ضرور ہے۔ غسل بس مستحب ہے وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿حمنہ بنت جحش﴾ حمنہ میں ”حا“ اور جحش کی جیم دونوں پر فتح ہے اور ”میم“ اور ”حا“ دونوں ساکن ہیں۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن تھیں۔ پہلے یہ مصعب بن عمیرؓ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوہ احد میں مصعب شہید ہو گئے تو یہ طلحہ بن عبد اللہؓ کی زوجیت میں آگئیں۔

(۱۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الدَّمَّ، فَقَالَ: «أَمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكَ حَبِصَتُكَ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، وَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلَاةٍ. رواه مسلم.

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحشؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دم استحاضہ کا شکوہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”تمہارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے سے متعین ہیں اتنے ایام میں (نماز، روزہ) چھوڑ دے۔ اس کے بعد نہادھو کر نماز ادا کرو۔“ ام حبیبہؓ اس کے بعد ہر نماز کیلئے تازہ غسل کیا کرتی تھیں۔ (مسلم)

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ ”پھر ہر نماز کیلئے وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ «وَتَوَضَّعِي

لِكُلِّ صَلَاةٍ. وَهِيَ لِأَبْنِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ اِزْ سَرْنُو وَضُو كَر لِيَا كَر۔“ ابو داؤد وغیرہ محدثین نے مِنْ وَجْهِ آخَر۔ اس حدیث کو دوسرے طریقے سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تَحْبِثُ﴾ تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ چنانچہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کیلئے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ، استحاضہ کے خون اور حیض کے خون کو ان کی تین علامات میں سے کسی کی بنیاد پر دونوں میں فرق کرے گی۔ جہاں تک دونوں خونوں میں تمیز کا تعلق ہے تو اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے اس کی بو بھی بڑی کریہ ہوتی ہے اور استحاضہ کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ رقیق یعنی پتلا ہوتا ہے یا پھر خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے یا پھر دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آسکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقہ اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند اور کند ذہن عورت اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے اور جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں وہ بحث بڑی دقیق، گنگنمگ اور مغفلت ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید ہے بلکہ بہت ہی دور ہے اور یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو سہل الفہم ہے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جمہور کے نزدیک تطوع کی ہے۔ ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کیلئے از سر نو غسل کرنا فرض و واجب قرار نہیں دیا۔ فسخ الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کیلئے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے۔ اس کے بعد ہر نماز کیلئے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ مذکورہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ پھر جس علامت سے اس کو پہچان ہو جائے، اسی پر کاربند ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ام حبیبہ رضی اللہ عنہا﴾ بعض کا خیال ہے اس سے حمہ بنت جحشؓ ہی مراد ہے۔ ایسا نہیں

بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمن بن عوف کے نکاح میں تھیں۔ مسلم کی روایت کی رو سے انہیں مسلسل سات سال تک استحاضہ کا مرض لاحق رہا۔ ۳۴ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہا بعض نے کہا کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضہ استحاضہ کا شکار تھیں۔ ایک ام المومنین زینب، دوسری حمہ اور تیسری ام حبیبہ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضہ سے محفوظ تھیں۔ کہتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو مستحاضہ کے عارضہ میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لَا نَعُدُّ مَا هَوَارِيَّ كَے اختتام پر) نہادھو کر پاک و صاف ہونے الكُدْرَةِ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطَّهْرِ شَيْئًا. کے بعد گلے اور زرد رنگ کی چیز کو (اس چیز کے خارج ہونے کو) کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں (یعنی ایسے مادہ کے خروج کو حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔)

(بخاری، ابوداؤد۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿الكُدْرَةُ﴾ میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ ﴿والصفرة﴾ زنگ والی رنگت۔ جس پر زردی غالب ہو۔ ﴿بعد الطهر﴾ ایام حیض سے پاک و صاف ہونے کے بعد۔ ﴿شیئاً﴾ یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جبکہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جاتی تو ہم حیض شمار نہیں کرتے تھے۔

حاصل کلام: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی دوران ایام حیض میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور ﴿بعد الطهر﴾ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے شمار کرتی تھیں۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا۔ آپ کی اس پر خاموشی، تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ام عطیہ رضی اللہ عنہا﴾ ان کا اسم گرامی نسیبہ تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین مرتبہ کی صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوہ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ان کو

نہلایا۔ بصرہ کے ایام مقام میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی اصل حدیث غسل میت کے بارے میں ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(۱۲۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ اس عورت کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”(اے مسلمانو!) تم ہم بسترِی کے علاوہ ہر قسم کا فعل عورت کے ساتھ کر سکتے ہو۔“ (مسلم)

نہ تھے۔ ﴿الانکاح﴾ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی سے مسلمانوں کیلئے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، لیٹنا، کھانا اور پینا سب جائز ہے صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ یہ چھوت چھات کی بیماری، ہنود و یہود کے ہاں ہے مسلمانوں کیلئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۱۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَنْزِرُ، فَيَسْأَلُنِي وَأَنَا
حَائِضٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿فاتر﴾ باب افعال سے صیغہ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں میں ازار پہن لیتی۔ ﴿فیبا شرنی﴾ میرے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے علاوہ ہوتا تھا۔ یعنی مباشرت جماع کے معنی میں نہیں ہے۔

حاصل کلام: ﴿باشربا شر مباشرة﴾ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے منکرین حدیث کی کہ انہوں نے عوام کو احادیث نبویہ سے بدظن اور متفر کرنے کیلئے اس کا معنی کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضور ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں کہ احادیث جھوٹی ہیں، یہ قابل اعتبار نہیں حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانا ہے تو اس سے جماع کے معنی کرنا بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔ شریعت نے زیر ناف کے علاوہ عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(۱۲۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نِيَّةُ الْإِسْلَامِ فِي أَوَّلِهِ خَيْرٌ مِنْ نِيَّتِهِ فِي آخِرِهِ

بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهَرِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي الْبَيْتِ طَوَافُ بَيْتِ اللَّهِ أَيَّامَ سَفَرٍ هُوَ كَرِهَ دُخَانُكَ
 حَدِيثٌ طَوِيلٌ . کرنا۔“ (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لَمَّا جِئْنَا﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے دوران سفر کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿سُفْرٌ﴾ سین پر فٹہ اور ”راء“ پر کسرہ۔ غیر منصرف ہے دو اسباب کی وجہ سے ایک علیت یعنی جگہ کا نام اور دوسرے تانیث کی وجہ سے۔ مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلہ پر۔ ﴿حَصَتْ﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طواف کیلئے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ناپاک عورت تو مسجد میں داخل بھی نہیں ہو سکتی خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے۔ اس لئے طواف بدرجہ اولیٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایسی حالت میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ رَضِيٍّ اللَّهُ حَضْرَتِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، مَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنْ أَمْرَاتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الْإِزَارِ». حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”پاجامہ یا تہ بند میں جسم کا جتنا حصہ ہے اسے چھوڑ کر باقی حصہ اس کیلئے حلال رواہ أبو داؤد، وَضَعَهُ.

ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الْإِزَارُ﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو ازار سے مراد جماع و باہم ہم بستری یعنی شوہر کیلئے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کر گزرنا جائز ہے اور دوسرا معنی پاجامہ و تہ بند کی جگہ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ جسم سے مباشرت حلال ہے اور دوسرے معنی کی رو سے تو یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ۱۳۱ کے الفاظ ﴿اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ﴾ کہ جماع کے علاوہ ہر قسم کا کام اس سے کرو۔ کیونکہ سابقہ حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے اور اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے حصہ سے استمتاع کی ممانعت ہے مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے۔ ثانیاً اس سے مراد صرف جماع اور وطی ہے جس سے یہ پہلی روایت کے معارض نہیں رہتی۔

(۱۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتْ النَّفْسَاءُ رَسَالَتِ مَاءِ النَّبِيِّ ﷺ فِي عَوْرَتِي بَنِي فِي الْوِلَادَةِ كَيْ تَقْعُدَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ چالیس روز تک ناپاک بیٹھی رہتی تھیں۔ (نسائی

نَفَاسِهَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا . رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا
النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظُ لِابْنِ دَاوُدَ .
کے الفاظ ابو داؤد کے ہیں۔)

وَفِي لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ
بِقِصَاصِ صَلَاةِ النَّفَاسِ .
وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .
اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے
ایام نفاس میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں
دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿نفاس﴾ نون پر ضمہ، فا اور سین پر فتح۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنہوں نے بچے کو جنم
دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا
رہتا ہے۔ ﴿اربعین یوما﴾ چالیس روز نفاس کی کثرت ہے۔ ابن ماجہ میں ایک روایت حضرت انس
رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حالت نفاس میں مبتلا عورتوں کیلئے مدت نفاس
چالیس روز مقرر فرمائی، البتہ اگر وہ چالیس روز سے پہلے پاک ہو جائے تو (اس کی مدت یہی شمار ہوگی)
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی اکثر مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از
کم مدت کوئی نہیں، ہاں اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی۔ اس حالت
میں نماز، روزہ ترک نہ کئے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ البتہ نفاس کا حکم تو حیض کی
طرح ہے۔ نفاس والی عورت، نماز روزہ ترک کر سکتی، مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں
کر سکتی۔ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے اجتناب کرے گی۔ اس دوران جتنے روزے چھوٹ گئے
تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی۔ نماز کی قضا نہیں دے گی۔



۲۔ کِتَابُ الصَّلَاةِ

نماز کے احکام

اوقات نماز کا بیان

۱۔ بَابُ الْمَوَاقِيتِ

(۱۲۹) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتْ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطَوْلِهِ، مَا لَمْ يَخْضُرِ الْعَصْرُ، وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور نماز عصر کے وقت کے آغاز تک رہتا ہے اور عصر کا وقت جب آدمی کا اصل سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے (تب شروع ہوتا ہے) اور نماز عصر کا آخری وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے اور نماز مغرب کا وقت (غروب آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوتا اور) شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت رات کے درمیان نصف تک ہے اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے آغاز سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔“ (مسلم)

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ بُرَيْدَةَ فِي الْعَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيَضَاءُ نَفِيَّةً» وَمِنْ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ».

اور اسی (یعنی مسلم) میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے کہ ”سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں ہو“ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آفتاب بلند ہو۔“

لغوی تشریح: ﴿کتاب الصلوة﴾ صلاۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں معروف

عبادت کو کہتے ہیں۔ ﴿باب المواقیت﴾ موقوفیت کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ بلحاظ زمانہ یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ ﴿اذا زالت الشمس﴾ جب سورج زوال پزیر ہو۔ یعنی آسمان کے عین درمیان سے جب بجانب مغرب سورج ڈھل جائے۔ ﴿وکان ظل الرجل کطوله﴾ اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو۔ یعنی عصر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ ﴿مالم یحضر العصر﴾ تاوقتیکہ نماز عصر کا وقت آجائے۔ یعنی آدمی کا (اصلی) سایہ اس کے قد کے برابر ہونا۔ ﴿الشفق﴾ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ ﴿الی نصف اللیل الاوسط﴾ یہاں لفظ اوسط نصف کی صفت بن رہی ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ اوسط کہلائے گا، اب پہلے نصف حصہ رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ ﴿نقیۃ﴾ فعلیہ کے وزن پر آیا ہے۔ صاف ستھرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا صاف و شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ ﴿مرتفعۃ﴾ آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کئے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل تک ثابت ہوتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے، ایک روایت کی رو سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے بھی اسی طرح ہے لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ علمائے احناف نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کسی صحیح مرفوع حدیث سے بھی دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اس حدیث سے ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر سرخی نمودار ہوتی ہے اس کے معابد جو سفیدی ظاہری ہوتی ہے شفق سے وہ سفیدی مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

اس حدیث میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے یعنی جب سورج طلوع ہونے لگے تو نماز بند کر دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سیگنوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اس لئے عین غروب شمس کے وقت نماز پڑھنی شروع

نہیں کرنی چاہئے۔ اس حدیث سے اوقات صلاۃ خمسہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کیلئے اول اور آخر وقت یہی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ دھوپ کے زردی مائل ہو جانے اور دو مثل سایہ کے بعد عصر کا وقت اور آدھی رات کے بعد عشاء کا وقت رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس حدیث سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ نہیں رہتا۔ البتہ کسی خاص مجبوری اور عذر کی حالت میں دھوپ کے زرد ہونے کے بعد عصر کا وقت اور نصف شب کے بعد عشاء کا وقت ہوتا ہے، بہر حال مختار وقت تو نہیں رہے گا۔ نیز بغیر عذر معقول کے سورج کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنے والے کو حدیث میں منافی شمار کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بریدہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ نام ہے۔ بریدہ اور حصیب دونوں تصغیر ہیں۔ قبیلہ اسلم سے ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلائے۔ جب نبی ﷺ ہجرت مدینہ کے دوران اس کے پاس سے گزرے تو اس موقع پر جو اسی آدمی مسلمان ہوئے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ غزوہ احد کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بصرہ کی طرف چلے گئے تھے پھر وہاں سے خراسان کی جانب جہاد کیلئے نکل گئے اور مرو میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۶۲ یا ۶۳ھ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

﴿ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ﴾ اس سے مراد عبد اللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ جلیل القدر صحابہؓ میں ان کا شمار ہے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوہ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبید اور عدن پر عامل مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ کوفہ اور بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے ہاتھوں تستر فتح ہوا اور دیگر بہت سے شہر بھی انہوں نے فتح کئے۔ ۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰) وَعَنْ أَبِي بَرزَةَ الْأَسْلَمِيِّ حَدَّثَنَا أَبُو بَرزَةَ الْأَسْلَمِيُّ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّيُ الْعَصْرَ، ثُمَّ يَرْجِعُ أَحَدُنَا إِلَى رَحْلِهِ فِي أَقْصَى الْمَدِينَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ، وَكَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخَّرَ مِنَ الْعِشَاءِ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيثَ بَعْدَهَا، وَكَانَ يَنْفُلُ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ حِينَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيسَهُ، وَكَانَ يَقْرَأُ سُوْرَاتِ الْبَقَرَةِ وَالْآلِعَافِ بِالسَّيِّئِ إِلَى الْمَائَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو بزرہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر (ایسے وقت) میں پڑھتے کہ ہم میں سے کوئی ایک مدینہ کی آخری حدود تک چلا جاتا پھر آفتاب زندہ (روشن، صاف) ہوتا اور آپؐ نماز عشاء کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ نماز عشاء سے پہلے سونے اور بعد از نماز عشاء (غیر ضروری) باتیں کرنے کو ناپسند اور مکروہ خیال فرماتے اور نماز فجر سے ایسے وقت فارغ ہوتے جب نمازی اپنے ساتھ والے شخص کو پہچان لیتا (عموماً) ساٹھ سے سو آیات کی تعداد تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

وَعَنْدَهُمَا مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ: اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، کہ آپؐ نماز عشاء «وَالْعِشَاءُ أَحْيَانًا يَقْدُمُهَا، وَأَحْيَانًا يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَأَاهُمْ اجْتَمَعُوا عَجَلًا وَإِذَا رَأَاهُمْ أَبْطَأُوا آخَرًا، وَالصُّبْحُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيَهَا بِغَلَسٍ. وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى: اندھیرے ہی میں پڑھتے (بخاری و مسلم) مسلم میں «فَأَقَامَ الْفَجَرَ حِينَ انْشَقَّ الْفَجْرُ، وَالتَّاسُ لَا يَكَادُ يَعْرِفُ بَغْضَهُمْ بَعْضًا». ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرمادیتے یہاں تک کہ اندھیرے کی وجہ سے صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿رحلہ﴾ ”راء“ پر فتح ”حاء“ ساکن، جائے سکونت۔ ﴿فی اقصی المدینہ﴾ گرائمر کے اعتبار سے یہ رحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینہ کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ ﴿والشمس حية﴾ اس میں ”واو“ ﴿یرجع﴾ کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں، نماز سے فراغت کے بعد جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (یعنی عصر کی نماز اتنی جلدی ادا کی جاتی تھی) اور سورج کے زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی باقی ہوتی تھی۔ اور ﴿من العشاء﴾ میں من تبعضیہ ہے مطلب یہ ہے عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپؐ کو پسند تھی۔ ﴿ینفعل﴾ ینصرف کے معنی، میں فارغ ہوتے، پھرتے ﴿الغداة﴾ فجر، صبح ﴿بالسین﴾ ساٹھ آیات سے۔ ﴿الی المائۃ﴾ سو تک۔ یعنی آیات اگر لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر میں ساٹھ آیات تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی بھی دوسرے ساتھی کو (اچھی طرح) پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قرأت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے ﴿الغلس﴾ اول وقت ہوتی ہے اسے غلس کہتے ہیں۔ ﴿انشق﴾ پھٹنا، تاریکی شب سے سپیدہ صبح کا ظہور ہونا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں لفظ ”غلس“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپؐ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی تریل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجئے کہ آپؐ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھنی چاہئے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ابوبرزہ اسلمیؓ﴾ ابوبرزہ ان کی کنیت ہے۔ نفلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور بعد والے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر بعد میں خراسان میں چلے گئے اور ایک قول کے مطابق مرو میں ۶۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ھ ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ حضرت رافع بن خدیجؓ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا بِمِنَا فِي يَوْمٍ مَغْرِبَ نَبِيِّ كَرِيمٍ ﷺ كُنَّا مَعَهُ نَصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتا (تو اتنی فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيَنْصِرُ مَوَاقِعَ رُشْنَى ابھی باقی ہوتی تھی) کہ تیر کے گرنے کی جگہ نَبَلِهِ. مُتَقَدِّمٌ عَلَيْهِ. دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مواقع نبلہ﴾ موقع کی جمع۔ تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ ﴿والنبل﴾ نون پر فتح اور ”با“ ساکن۔ ان لفظوں میں اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہیں تیر۔ حاصل کلام: نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿رافع بن خدیجؓ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ کم عمری و صغر سنی کی وجہ سے غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوہ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کی رات کا اول حصہ زیادہ تر گزر گیا تھا۔ آپؐ نماز کیلئے اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، وَقَالَ: تَشْرِيفَ لَائِي اور نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر میری «إِنَّهُ لَوْ قُتِلَ، لَوْ لَا أَنَا أَشَقُّ عَلَى امْتِ پر (یہ وقت) گراں نہ ہوتا تو میں نماز عشاء کا یہی وقت مقرر کرتا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعتم﴾ تاخیر کی، دیر کی اعتمام سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ﴿عتمہ﴾ میں داخل ہوئے۔ عتمہ، شفق کے غائب ہونے کے بعد، یا مطلق تاریکی کے غائب ہونے کے بعد رات کے تیسرے حصے کے گزر جانے کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ ﴿الاعتم﴾ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تاخیر اور دیر کے ہیں۔ ﴿عامۃ اللیل﴾ رات کا اکثر حصہ۔ ﴿انہ لوقتہا﴾ اس سے مختار وقت بھی مراد ہو سکتا ہے اور افضل وقت بھی۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے

ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز کیلئے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے اگر دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ تو گویا آنحضور ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے جو چیز افراد امت کیلئے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اسے آسان اور سہل بنانے کی کوشش فرماتے۔

(۱۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا وَقْتُ (ٹھنڈے وقت میں) نماز پڑھو (یعنی ذرا انتظار کر بالصَّلَاةِ، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. شدت جہنم کی سانس کی لپیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔» (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فابردوا﴾ ابراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ ﴿بالصلاة﴾ سے مراد نماز ظہر ہے یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ ﴿من فيح جهنم﴾ فیح کی ”فا“ پر فتح اور ”یا“ ساکن ہے۔ جہنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ اور اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور جہنم کے سانس کو بھی فیح کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہئے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہئے اس بارے میں ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک ہو جاتا۔ مگر علامہ خطابی نے کہا کہ یہ بھی تمام ممالک کیلئے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد و عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہر حال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔

(۱۳۴) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَصْبَحُوا بِالصُّبْحِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأَجُورِكُمْ». رَوَاهُ الْخَنَسَةُ. حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نماز فجر صبح کے خوب واضح ہونے پر پڑھا کرو۔ یہ تمہارے اجر میں اضافہ کا موجب ہوگی۔“ (اس کو پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے وَصَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ۔

اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اصبحوا بالصبح﴾ اور ایک دوسری روایت میں ﴿اصبحوا بالصبح﴾ کے بجائے ﴿اسفروا بالفجر﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر

اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث فلس والی حدیث کے معارض ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قرأت لمبی کی جائے کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے ”اسفار“ کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

حاصل کلام: احناف نے اسی حدیث کی روشنی میں اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے دائمی عمل، خلفائے راشدین، جمہور صحابہؓ اور تابعینؓ کے عمل کی بناء پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ابو داؤد میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ایک بار نماز فجر فلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ فلس ہی میں پڑھتے رہے۔ حدیث کا مطلب صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

(۱۳۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”طلوع آفتاب سے پہلے جس نے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔“

(بخاری و مسلم)

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اسی طرح بیان ہے مگر اس میں رکعت کی جگہ (سجدة) کا لفظ ہے پھر کہا کہ (سجدة) سے مراد تو رکعت ہی ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوَهُ، وَقَالَ: «سَجْدَةٌ» بَذَلْ «رَكْعَةً» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرُّكْعَةُ.

لغوی تشریح: ﴿لا صلاة﴾ یعنی کوئی نماز۔ اس سے نفل نماز مراد ہے۔ ﴿بعد الصبح﴾ یعنی نماز فجر کے بعد کوئی نفل نماز جائز نہیں۔ ﴿من ادرك ركعة﴾ جس نے ایک رکعت پالی۔ یعنی مکمل ایک رکعت، قیام، قراءۃ فاتحہ اور رکوع و سجود پالئے۔ ﴿قبل ان تطلع الشمس﴾ یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے ﴿فقد ادرك الصبح﴾ تو اس نے صبح پالی۔ یعنی اس کی نماز ادا ہو گئی۔ (قضاء نہیں ہوئی)

حاصل کلام: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کر لی پھر طلوع یا غروب آفتاب کا موقع آگیا تو نمازی کو چاہئے کہ دوسری رکعت پوری کر لے

اس کی نماز ہو جائے گی۔

(۱۳۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ ”صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور اسی طرح نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کے الفاظ ہیں کوئی نماز، نماز فجر کے بعد نہیں۔ اور مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے۔ اول یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو تا آنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم جب سورج نصف آسمان پر ہو تا وقتیکہ وہ ڈھل نہ جائے اور سوم جس وقت سورج غروب ہونا شروع ہو۔ دوسرا حکم (یعنی نصف النہار کے وقت نماز کی ادائیگی ممنوع ہونا) امام شافعی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے، مگر اس میں (الایوم الجمعة) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو) اور ابوداؤد نے بھی حضرت ابوقحادہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مانند روایت نقل کی ہے (جس میں جمعہ کے دن کا اشتہاء ہے)

وَالْحُكْمُ الثَّانِي عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ وَزَادَ: «إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ» وَكَذَا لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

یعنی نفلی نماز نہیں ﴿بعد الصبح﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿نقبر﴾ ”با“ پر ضمہ اور کسرو۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿موتانا﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔ ﴿بازغہ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿الظہیرہ﴾ نصف

لغوی تشریح: ﴿لاصلۃ﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿بعد الصبح﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿نقبر﴾ ”با“ پر ضمہ اور کسرو۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿موتانا﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔ ﴿بازغہ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿الظہیرہ﴾ نصف

النہار یعنی آدھے دن کا وقت۔ جب سورج چند ساعت کیلئے سیدھا قائم ہوتا۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ ادھر، ادھر، مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ﴿تذول﴾ آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہوتا۔ ﴿تنصیف﴾ بھی مائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿والحکم الشانی﴾ سے مراد عین نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ ﴿وکذا لابی داود﴾ ابو داؤد میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جو کام ممنوع ہیں ان کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا یہ کہ ہم میت کو ان تین اوقات میں دفن نہ کریں۔ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اور دوسرا حکم یہ کہ دوپہر کا وقت ہے۔ جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو، مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنا یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جمعہ کا دن ایسا ہے کہ جس میں زوال کے وقت نوافل ادا کئے جاسکتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ جمعہ کے روز زوال کے وقت نماز جمعہ بھی ادا کی جاسکتی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جمعہ کے دن کا استثناء صراحت کے ساتھ منقول ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے اور حدیث میں جو طلوع آفتاب کے بعد ”ترتفع“ کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے تو، اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابو داؤد اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزہ مذکور ہے جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزہ برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ﴾ عین پر ضمہ اور ”قاف“ ساکن۔ ان کی کنیت ابو حماد یا ابو عامر ہے۔ قدیم الحجرت تھے۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معرکہ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تین سال مصر کے والی رہے۔ نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ، (کہ وہ طواف نہ کرے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے وَصَلَى آيَةً سَاعَةً شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے عبد مناف کی اولاد! بیت اللہ کا طواف کرنے والے کسی کو مت منع کرو (کہ وہ طواف نہ کرے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے کو (نماز پڑھنے سے منع کرو) خواہ وہ شب و روز کی

نَهَارٍ. رَوَاهُ الْحَمْسِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ
 ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور
 جَبَّانٌ.

ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿یا بنی عبد مناف﴾ عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لئے کیا ہے کہ یہ اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ ﴿وصلی اية ساعة شاء..... الخ﴾ یہ الفاظ ممنوعہ تین اوقات میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن احادیث میں ممانعت ہے یہ حدیث اس عام حکم کو بیت اللہ کی وجہ سے خاص قرار دیتی ہے کہ بیت اللہ میں یہ ممانعت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکور وہ کوئی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ عام نوافل اس سے مراد نہیں مگر ابوداؤد میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل مراد ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے جمہور علماء اسے خانہ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿جبر بن مطعم رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو امیہ تھی۔ جبر تصغیر ہے جابر سے۔ پورا نام جبر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی تھا۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندان قریش کے نسب نامے کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴ھ، ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو فوت ہوئے۔

﴿عبد مناف﴾ مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد مناف کہلائے۔ ورنہ ان کا نام تو مغیرہ تھا، کنیت ابو عبد شمس تھی۔ بنو مخزوم اور بنو عبد مناف دونوں سے تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ ﷺ کے جد امجد تھے۔ قریش کے ذی وقار سردار شمار ہوتے تھے۔

(۱۳۸) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ارشاد ہے کہ ”شفق سے مراد سرخی ہے۔“ (دارقطنی «الشفق الحُمْرَةُ». رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ ابْنُ خُرَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَفَقَّهُ. صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿الشفق الحُمْرَةُ﴾ شفق سے مراد سرخی ہے (جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے) بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ لغوی بحث کیلئے اہل لغت کی طرف رجوع کیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں۔ ان کی بات دلیل و حجت ہے خواہ موقوف ہی

کیوں نہ ہو۔ لغت کی مشہور کتاب ”القاموس“ میں شفق کا معنی وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب سے لے کر عشاء تک یا اس کے قریب تک آسمان پر نمودار رہتی ہے۔

حاصل کلام: شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اس تعریف پر تمام آئمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تنہا اس کے خلاف شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دو شاگردان رشیدان نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(۱۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:

«الْفَجْرُ فَجْرَانِ، فَجْرٌ يُحْرَمُ الطَّعَامُ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلَاةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلَاةُ، أَيِ صَلَاةِ الصُّبْحِ، وَتَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ». رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالتَّحَاكِمُ، وَصَحَّاحُهُ، وَلِلتَّحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ فِي الَّذِي يُحْرَمُ الطَّعَامُ: إِنَّهُ يَذْهَبُ مُسْتَعِيلًا فِي الْأَفْعْرِ. وَفِي الْآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَّبَ الشَّرْحَانِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”فجر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ فجر جس میں کھانا حرام ہے اور نماز ادا کرنا جائز و حلال اور ایک وہ فجر ہے جس میں نماز پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔“ (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے) اور مستدرک حاکم میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ”جس صبح میں کھانا حرام ہے وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں پھیل جاتی ہے اور دوسری بھیڑیے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿يحرم الطعام﴾ کھانا حرام کرتی ہے روزے دار کیلئے ﴿وتحل فيه الصلوة﴾ اور اس میں نماز جائز و حلال ہے یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد صبح صادق ہے۔ ﴿زاد﴾ یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ ﴿فی الذی﴾ اس فجر میں جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے یعنی مشرقی کنارے پر اور ”افق“ آسمان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس و معلوم ہوتا ہے اور بخاری کی ایک روایت میں تو اس طرح بھی منقول ہے کہ آپؐ نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر سمجھایا۔ ﴿وفی الآخر﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس سے وہ فجر مراد ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کیلئے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ ﴿کذب السرحان﴾ کاف برائے تشبیہ اور ذنب میں ذال اور نون پر فتحہ۔ معنی بھیڑیے کی دم۔ ﴿والسرحان﴾ سین پر کسرہ اور ”راء“ ساکن۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو یہ ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی

ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب۔ دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(۱۴۰) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الصَّلَاةُ فِي سَبْعِ أَفْضَلِ» (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کرنا) وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ. رواه الترمذی والحاکم، کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری احادیث میں ایمان، صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ ساری احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں، ان میں موافقت اور تقابلی اس طرح ہوگا۔ ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے لہذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے اور نماز کا تعلق بدنی عبادت سے ہے، یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے اور صدقہ کا تعلق مالیات سے ہے، مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی و توانائی، صحت کا سب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی منافات نہیں رہتی۔ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

(۱۴۱) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوَّلُ الْوَقْتِ رِضْوَانُ اللَّهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللَّهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جِدًّا وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوَهُ دُونَ الْأَوْسَطِ وَمَوْ ضَعِيفٌ أَيْضًا. حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اول وقت میں (نماز پڑھنا) رضاء الہی کا موجب ہے اور درمیانی وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الہی کا سبب ہے اور اس کو آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ سے معافی کا موجب ہے۔“ (دارقطنی نے اسے نہایت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن

اس میں لفظ وسط مذکور نہیں اور وہ ضعیف بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿دون الاوسط﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانی وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں تو صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔ یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک دارقطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطے سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظر انداز ہی کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث

وضع کیا کرتا تھا اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے، جسے متم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ محدثین ناقدین کی نقد و جرح کے بعد حدیث قابل اعتناء ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: ﴿ابو محذورہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام سرہ یا اوس تھا۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ نماز پنج گانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(۱۴۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَارِشَادُ هُيَ "فَجْرُكِي (فَرْضِ نِمَاز) كَ بَعْدِ صَرْفِ قَالُ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ إِلَّا سَجْدَتَيْنِ». أَخْرَجَهُ الْحَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ. نَسَائِي كَ سَوَا پَانچوں نَے رَوَايَت كَیَا هُے

وَفِي رَوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «لَا صَلَاةَ اور عبد الرزاق کی روایت میں ہے کہ "طلوع فجر بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكَعَتَيْنِ كَ بَعْدِ صَرْفِ فَجْرُكِي دو ركعات ہیں اور دار قطنی میں الْفَجْرِ» وَمِثْلُهُ لِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنْ ابْنِ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ.

لغوی تشریح: ﴿لا صلوٰۃ بعد الفجر﴾ بعد الفجر سے مراد طلوع فجر ہے۔ ﴿الاسجدتین﴾ یہاں سجدتین کا معنی رکعتیں ہے (دو رکعتیں) اور ایک نسخہ میں رکعتیں ہے سجدتین کی جگہ۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔

(۱۴۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نِمَازَ عَصْرِ پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو ركعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض كَیَا یہ دو ركعت كَیسی ہیں؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "ظہر کے فرائض کے بعد كی دو سنتیں پڑھ نہیں سكا تھا وہ اب میں نے پڑھی ہیں۔" میں نے پھر عرض كَیَا كہ اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو كَیَا ہم بھی ان كی قضاء دیا كریں۔ فرمایا "نہیں۔" (اسے احمد نے روایت كَیَا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

نَعَالَى عَنْهَا بِمَعْنَاهُ.

طرح کی روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿شغلت﴾ صیغہ مجہول۔ اس کا معنی ہے کہ مجھے روک دیا گیا۔ اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلہ عبد القیس کے کچھ لوگوں کی آمد نیز صدقہ کا مال بھی پہنچ گیا تھا۔ تقسیم مال اور ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں وہ میں نے ابھی پڑھی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا کریں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”تم اس وقت انہیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو۔“ علامہ الیامانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد ان سنتوں کی قضا نبی ﷺ کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کیلئے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد ہمیشہ انہیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیا تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کی قضا رسول اللہ ﷺ کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ اور علامہ الیامانی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ ”افنقضیہما اذا فاتتہما قال لا“ کہ کیا جب رہ جائیں تو ہم ان کی قضا دیں؟ تو آپ نے فرمایا ”نہیں“ ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضا نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی تفصیل ”اعلام اہل العصر“ میں شارح ابوداؤد شیخ شمس الحق محدث ڈیوانوی نے خوب بیان کی ہے۔

اذان کا بیان

۲ - باب الأذان

(۱۴۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ بَيْنِي - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الْأَذَانَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ، وَالْإِقَامَةَ فَرَادَى، إِلَّا «قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ»، الْحَدِيثُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو اللہ اکبر اللہ اکبر پھر اس نے ساری اذان کہی چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ بغیر ترجیع کے اور اقامت میں صرف ایک ایک مرتبہ کہا، مگر (قد قامت الصلاة) کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپ کو سنایا) آپ نے فرمایا ”یقیناً یہ خواب سچا ہے۔“ (اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلَالٍ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ «الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ»۔
 احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں «الصلاة خير من النوم» کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ میں حضرت ولابن خزيمة عن أنس قال: من السنة إذا قال المؤذن في الفجر «حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ» قَالَ: «الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ»۔
 انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا سنت ہے کہ جب مؤذن صبح کی اذان میں حی علی الفلاح «حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ» قَالَ: «الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ» کے تو وہ کہے «الصلاة خير من النوم»۔

لغوی تشریح: ﴿بتربيع التكبير﴾ اللہ اکبر کی تکبیر کو چار مرتبہ کہنا۔ ﴿بغير ترجيع﴾ ترجیع کا معنی ہے کہ اذان میں ﴿اشهد ان لا اله الا الله﴾ کو پہلے پست آواز (آہستہ آواز) سے ادا کرنا، دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا ﴿والاقامة﴾ اس سے مراد کلمات اقامت ہیں ﴿فرادی﴾ اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا البتہ ﴿قد قامت الصلاة﴾ دو مرتبہ ﴿لرئوبيا حق﴾ ”لام“ اس میں برائے تاکید ہے اور رؤیا حق کی طرف مضاف ہے یا مراد ہے وہ خواب جو عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا حق ہے۔ اس کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف تصور ہوگی اور وہ لفظ ﴿بتمامه﴾ ہو سکتا ہے یا پھر دو سری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے (الحدیث) تو اس صورت میں ”اقرا الحديث وتممه“ ہوگا اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ﴿الى آخر الحديث﴾ ہوگا۔ ﴿زاد احمد في آخره﴾ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ احمد نے عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اضافہ حدیث بلال (رضی اللہ عنہ) میں ہے، تاکہ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مراد یہ امام احمد رحمہ اللہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں ﴿الصلاة خير من النوم﴾ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کیلئے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ بعض نے کہا نماز کیلئے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے ”بوق“ (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کیلئے اذان دی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو باواز بلند ”الصلاة جامعة“ کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں، نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت کیا اللہ کے بندے کیا ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا تم اس سے کیا کرو گے؟ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس کے ذریعہ (لوگوں کو) نماز باجماعت کیلئے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا میں

تمہیں اس سے کہیں بہتر طریقہ سے آگاہ نہ کر دوں؟ عبد اللہ بن زید عنہما نے کہا ہاں (ضرور بتائیں) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انہیں سکھائے۔ یہی خواب عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا جسے آپؐ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے، اِلٰہِیّہٗ حضرات کی رائے یہی ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا اس لئے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جنہیں آپؐ نے یہ تعلیم دی، نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین ”اشھد ان لا الہ الا اللہ“ ”اشھد ان محمداً رسول اللہ“ کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا، حالانکہ یہ درست نہیں۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کا انکار محض مجادلہ ہے، البتہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح جائز ہے مگر صحیحین کی روایات کی بناء پر رائج یہ ہے کہ ترجیع کے ساتھ اقامت اکہری کہی جائے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ﴾ ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاریٰ خزرجی کہلائے۔ غزوہ بدر کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں انہوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی اور یہ واقعہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انہوں نے ۳۲ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿بلال رضی اللہ عنہ﴾ یہ قبیلہ تیم کے آزاد کردہ غلام بلال بن رباح تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ ان کو بھی غزوات بدر و احد، احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن تھے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۷ھ یا ۸ھ میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(۱۴۵) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ
الْأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ. أَخْرَجَهُ
مُسْلِمٌ، وَلَكِنْ ذَكَرَ التَّكْبِيرَ فِي أَوَّلِهِ
مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الْخَمْسَةُ فَذَكَرُوهُ
مُرَبَّعًا.

حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انہوں نے ترجیع کا
ذکر کیا ہے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں پہلی
دفعہ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ ابو مخذومہ
رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور
انہوں نے اللہ اکبر کو پہلی دفعہ چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿علمہ الاذان﴾ علم، تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کیلئے ہم نو ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو

يُؤَدِّنُ، وَاتَّبَعُ فَاهُ هُهُنَا وَهُهُنَا،
وَأَصْبَعَاهُ فِي أَدْنِيهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ،
وَصَحَّحَهُ.

پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کی دونوں انگلیاں
(انگشت ہائے شہادت) ان کے کانوں میں تھیں۔ (احمد
اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح
قرار دیا ہے۔)

وَلَا بِنَدِّ مَاجَهُ: وَجَعَلَ إِصْبَعِيهِ فِي
أَدْنِيهِ. وَلِأَيِّ دَاوُدَ: لَوَى عُنُقَهُ لَمَّا
بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» يَمِينًا
وَشِمَالًا، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَضْلَهُ فِي
الصَّحْبِخَيْنِ.

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی
انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کر لیں اور ابو داؤد میں
ہے کہ جب (حی علی الصلاۃ) کہتے تو اپنے
دائیں بائیں ذرا رخ موڑ لیتے بالکل گھومتے نہیں
تھے۔ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لعنوی تشریح: ﴿اتبع فاه﴾ تتبع باب تفضل سے ہے۔ مطلب ہے کہ میں ان کے چہرے کی طرف
نظریں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کو بغور ملاحظہ کر رہا تھا ﴿ههنا﴾ دائیں جانب ﴿وههنا﴾ اور
بائیں جانب۔

حاصل کلام: اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حی (علی الصلاۃ) حی علی
الفلاح) کہتے وقت دائیں بائیں اپنے چہرے کی حد تک پھیرنا مسنون ہے۔ اذان کہتے ہوئے کانوں میں
انگلیاں داخل کرنے کے دو فائدے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کوئی بہرہ
آدمی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے اذان کہی جا رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ﴾ ابو جحیفہ کنیت ہے۔ وہب بن عبد اللہ سوائی نام ہے۔ جحیفہ میں
جیم پر ضمہ ہے اور تغیر ہے۔ سوائی میں سین پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صغار صحابہؓ میں شمار
کئے گئے ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ تمام مشاہد و
غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں ۷۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۴۸) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْجَبَهُ
صَوْتُهُ فَعَلَّمَهُ الْأَذَانَ. رَوَاهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم
ﷺ کو ان کی آواز بہت پسند آئی۔ چنانچہ آپ نے
اسے (ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ) کو اذان کی تعلیم خود دی۔

(اذان سکھائی) (ابن حزم)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور چناؤ اور تقرر میں آواز کو ملحوظ
رکھنا چاہئے۔ اچھی آواز دلوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(۱۴۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ
حَضْرَتِ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الْعَيْنَيْنِ، مِنْ غَيْرِ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَةٍ. (اس روایت کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالتِ مآب ﷺ میں نماز عیدین باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود نہ ان کیلئے اذان کی جاتی تھی اور نہ اقامت اور امت کا بھی اس پر عمل ہے۔

(۱۵۰) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي الْحَدِيثِ الطَّوِيلِ فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلَاةِ: ثُمَّ أَدْنَى بِلَالًا، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو قتادہؓ (ایک لمبی حدیث جس میں دوران سفر غلبہ نیند اور تھکاوٹ سفر کی وجہ سے سو جانے کا ذکر ہے) سے مروی ہے، جب نیند سے بیداری ہوئی تو پھر بلالؓ نے اذان کی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ پڑھتے تھے۔ (مسلم)

اور مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپؐ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی اور مسلم ہی میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں اور ابو داؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کیلئے حکمیر کہی گئی اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لئے بھی اذان نہیں کی گئی۔

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى الْمُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ.

وَلَهُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلَاةٍ» وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: وَلَمْ يُنَادَ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

لغوی تشریح: ﴿فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلَاةِ﴾ سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح آئی ہے کہ آپؐ خیر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں کہیں پڑاؤ کیا۔ نبی ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بیدار رہنے کا حکم ارشاد فرمایا کہ جب طلوع فجر ہو تو وہ انہیں جگا دیں۔ نبی کریم ﷺ سو گئے اور بلالؓ پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بھی سو گئے۔ پس طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو

(یہ صورتحال ملاحظہ فرما کر نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا (تعمیل حکم میں) سب صحابہؓ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور آپؐ نے نماز پڑھائی۔ ﴿مزدلفہ﴾ یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے مابین واقع ہے۔ یہ حج کے مشہور شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ ﴿ولم یسند فی واحد منهما﴾ ان دونوں میں سے کسی کیلئے بھی منادی (اذان) نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز کا وقت فوت ہو جائے اور نماز باجماعت کا ارادہ ہو تو پھر نماز کیلئے اذان کہنی چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ حدیث مزدلفہ کے قیام میں مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان کہنے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ”ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ مگر یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ اولیٰ ہے کیونکہ مثبت کو منفی پر مقدم تسلیم کیا گیا۔

(۱۵۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «إِنَّ بِلَالًا يُؤَدُّنُ بَلِيلَ، فَكُلُّوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلًا أَعْمَى لَا يُنَادِي حَتَّى يُقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». مَقْفُ عَلَيْهِ، وَفِي آخِرِهِ إِذْرَاجٌ. تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یؤذن بلیل﴾ رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ ﴿فکلوا واشربوا﴾ کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے کھا پی سکتے ہو۔ ﴿ادراج﴾ راوی کا اپنی طرف سے اضافہ (تشریح و توضیح) کی صورت میں داخل کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں ﴿وکان رجلاً اعمی﴾ کا فقرہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اول وقت سے اذان کو مؤخر کیا جائے، کیونکہ اطلاع دینے والا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب وقت اطلاع دیتا (کہ فجر ہو گئی ہے) یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا (اس وقت اسے مطلع کرتا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے۔ لیکن یہ اذان اس غرض کیلئے نہیں ہوتی جس غرض کیلئے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے

لوگوں کو بیدار کرنا کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کیلئے دو موذن رکھنا درست ہے۔

(۱۵۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: أَنَّ بِلَالَ أَدَّانَ قَبْلَ الْفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِي: أَلَا إِنَّ الْعَبْدَ نَامَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَفَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں دوبارہ اذان کہنے کا حکم دیا (تو بلال رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہہ کر منادی کی) ”خبردار! سنبندہ کو نیند آگئی تھی۔“ (ابوداؤد نے اسے

روایت کیا اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذن قبل الفجر﴾ طلوع فجر سے قبل اذان کہی، اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی) یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ قبل طلوع فجر اذان دینا مشروع نہیں تھا۔ ﴿ضعفه﴾ ابو داؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے کہ ایوب سے صرف حماد بن سلمہ ہی روایت کرتا ہے اور امام ابن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور حماد بن سلمہ نے اس میں خطا کھائی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ روایت اس موقع پر محمول ہوگی جب ابتداء میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مقرر کیا گیا تو بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح سے پہلے دیتے اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ صبح ہونے کے بعد، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عمرو یا عبداللہ بن قیس قرشی عامری تھا، جن کا ذکر سورہ عبس کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(۱۵۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوسَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا سَمِعْتُمُ النَّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح موذن کہہ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

وللبخاري عن معاوية رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. اور مسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے جو

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ الْقَوْلِ كَمَا
يَقُولُ الْمُؤَدُّنُ كَلِمَةً سِوَى
الْحَيْعَتَيْنِ، فَيَقُولُ: لَا حَوْلَ وَلَا
قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے، سننے والا اسی طرح کہتا جائے اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہیں خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں اور (حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہنا جائے اور جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو۔ تو یہ حکم عام ہے، (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہنے کا حکم خاص ہے اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(۱۵۴) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي
الْعَاصِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ
قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! اجْعَلْنِي إِمَامَ
قَوْمِي، فَقَالَ: «أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ
بِأُضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَدَّنَا لَا يَأْخُذْ
عَلَى أَذَانِهِ أَجْرًا». أَخْرَجَهُ الْحَنَسَةُ وَحَسَنَةُ
الرَّيْزِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

نفعی تشریح: ﴿واقْتَدِ بِزَعْفَرِهِمْ﴾ اقتداء سے فعل امر ہے۔ یعنی اپنے نمازیوں میں سے ضعیف و کمزور نمازیوں کا خیال رکھنا، ان کی غشاء کا، ان کے احوال کا خیال رکھنا گویا کہ تم انہی کو نماز پڑھا رہے

-۷۰-

حاصل کلام: مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لئے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہ کرے کہ کمزور و ناتواں لوگ آگتا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کو اذان کی اجرت نہ لیننی چاہئے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بناء پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط کماحقہ پورا کرنے کی صورت میں اس کا حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿عثمان بن ابی العاصؓ﴾ ابو عبد اللہ ان کی کنیت تھی۔ طائف سے جو وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۵۵) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ» الْحَدِيثُ، كَيْلَيْهِ اَذَانُ كَمْ” پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

راوی حدیث ﴿مالک بن حویرثؓ﴾ ان کی کنیت ابوسلمان تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حصول تعلیم دین کیلئے آئے تھے۔ بیس روز تک آپ کے پاس قیام کیا جب واپس جانے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”راستہ میں جب وقت نماز آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔“ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ۷۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

(۱۵۶) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لِبَلَالٍ: «إِذَا أَذَنْتَ فَتَسَلَّ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْذَرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ أَكْلًا قَدَرًا مَا يَفْرُغُ الْإِكْلُ مِنْ أَكْلِهِ» الْحَدِيثُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَعَفَةُ. سَكَمَ۔“ (پھر حدیث پوری بیان کی۔ اسے ترمذی نے روایت

نے اذان کی لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں اہل علم کی اکثریت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کا حقدار ہے۔ ہاں یہ حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے معارض ہے جو ۱۹۸ نمبر پر ہے۔ احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وسعت ہے دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ ﴿وفیہ ضعف ایضا﴾ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف پایا جاتا ہے اور فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور ”الصدائی“ رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو صدائی کی حدیث رائج ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بعد کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿زید بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ صداء قبیلہ کے فرد تھے۔ یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہوئی تھی۔ آپ کے روہرو اذان دی۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «مُؤْذِنُ أَذَانٍ أَمْلَكَ بِالأَذَانِ، وَالإِمَامُ أَمْلَكَ بِالإِقَامَةِ». رَوَاهُ ابْنُ عُديٍّ، وَضعفه، وَلِيبْنِهِمْ نَحْوُهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مؤذن اذان کا زیادہ حقدار ہے اور امام تکبیر کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔“ (اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے اور بیہقی میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے)

لغوی تشریح: ﴿رواہ ابن عدی و ضعفہ﴾ ابن عدی نے اسے ضعیف اس بناء پر قرار دیا ہے کہ شریک قاضی تھا اسے روایت کرتا ہے لیکن ابن معین نے کہا شریک صدوق، ثقہ ہے۔ البتہ اگر اس کی مخالفت ہو تو پھر ہمیں دوسرا محبوب ہے اور نسائی نے کہا ﴿لیس بہ باس﴾ (اس میں کوئی حرج نہیں)۔ اور احمد نے کہا کہ وہ عاقل اور صدوق ہے۔ امام مسلم نے اس سے متابعتاً روایت لی ہے۔ حاصل کلام: مؤذن اذان کمزیدہ استحقاق رکھتا ہے کیونکہ اس کو اذان کے وقت کا محافظ بنایا گیا ہے لہذا مؤذن کو اذان دینے میں تاخیر یا تقدیم پر مجبور کرنے کا کوئی بھی مجاز نہیں اور امام، تکبیر کہلانے میں حقدار ہے، یعنی اس کے اشارہ و اجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔

(۱۵۸) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «إِذَا كَانَ أَمْرُكُمْ بِالْإِقَامَةِ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دعا مسترد نہیں کی جاتی۔“ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: ترمذی میں حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ بھی منقول ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو پھر ہم (اس وقت) کیا دعا کریں؟ فرمایا ”سلوا الله العفو والعافية في الدنيا والاخرة“

کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و بخشش اور دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقبولیت دعا کیلئے یہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

(۱۵۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اللَّهُمَّ رَبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةُ الثَّامَةُ، وَالصَّلَاةُ الْقَائِمَةُ، آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الْأَوْثَمَةُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا کی تو اس کے لئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔ اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ (مقام محمود) اور فضیلت عطا فرما اور مقام محموداً سے وعدہ فرمایا ہے پہنچا دے (کھڑا فرما دے) تو اس کیلئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔“

(اس کو ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿نداء﴾ بمعنی اذان۔ رب منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے یا پھر دوسرے منادی سے اور وہ مضاف ہے۔ ﴿هذه الدعوة الثامنة﴾ کے قول کی طرف۔ اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ثامنة﴾ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ رب ہی توحید کا ملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے ﴿والصلوة القائمة﴾ قیامت تک باقی رہنے والی۔ ﴿الوسيلة﴾ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہ لائق ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا ﴿والفضيلة﴾ اس مرتبہ کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو ﴿وابعنه﴾ اس کو وہاں پہنچا دے، بھیج دے ﴿مقاما محمودا﴾ یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد و ستائش کریں گے جو اس موقع پر انہیں الہام کئے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپ کو نہیں ہو گا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہو گی۔ ﴿حلت﴾ واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہو گا کہ پڑھنے والے کیلئے نبی کریم ﷺ کی بروز قیامت شفاعت ہو گی۔ جس کی آپ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ ”مقام محمود“ کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ﴿عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾ یعنی امید

ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

۳ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ

شرائط نماز کا بیان

(۱۶۰) عَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِّ الصَّلَاةَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ.

حضرت علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دوران نماز جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے، از سر نو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔“ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب شروط الصلاة﴾ شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو اور اس حیثیت سے اس کیلئے لازمی اور ضروری ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ بھی نہیں رہتی۔ یعنی اس کا ہونا اس چیز کے ساتھ لازم ہے۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام نہ ہو۔ ”اذافات الشرطيات المشروطة“ جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ ﴿فسا﴾ فسو سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مقعد سے بغیر آواز کے جو ہوا خارج ہوتی ہے۔ ﴿وليعدد الصلاة﴾ ولیمعد میں بعد اعادہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی لوٹنا، دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے از سر نو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہؓ سے نواقض الوضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ لیکن جیسا پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا رائج اور قابل ترجیح یہی بات ہے کہ غیر مشروط طور پر نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام علی بن طلحہ (طاع پر فتح، لام ساکن) بن المنذر بن قیس سحی، یمامی حنفی، بنو حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں، صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلق بن علی کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

(۱۶۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ حَافِظٍ إِلَّا بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ”جسے حیض آتا ہے (یعنی وہ عورت جو بالغہ ہے) اللہ تعالیٰ اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔“ (اسے بجز نسائی کے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خریمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لعنوی تشریح: ﴿حائض﴾ اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے۔ ﴿الخمارة﴾ ”خاء“ کے نیچے کسرہ، اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔
حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہئے حتیٰ کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔

(۱۶۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «إِنْ كَانَ الثُّوبُ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِهِ، يَغْنِي فِي الصَّلَاةِ». وَلَمْ يُسَلِّمْ: فَخَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقًا فَانْزِرْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا ”جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو (نماز میں) کپڑا خوب (جسم پر) لپیٹ لو“ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ کپڑا کشادہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو کندھوں پر دونوں طرف ڈال لو اور اگر کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اسے تہنہ کی صورت میں باندھ لو۔

(بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «لَا يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثُّوبِ الْوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَاتِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔“

لعنوی تشریح: ﴿فالتحيف﴾ التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ چادر کے اوڑھنے یا پہننے کو کہتے ہیں۔ جس کی وضاحت اگلا جملہ کر رہا ہے۔ ﴿فخالف بين طرفيه﴾ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں بغلوں کے نیچے سے کپڑا نکال کر کندھوں پر ڈال دے۔ دائیں طرف کا بائیں کندھے پر اور بائیں طرف کا دائیں کندھے پر اور گدی کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ دے لے (یعنی گرہ لگا لے)۔ ﴿فانزِر﴾ باب افتعال سے اتار امر کا صیغہ ہے اور تہنہ باندھنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے کندھے بھی نماز میں ننگے نہیں ہونے چاہئیں۔

(۱۶۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي ذِرْعٍ وَخِمَارٍ بَغِيرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «إِذَا كَانَ الذَّرْعُ سَابِغًا يُغْطِي ظَهْرَ قَدَمَيْهَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ،

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی عورت تہنہ کے بغیر محض کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”کرتا اگر اتنا لمبا ہو کہ قدم کی پشت تک پہنچ جاتا ہے تو جائز ہے۔“ (اسے ابو داؤد،

ہونے پر اس نماز کا اعادہ ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ اس حدیث کو وہ ضعیف کہتے ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک اعادہ کی ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ عنز بن وائل میں سے تھے۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے ان کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوہ بدر اور دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کی سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۳۲ھ، ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

(۱۶۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ ابُو هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم "مَشْرِقٌ أَوْ مَغْرِبٌ كَمَا بَيْنَ قَبْلَةٍ إِلَى مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ هِيَ" (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)۔ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قَبْلَةً﴾ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کیلئے ہے۔ اس لئے کہ مدینہ مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینہ والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے لہذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلہ سے دور دراز فاصلہ پر ہو تو اس کیلئے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کیلئے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کیلئے اپنا چہرہ اور رخ ادھر کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کیلئے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کیلئے ہے۔

(۱۶۶) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ حَضْرَتُ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَى رَاحِلَتِهِ اونٹنی جس طرف بھی رخ کرتی آپ نماز پڑھتے حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ رَجَعْتُ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اتنا اضافہ بھی نقل البُخَارِيُّ: يُؤْمِيءُ بِرَأْسِهِ، وَلَمْ يَكُنْ کیا ہے کہ آپ اپنے سر مبارک سے اشارہ کے ساتھ (نماز) يَصْنَعُهُ فِي الْمَكْتُوبَةِ. (ادا) فرما رہے تھے۔ فرض نماز میں ایسا نہ کرتے تھے

وَلَأَبْنِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ: اور ابو داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ آپ سفر کرتے اور نماز نفل پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی

اَسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ الْقِبْلَةَ، فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلَّى اُونْتَنِي كَارِخَ قَبْلِهِ كِي طَرَفِ مَوْزِ دِيْتِ، اِسْ كِي بَعْدِ پُھَرِ حَيْثُ كَانَ وَجْهُ رِكَابِهِ. وَاِسْنَادُهُ سَوَارِي كَارِخِ جِسْ جَانِبِ بھِي ھُو جَاتَا، نَمَازِ پڑھتے رھتے۔ حَسَنٌ۔ (اس ھَدِیث كِي سَنَدِ حَسَن ھے)

لَعُو تَشْرِيح: ﴿يَوْمِي بِرَاسِهِ﴾ اِپْنِي سَرِ سِي رُكُوعِ وَتَجُودِ كِيلِي اِشَارَہ كَرْتِي اُور سَجْدَہ كِيلِي رُكُوعِ كِي بِہ نِسْبَتِ ذَرَا زِيَادَہ جُھكْتِي ﴿الْمَكْتُوبَةِ﴾ مَكْتُوبِ لَكھِي ھُوئی لَعْنِي فَرَضِ نَمَازِ ﴿الرَّكَابِ﴾ ”رَا“ كِي نِچِي كِسْرَہ اُور كَافِ مَخْفَفَہ۔ سَوَارِي، اُونْتِنِي يَا پُھَرِ ھَرُوہ چيزِ جِسْ سِي سَوَارِي كَا كَامِ لِيَا جَايَ۔ يِيَاں مَرَادِ سَوَارِي اُور اُونْتِنِي يِي ھے۔

حَاصِلِ كَلَام: ھَدِیثِ ھَذَا سِي مَعْلُوم ھُوَا كِي سَفَرِ كِي ھَالَتِ مِيں نَفْلِي نَمَازِ سَوَارِي پَر اُدا كِي جَا سَكْتِي ھے۔ اِيكِ دُفْعَہ سَوَارِي كَارِخِ يَا اِپْنَا رِخِ قَبْلَہ رُكُوعِ كَر لِي پُھَرَا اُگر سَوَارِي كَارِخِ كِي دُوسَرِي جَانِبِ ھُو جَايَ تَبِ بھِي نَمَازِ دَرِست ھے۔ اِسی طَرَحِ دُورِ حَاضِرِيں رِيلِ گَاڑِي، ھُوائی جِہَازِ اُور بَحْرِي جِہَازِ پَر نَمَازِ پڑھنا جَائِز ھے۔ اِن كَا ھَكْمِ كَشْتِي كَا ھُوگا۔ كَشْتِي مِيں نَمَازِ پڑھنا ثَابِت ھے اُور تَمَامِ فُقُہَاءِ بھِي اِس كِي جَوَازِ پَر مُتَّفِقِ ھِيں۔

(۱۶۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللہُ عَنْہُ سِي مَرُوي ھے كِي نَبِي رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ، اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَرِيمِ ﷺ نِي فَرَمَايَا ”قَبْرِ سِتَانِ اُور حَمَامِ كِي مَاسُوا قَال: ”الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا سَارِي زَمِينِ مَسْجِدِ ھے (جِہَاں چَا ھے نَمَازِ پڑھ لے)“ الْمَقْبَرَةُ وَالْحَمَامُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ (تَرْمِذِي) عِلَّةٌ.

لَعُو تَشْرِيح: ﴿وَلَهُ عِلَّةٌ﴾ وَہِ عَلْتِ يِي ھے كِي ھَمَادِنِي اِسِي مَوْصُولِ رَوَايَتِ كِيَا ھے جِكِي ثُورِي رَضِيَ اللہُ عَنْہُ نِي اِسِي مَرسلِ رَوَايَتِ كِيَا ھے اُور اَمَامِ ثُورِي كِي رَوَايَتِ صَحِيح ھے۔ اَمَامِ دَارِ قُطَيْبِي اُور بِيهَقِي نِي كَمَا ھے كِي يِي ھَدِیثِ مَرسلِ سَنَدِ سِي ھِي مَحْفُوظ ھے۔ بَعْضِ حَضْرَاتِ نِي اِس كَا مَوْصُولِ ھُونَا صَحِيحِ قَرَارِ دِيَا ھے اُور اِس كِي تَائِيْدِ دِگَرِ اَحَادِيثِ سِي بھِي ھُوتِي ھے۔

حَاصِلِ كَلَام: اِس ھَدِیثِ سِي مَعْلُوم ھُوَا كِي قَبْرِ سِتَانِ اُور حَمَامِ مِيں نَمَازِ پڑھنی دَرِستِ نِہِيں۔ حَمَامِ مِيں اِس لِي كِي وَہِ جِگَہِ نَپَاكِ ھے اُور قَبْرِ سِتَانِ مِيں مِمَانَعَتِ كَا سَببِ سِدِّ ذَرِائِعِ كِي طُورِ پَر شَرَكِ سِي نِچْنِي كِيلِي ھے۔

(۱۶۸) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللہُ عَنْہُ حَضْرَتِ ابْنِ عَمَرِ رَضِيَ اللہُ عَنْہُ رَوَايَتِ كَرْتِي ھِيں كِي رَسُولِ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَال: نَهَى رَسُولُ اللہِ ﷺ نِي سَاتِ مَقَامَاتِ مِيں نَمَازِ پڑھنِي سِي مَنعِ ﷺ اَنَّ يُصَلِّيَ فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: فَرَمَايَا ھے۔ كُوڑَا كَرَكُثِ (ڈالنے) كِي جِگَہِ، زِنِجِ خانَہِ، الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، قَبْرِ سِتَانِ، شَارِعِ عَامِ، حَمَامِ، اُونْتِ بَانْدِھنِي كِي جِگَہِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيقِ، وَالْحَمَامِ، (بَاڑَا) اُور بَيْتِ اللہِ كِي چھتِ پَر۔ (تَرْمِذِي نِي اِس

اور قبروں پر بیٹھنے کے بھی دو مفہوم ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے جس طرح تکیہ پر نیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا نیز قبروں پر قضاء حاجت کیلئے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ﴾ ابومرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کاف پر فتح اور نون پر تشدید۔ کناز بن حصین بن ربیع الغنوی۔ غنوی عین اور نون دونوں پر فتح۔ قبیلہ غطفان کے ایک شخص غنی بن یصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۲ھ میں ۶۶ برس کی عمر پاکر وفات پائی۔ مرثد میم پر فتح، ”راء“ ساکن ”مما“ پر فتح ”دال“ ساکن۔

(۱۷۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذًى أَوْ قَدْرًا فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا».

آخرجہ أبو داؤد. وصححه ابن خزيمة.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم میں سے جب کوئی مسجد میں آئے تو (مسجد میں داخل ہونے سے پہلے) اسے چاہئے کہ (اپنی جوتی) دیکھ لے۔ اگر اپنی جوتی میں گندگی یا ناپاک چیز لگی ہوئی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے صاف کرے اور اس میں نماز پڑھ لے۔“

(ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے

صحیح قرار دیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿اذی﴾ طبايع جس سے اذیت محسوس کریں۔ ﴿قذر﴾ طبايع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے ﴿اذی او قذر﴾ بھول کر، راوی نے اپنے شک کا ظہار کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک و صاف ہوں۔ نیز یہ کہ جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حدیث کے بظاہر ہر لفظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اس ارشاد نبویؐ کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپؐ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے، دوران نماز ہی جبریلؑ امینؑ نے آپؐ کو مطلع فرمایا کہ آپؐ کے جوتے نجاست آلودہ ہیں۔ آپؐ نے نماز ہی میں جوتے اتار دیئے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے امثال فعل نبویؐ میں اپنے جوتے بھی اتار دیئے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے صحابہؓ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی، انہوں نے جواب میں عرض کیا ہم نے آپؐ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں۔ پھر آپؐ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ اس حدیث

یہ سے معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز کسی طرح علم ہو جائے تو وہ نمازی اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کر لے۔ نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(۱۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَيْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا وَطِئَ أَحَدُكُمْ الْأَذَى بِخُفَيْهِ فَطَهَرُوهُمَا التُّرَابَ». أَخْرَجَهُ أَبُو يَاقُوتَ وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ. رَوَيْتُ كَمَا هُوَ فِي رِوَايَةِ ابْنِ حَبَانَ فِي مَوْضِعٍ (روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وطئ احدکم الاذی﴾ نجاست کو اپنے پاؤں سے پامال کرے اور اس پر سے گزرے اور چلے وطئی باب سمع یسمع سے ہے۔ ﴿بخفیه﴾ خف کا تشبیہ ہے۔ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ اس میں ”باء“ حرف جر ہے۔ یہ اور پہلے گزری ہوئی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جوتے، موزے اور ایسی دوسری چیزیں مٹی سے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں، خواہ نجاست خشک ہو یا تر۔ حاصل کلام: جوتوں اور موزوں پر اگر کسی قسم کی نجاست خواہ وہ خشک ہو یا تر، مٹی ہو یا غیر مٹی، خفیف ہو یا غلیظ، لگ جائے تو وہ پاک مٹی پر اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ دھونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے البتہ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کو صحیح مانا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے، امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی رائے دی ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر صرف زمین پر جو تار یا موزہ اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتا ہے، پانی سے دھو کر پاک و صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۷۲) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ هَذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ (اللہ) تَعَالَى (اللہ اکبر) اور تلاوت قرآن ہونی چاہئے۔» إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ (مسلم) الْقُرْآنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز ایک نمازی نے چھینک ماری اس نے (الحمد لله) کہا اس کے جواب میں نماز ہی میں ہوتے ہوئے معاویہ رحمہ اللہ نے (یرحمک اللہ) کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ﴾ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی اور بنی سلیم میں رہنے لگے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔

(۱۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہے کہ
 اِنْ كُنَّا لَنَتَكَلَّمُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ رَسَالَتِ مَا بَلَغَ فِيهِ مِنْ دَوْرَانِ نَمَازٍ هُمْ اِيك
 رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: يُكَلِّمُ اَحَدُنَا دُوْرًا سِی سے بات چیت کر لیا کرتے اور اپنی
 صَاحِبَهُ بِحَاجَتِهِ، حَتّٰی نَزَلَتْ ضَرْوَتْ وَ حَاجَتِ اِيك دُوْرًا سے بیان کر دیتے
 ﴿حَافِظُوْا عَلٰی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ تَحْفَظُوْا عَلٰی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ﴾ "حافظو علی الصلوات والصلوة
 الوُسطٰی وَ قُومُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ" فَأَمْرُنَا - الوُسطٰی وَ قُومُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ" آیت نازل
 بِالسُّكُوْتِ، وَنَهَيْنَا عَنْ الْكَلَامِ. ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں
 كُفْتُوْا اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ، وَالْفَلْظُ لِمُسْلِمٍ).

مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿وان کنا﴾ ان۔ یہ نون ثقیلہ ہے جو اس جگہ نون مخففہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور
 اس کا اسم محذوف ہے یعنی انا یا انہ اور کنا اس کی خبر ہے۔ ﴿والصلاة الوسطی﴾ "واؤ" اس جگہ
 تخصیص کیلئے ہے یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطیٰ پر محافظت کرو اور صحیح احادیث کی روشنی میں اس سے نماز
 عصر مراد ہے۔ ﴿قانتین﴾ ڈرتے، سہمے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے معنی متعدد ہیں اور صحابہ
 کرامؓ نے سکوت کا معنی یہی لیا ہے۔ یہ یا تو انہوں نے قرآن کی بنا پر اخذ کیا ہے یا نبی ﷺ کی تفسیر کی
 روشنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔
 آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راوی حدیث: ﴿زید بن ارقم رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ابو عمرو ان کی کنیت ہے۔
 غزوہ خندق میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکہ
 صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحابؓ میں شامل تھے۔
 کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ۶۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۷۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «النَّسِيحُ لِلرِّجَالِ وَالنَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «فِي» اور عورتوں کیلئے تالی بجانا ہے۔ (بخاری و مسلم نے

الصَّلَاةُ. اسے روایت کیا ہے اور مسلم نے ”فی الصَّلَاةُ“ یعنی نماز میں کا اضافہ کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ﴾ جب نمازی امام کو درپیش ناگمانی صورتحال سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے، بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب پر) مارے۔ حاصل کلام: جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے مرد مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سبحان اللہ وغیرہ کچھ نہیں کہے گی۔ عیسیٰ بن ایوب نے تالی پٹینے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کے باطن یعنی الٹی جانب پر مارے۔ عورت کو تالی بجا کر مطلع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی آواز غیر مرد نہ سنیں گویا عورت کی آواز بھی پردہ ہے۔ اس پر دور حاضر کی آزاد منش خواتین کو صدمہ بار غور کرنا چاہئے۔ نیز اس میں اس کی بھی تردید ہے کہ بعض نادان لوگ سبحان اللہ کی بجائے اللہ اکبر کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

(۱۷۵) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الشَّخِيرِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ، مِنَ الْبُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت مطرف اپنے باپ عبد اللہ بن شخیر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اس وقت آپ کے سینہ مبارک سے گریہ و زاری کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے۔ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازیز﴾ حمزہ پر فتح اور زا پر کسرہ۔ جوش مارتے وقت ہنڈیا سے جو آواز آتی ہے۔ ﴿المرجل﴾ میم کے نیچے کسرہ ”راء“ ساکن اور نیم پر فتح۔ ہنڈیا کے معنی میں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز خوف الہی سے رونا نماز کیلئے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿مطرف﴾ میم پر ضمہ اور را پر تشدید اور کسرہ۔ بن عبد اللہ بن شخیر۔ شخیر پر کسرہ اور ”خاء“ پر تشدید حرشی عامری بصری مشہور ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں، عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عن ابیہ﴾ اس سے مراد ہے عبد اللہ بن شخیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ شرف صحابیت

سے سرفراز ہیں۔ بنی عامر کا جو وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۷۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي تَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ لِي مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَدْخَلَانِ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحَّحَ لِي. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے میرے دو اوقات تھے۔ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ نماز ادا فرما رہے ہوتے تو مجھے مطلع کرنے کیلئے واہن مآجہ (نسائی، ابن ماجہ) کھنکار دیتے۔

لغوی تشریح: ﴿مدخلان﴾ ”میم“ اور ”حاء“ دونوں پر فتح اور درمیان میں واقع دال ساکن ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ ﴿تنحح﴾ حلق میں آواز کو گردش دینا۔ کھنکارنا (اِخ) اِخ کرنا

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کیلئے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبِلَالٍ: مِمَّنْ لَكَ مَدْخَلَانِ؟ قَالَ: مِنْ بِلَالٍ بْنِ رُبَيْعٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ لِي مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَدْخَلَانِ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحَّحَ لِي. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ.

حضرت (عبداللہ) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھتے وقت جب لوگ نبی ﷺ کو سلام کرتے تو آپ ان کو کیسے جواب دیتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس طرح کرتے اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یرد علیہم﴾ علیہم میں ہم ضمیر سے اہل قباء مراد ہیں ﴿یقول ھکذا﴾ عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ ﴿ویسط کفہ﴾ دراز کیا پھیلا یا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ جب بعد میں نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہو گیا۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تو اس موقع کی بات ہے جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارہ سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت و حاجت رہ جاتی ہے۔ گفتگو کی ممانعت اور اشارہ سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ

جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارہ سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلا ریب و تردد نماز کی حالت میں اشارہ سے سلام کا جواب جائز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نمازی کو سلام کہنا درست اور جائز ہے۔ البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارہ سے دینا جائز ہے۔ اس اشارہ کی نوعیت کیا تھی تو اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ مسند احمد میں حضرت مہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ جعفر بن عون نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپؐ نے اپنا ہاتھ لمبا کیا یعنی ہاتھ اوپر اٹھایا کہ ہاتھ کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے تھا اور یہی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قصہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا تھا۔ ان احادیث سے مترشح ہوا کہ سر سے اشارہ کرے یا ہاتھ پھیلا کر یا انگشت سے اشارہ کرے۔ تینوں صورتوں میں جواب دینا جائز ہے۔

(۱۷۸) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةً بِنْتُ زَيْنَبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا كُودٌ فِي يَدَيْهِ، وَهُوَ يَنْتَبِ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَيُؤْمَرُ: «وَهُوَ يَوْمُ النَّاسِ فِي الْمَسْجِدِ».

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو گود میں لیے رہتے، جب سجدہ میں جاتے تو اسے گود سے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو اسے (دوبارہ) گود میں اٹھا لیتے۔ (بخاری و مسلم) مسلم میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ لوگوں (الناس فی المسجد)۔

کو نماز پڑھاتے ہوئے یہ عمل کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿حامل﴾ مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ ﴿امامہ﴾ حامل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿وهو يوم الناس﴾ ام يوم نصرينصر، لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ نماز فرضی نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل ضرورت کے وقت نمازی بچے کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور یہ ”عمل کثیر“ ایسا نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھا لیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اٹھا لینا جائز ہے۔ اتنا عمل، عمل کثیر نہیں۔

راوی حدیث: ﴿امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا﴾ امامہ حضور ﷺ کی لخت جگر زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربح تھا۔ فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے ہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَفْتُلُوا الْأَسْوَدِينَ فِي الصَّلَاةِ: جَانُورُونَ سَانِپٌ أَوْ بَجْهَوٌ كَوْمَارِ دِيَا كُرُو.» (اس حدیث کو الْحَبَّةُ وَالْعَقْرَبُ. أَخْرَجَهُ الْأَزْبَعَةُ، چاروں ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا وَصَحَّه ابْنُ جَبَّانَ۔ ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الحبۃ﴾ سانپ، ﴿العقرب﴾ بچھو۔ دونوں اسودین کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ اسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں۔ خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لانا ان کی رنگت سیاہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ، بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران سانپ، بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔

نمازی کے سترے کا بیان

۴ - بَابُ سِتْرَةِ الْمُصَلِّي

(۱۸۰) عَنْ أَبِي جُهَيْنِمَ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الْإِنْمِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْرًا لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ.» مَثَّقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَحَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي الْبَزَّازِ مِنْ وَجْهِ آخَرٍ: «أَرْبَعِينَ خَرِيفًا.»

حضرت ابو جھنیم بن حارث رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے اس میں چالیس سال کا ذکر ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب سترۃ المصلی﴾ سترہ۔ سین پر ضمہ اور ”تاء“ ساکن۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کرے خواہ دیوار ہو، ستون ہو، نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ، تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ ﴿المدار﴾ مرور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا ﴿خریفا﴾ سال کو کہتے ہیں نیز خریف ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا بھی نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے۔ یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے اور یہی مجاز مرسل کی شان ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ تھا۔ حارث بن مہ انصاری کے بیٹے تھے جو خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور و معروف صحابی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جہیم جہم سے تصغیر ہے اور (الصمة) صا کے نیچے کسرہ اور میم پر تشدید ہے۔

(۱۸۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سِئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُنْتَةِ يُوْحَايَا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے؟) تَوَأْبُ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «مِثْلَ مُؤَخَّرَةٍ» نے فرمایا ”اونٹ کے پالان کے پچھلے حصہ کی اونچائی الرّخل۔“ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔ کے برابر ہونا چاہئے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی غزوہ تبوک﴾ ۹ھ رجب کے مہینہ میں رومیوں کے خلاف یہ غزوہ واقع ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے ﴿مؤخرہ﴾ میم پر ضمہ واو ساکن ”خاء“ پر فتح اور نیچے کسرہ بھی ہو سکتا ہے اور حمزہ پر فتح اور ”خاء“ پر تشدید اور فتح اور کسرہ دونوں اور میم پر فتح اور واو پر سکون بھی جائز ہے اور حمزہ کے بغیر بھی ہے اور ”خاء“ کے نیچے کسرہ۔ یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جس پر سوار ٹیک لگاتا ہے ﴿الرحل﴾ کجاوے وغیرہ کا وہ حصہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگل میں سترہ کھڑا کرنا چاہئے۔ سترہ اتنا بلند اور لمبا ہونا چاہئے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(۱۸۲) وَعَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبِدٍ حضرت سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں الْجُهَنِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نماز (ادا کرتے وقت) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيْسَ تَزُ أَحَدُكُمْ تَمَّ مِنْ سَبْرَةٍ أَوْ سَبْرَةٍ هِيَ قَائِمٌ كَرْنَا حَاجَةً فِي الصَّلَاةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ»۔ أَخْرَجَهُ أَكْرَبُ تَبْرَةٍ سَبْرَةٍ۔“ (متدرک حاکم) الْحَاكِمُ۔

لغوی تشریح: ﴿ولو بسهم﴾ اگرچہ تیر ہی سہی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا باریک و پتلا۔ بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہو۔

راوی حدیث: ﴿سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ﴾ مدنی صحابی ہیں۔ ذی الروۃ میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابو ثریہ تھی (ثاء) پر ضمہ (راء) پر فتح اور ”یاء“ پر تشدید۔ پہلا غزوہ جس میں شامل ہوئے غزوہ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کیلئے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دور حکومت میں وفات

پائی۔

(۱۸۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمان مرد کی نماز کو جب کہ اس کے آگے پالان کے پچھلے حصہ کے برابر سترہ نہ ہو عورت گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ ”کالا کتا شیطان ہوتا ہے“

الرَّحْلُ - الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ الْاَسْوَدُ. الْحَدِيثُ. وَفِيهِ: «الْكَلْبُ الْمُسْلِمُ»

اور اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوُهُ دُونَ الْكَلْبِ، وَلِأَبِي، دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُونَ آخِرِهِ، وَقَيْدَ الْمَرْأَةِ بِالْحَائِضِ.

مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ابو داؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے اور عورت کے متعلق حائضہ ہونے کی قید لگائی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿يقطع صلاة المرأة﴾ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے المرأة فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ ﴿وفيه﴾ یعنی اس حدیث کا آخری حصہ۔ ﴿الكلب الاسود شیطان﴾ کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ سے اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا۔ ﴿وله﴾ میں ہ ضمیر راجع ہے۔ مسلم کی طرف یعنی مسلم میں۔ ﴿عن ابی ہریرۃ نحوہ دون الکلب﴾ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے تو پھر مصنف کا یہ کہنا کہ دون الکلب کے علاوہ باقی روایت اسی طرح ہے اور ﴿دون الکلب﴾ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کی صفت کا ذکر نہیں ہے مطلق کتے کا ذکر ہے یعنی الکلب الاسود شیطان کا ذکر نہیں ہے۔ ﴿ولابی داود... نحوہ﴾ ابو داؤد اور نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے (دون آخرہ) سوائے آخری حصہ کے یعنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں جو ﴿الاسود الکلب شیطان﴾ ہے وہ ابو داؤد، نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں نہیں۔ نحوہ اور آخرہ دونوں میں ”ضمیر“ کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت دور ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں اصلہ ذکر کی گئی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متابعت کے طور پر۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں۔ ﴿قید﴾ تنقید سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ میں کہ حائضہ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ (عون المعبود مطبوعہ ہند۔ ج ۱، ص: ۲۵۹)

حاصل کلام: سترہ کی مشروعیت کی حکمت کیا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمت الہی اس کے سامنے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ جب نمازی سترہ اپنے سامنے قائم کر لیتا ہے تو یہ سترہ حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کی حدود میں داخل ہونے والے کے بالمقابل ہو جاتا ہے، کیونکہ پس پردہ مقابل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سترہ کے آگے سے کوئی گزرتا ہے تو رحمت اس کے مزاحم نہیں ہوتی۔ تو پھر کسی قسم کا نماز میں خلل اور نقص واقع نہیں ہوتا اور جب نمازی اپنے آگے کوئی سترہ قائم نہیں کرتا تو کوئی معین حد مقابلے میں نہیں ہوتی۔ پھر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رحمت سجدہ کی جگہ تک دراز ہوتی ہے کہ اب اگر کوئی ان جگہوں میں گزرتا ہے تو رحمت اس سے مزاحمت کرتی ہے تو یہ نماز کی برکت میں نقص اور چرے کے سامنے رحمت کے نزول کے انقطاع کا سبب بن جاتی ہے۔ جو نبی آپ اس حکمت میں ذرا تامل سے کام لیں گے اور غور کریں گے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور حق واضح ہو جائے گا۔ سترہ کے مسائل۔ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پس اتنی گفتگو اور بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ نماز کے ٹوٹنے سے مراد، نماز سرے سے باطل ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ نماز کی برکت اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جس آدمی نے سترہ قائم کئے بغیر نماز پڑھی اور اس کے آگے سے اتنے فاصلہ سے کوئی گزر گیا جتنا فاصلہ ایک چٹکی کے ذریعہ پھینکے ہوئے سنگریزے کا ہوتا ہے تو گزرنے والا نماز کی برکت اور ثواب کو قطع کرنے کا موجب و باعث نہیں بن سکتا اور نہ وہ گناہ گار ہی ہو گا اس لئے کہ وہ رحمت کے نزول کے مقامات اور مواقع کے درمیان خلل انداز نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امام غیر مشروط طور پر مقتدی کیلئے سترہ کا کام دیتا ہے خواہ اس کے آگے سترہ ہو یا نہ ہو کیونکہ رحمت الہی کے متوجہ ہونے کی جگہ ان کیلئے ہے اور وہ ان مقتدیوں اور امام کے درمیان ہے اور یہ بات کہ عورت، کتا اور گدھا کا خاص کر ذکر کیوں کیا گیا؟ کیا ان کے علاوہ اور کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نماز کی برکت کو قطع نہیں کرتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کیلئے گناہ گار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آگے سے گزرنے کے گناہ والی حدیث پہلی گزر چکی ہے۔ درحقیقت بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی جگہیں گمان کی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بہ نسبت ان سے نماز کے فاسد ہونے کی وجہ سے زیادہ شدید، زیادہ گھناؤنی ہے۔ ترمذی نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپائے جانے والی چیز ہے۔ پس جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر جھانکتا اور تانکتا ہے اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر پیٹتا ہے اور جہاں تک

کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں الکلب الاسود شیطان کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس شخص نے کتاب لایا جب کہ شرع میں دی گئی اجازت کے مطابق نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں دو قیراط کی کمی واقع کر لی۔

(۱۸۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ "جَبْ تَمَّ مِیْن سَے كُوْنِیْ سِتْرَه قَائِمٌ كَرَكَ نَمَازٍ پڑھنے لگے اور كُوْنِیْ آدَمِی اس كَے سَآئِنَے (یعنی سترہ اور نمازی كَے درمیان فاصلہ) سَے أَحَدٌ أَنْ یَجْتَازَ بَیْنَ یَدَیْهِ، فَلَیْدْفَعُهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَیْطَانٌ. مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ، وَفِی رِوَايَةٍ: فَإِنَّ مَعَهُ الْقَرْنِیْنِ.

(بصورت انسان) ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور ایک

روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی

ہے۔

لعنوی تشریح: ﴿یجناز﴾ گزرتا ہے ﴿بین یدیه﴾ اس کے آگے سے، سامنے سے۔ یعنی نمازی اور قائم شدہ سترہ کے درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم یعنی دفع کرنا اور لٹنا واجب پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہیں مندوب ہے ﴿فانما هو شیطان﴾ اس کا یہ عمل شیطانی اکساہٹ کی وجہ سے ہے ﴿القرین﴾ ساتھی، مراد وہ شیطان ہے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے، تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

حاصل کلام: نمازی کے سامنے سے گزرتا جب کہ اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ظاہر ہے کہ نزدیک تو بزور اسے روکنا واجب ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ نمازی گزرنے والے کو اشارہ سے روکنے کی کوشش کرے، اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بعد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ بس اتنی لڑائی اس سے مراد ہے، دھینکا مٹتی مراد نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز اتنے عمل سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی۔

(۱۸۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ نِلْقَاءَ وَجْهِهِ شَيْئًا، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصًا، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَخُطْ خَطًّا، ثُمَّ لَا يَضُرَّهُ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهٍ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لے یا قائم کر لے اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاٹھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاٹھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) خط ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا نمازی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن کے مرتبہ کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿فلینصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا، قائم کرنا، کھڑا کرنا وغیرہ۔ ﴿لم یصب﴾ اصابہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ صواب کو بھی نہیں پہنچ سکا، نہیں پاسکا، حاصل نہیں کر سکا۔ سترہ قائم کرنے کی بجائے صرف خط کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اسے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ سترہ کیلئے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں خط کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترہ کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ حلالی صورت کا ہونا چاہئے (چاند کی شکل کا) یعنی محراب کی طرح قوس دار اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لمبا خط کھینچا جائے اور یہ بھی رائے ہے دائیں، بائیں کھینچا جائے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ ہر چیز کا ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز میسر نہ ہو تو خط بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن الصلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی بن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے۔

(۱۸۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ، وَادْرَأُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (البتہ سامنے سے) گزرنے والے کو حتی الوسع روکنے کی کوشش کرو۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے) اس کی سند میں ضعف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿لا یقطع الصلاۃ﴾ اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی ﴿ادروا﴾ دفع کرو، ہٹاؤ، دور کرو۔

اس کی سند میں ”مجالد“ نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف کہا ہے۔

نماز میں خشوع و خضوع کی ترغیب کا بیان

۵ - بَابُ الْحَثِّ عَلَى الْخُشُوعِ فِي الصَّلَاةِ

(۱۸۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِرًا. مُتَّقٍ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَمَعْنَاهُ أَنْ يَجْعَلَ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ. وَفِي الْبُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «أَنَّ ذَلِكَ فِعْلُ الْيَهُودِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اپنے دونوں کولہوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری اور مسلم۔ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں)

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ یہودیوں کی نماز کا طریقہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب الحث﴾ حث بحث حشا ترغیب دلانا، ہمت دلانا، نشاط ابھارنا ﴿الخشوع﴾ تدلل اور سکون ظاہری اور باطنی طور پر۔ یعنی تمام اعضاء انسانی آنکھ، دل، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو۔ ﴿مختصراً﴾ اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے یعنی کولہوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصہ انسان کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر سے پسلیوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

حاصل کلام: نماز چونکہ خالص اللہ کیلئے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ ایسی ہیئت، حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہئے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عاجزی و انکساری کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار اور فروتنی و مسکین صورت و ہیئت ہونی چاہئے جو اللہ کو پسند ہے۔ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے نماز میں ”اختصار“ کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ ہیئت یہودی کی ہے اس لئے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(۱۸۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ الْعِشَاءُ فَأَبْدَأُوا بِهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا کھاؤ۔“

(بخاری و مسلم)

قَبْلَ أَنْ تُصَلُّوا الْمَغْرِبَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿قدم﴾ تقدیم سے مجہول کا صیغہ ہے۔ معنی ہے حاضر کیا گیا، پیش کیا گیا ﴿العشاء﴾ عین اور شین پر فتح اور مد رات کا کھانا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اگر کھانا تیار ہو چکا ہو (اور بھوک لگی ہو) تو پہلے کھانا تناول کر لینا چاہئے، تاکہ نماز کے شروع میں نقص پیدا نہ ہو جائے کہ دھیان اور توجہ کھانے کی طرف رہے۔

(۱۸۹) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ أَدَاكَ رَهًا هُوَ تَوَسَّجِدُ (سجده گاہ) سَے سَکَرِیْوَن (کنکریوں) کُو فَلَآ یَمْسَحُ الْحَصَى، فَإِنَّ الرَّحْمَةَ أَمِنَ رَحْمَتِ تَوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَإِذَا أَوْدَعَ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ يَاقُوتِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ وَتَزِيدُ، نَسَائُیْ وَابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ۔

خداوندی نمازی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔“ (اسے اُخْمَدُ: وَاجِدَةُ أَوْذَعُ). وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ يَاقُوتِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ وَتَزِيدُ، نَسَائُیْ وَابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ۔ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مسند احمد میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر کنکریاں ہٹانا ہی ہیں تو ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو اور صحیح بخاری میں حضرت معقیب سے یہی روایت مروی ہے اس میں سبب کا بیان نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلا یمسح﴾ یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ یا سجدہ کرنے کی جگہ (سے کنکریاں نہ ہٹائے) ﴿والحصی﴾ الحصیہ چھوٹے سنگریزے، چھوٹی چھوٹی کنکریاں ﴿زاد احمد فی روايته﴾ احمد نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر کنکریوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹا لے ورنہ چھوڑ دے ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ﴿بغیر تعلیل﴾ یعنی اس میں علت بیان نہیں کی یعنی اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رحمت الہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ہمیں راہ نمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہئے اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو آغاز نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہ رہے۔ اگر سجدہ کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر رحمت خداوندی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے، اگر نمازی ایسا فعل انجام دے گا تو رحمت سے محروم رہ جائے گا اندیشہ ہے البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ راوی حدیث: ﴿معقیب بن یحییٰ﴾ میم پر ضمہ اور عین پر فتح۔ معقیب بن ابی فاطمہ (ابو فاطمہ کے بیٹے) قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے کی

وجہ سے دوسی کھلائے۔ مکہ میں قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ کی مرنیوت پر متعین تھے۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پائی۔

(۱۹۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، دُورَانَ إِدْهَارِ إِدْهَارِ دَيْكُنْ كَبَارِئِ فِي دِرَافَتِ كَبَارِئِ فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول تعالیٰ عنہا سے کہا: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، دُورَانَ إِدْهَارِ إِدْهَارِ دَيْكُنْ كَبَارِئِ فِي دِرَافَتِ كَبَارِئِ فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ترمذی کی حدیث (جسے اس نے صحیح قرار دیا ہے) میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نماز میں التفات : «إِيَّاكَ وَالْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، (ادھر ادھر نظر دوڑانے) سے بچنے کی کوشش کرو یہ فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَبِي موجب ہلاکت ہے۔ اگر شدید اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو تو نوافل میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔“

لعنوی تشریح: ﴿الْإِتِفَاتِ﴾ دائیں بائیں نظر کرنا ﴿الْإِخْتِلَاسِ﴾ کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ ﴿إِيَّاكَ﴾ کاف پر فحتمہ۔ مرد کو خطاب ہے اور ترمذی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو التفات سے بچاؤ ایسا کہ منصوب ہے تذکر یعنی ڈرانے اور خوف دلانے کیلئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور التفات سے بچنے کی کوشش کرو۔ ﴿هَلَكَةٌ﴾ ”ہاء“ اور ”لام“ اور ”کاف“ تینوں پر فحتمہ۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ یہ تو شیطان کی اطاعت و فرمان برداری ہے اور وہی اس پر برا بیگنہ کرتا ہے۔

حاصل کلام: شیطان انسان کا اذی دشمن ہے وہ کوئی موقع انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ضائع نہیں کرتا، حتیٰ کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزء سے غافل اور بے پرواہ ہو جائے اور پورے ثواب سے محروم رہ جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ شدید اور سخت ضرورت کے وقت التفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے اور گردش نہ کرنے پائے صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(۱۹۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، دُورَانَ إِدْهَارِ إِدْهَارِ دَيْكُنْ كَبَارِئِ فِي دِرَافَتِ كَبَارِئِ فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ تعالیٰ عنہ قال: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، دُورَانَ إِدْهَارِ إِدْهَارِ دَيْكُنْ كَبَارِئِ فِي دِرَافَتِ كَبَارِئِ فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ هُوَ تَوَاسِعُ آقَاوٍ وَرُودِغَارٍ سَابِقِينَ كَرِهَ أَنْ يَتَوَلَّى وَجْهَهُ فَيَأْتِيَهُ رِيحٌ فَلَا يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ (لِذَا أَيْسَىٰ حَالَتِ فِي) أَيْسَىٰ سَامَنِي كِي طَرَفِ أَوْر وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلَكِنْ عَنْ شِمَالِهِ دَائِسِي جَانِبِ نَهْ كِي بَلَكِ أَيْسِي جَانِبِ پَاؤُس نَحْتِ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رَوَايَةٍ: «أَوْ كِي نِيچِي (تھوكي)» (بخاری و مسلم) اور ايك رواتِ نَحْتِ قَدَمِهِ».

میں ہے كہ بائیں طرف يا اپنے پاؤس كے نیچے۔

لغوی تشریح: ﴿يساجی﴾ مناجاة سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت كرنے كو كہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے كہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت كے ساتھ بندے كی طرف توجہ فرماتا ہے۔ ﴿فلا یبصقن﴾ پس مت تھوكے۔ یہ ممانعت تھوك وغیرہ كو شامل ہے ﴿ولا عن یمینہ﴾ دائیں جانب تھوكنے كی ممانعت كا سبب دائیں جانب كی تعظیم و تكريم ہے اور حدیث میں اس كا سبب یہ بھی ذكر ہے كہ دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔

حاصل كلام: اس حدیث سے معلوم ہوا كہ نماز كے دوران تھوك یا ناك وغیرہ آجائے تو سامنے اور دائیں جانب تھوكنے سے اجتناب كرنا چاہئے۔ اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آجائے تو كسی رومال یا كپڑے وغیرہ پر لے كر اسے مل دینا چاہئے۔ اگر كوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوك وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤس كے نیچے پھینك دے اور یہ اسی صورت میں ممكن ہوگا جب مسجد میں قائلین وغیرہ نہ ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس جگہ كو صاف بھی كرے اور مزید برآں وہاں كوئی خوشبو چھرك دے، تاكہ اثر زائل ہو جائے اور اس كی مجبوری كے گناہ كا كفارہ بھی بن جائے۔ بہر حال نماز میں قبلہ رو تھوكنا نہیں چاہئے۔ بعض صحابہؓ و تابعینؓ نماز سے باہر بھی اس كا اہتمام كرتے تھے۔ ادب و احترام اور پاکیزگی كا یہی تقاضا ہے۔ ابو داؤد وغیرہ میں ہے كہ نبی ﷺ نے ايك امام كو نماز كے دوران قبلہ رخ تھوكنے كی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرما دیا تھا۔

(۱۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ حَضَرْتُ اِسَّ ﷺ هِي سَ مَرُوى هَے كَہ حَضَرْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا كَے پاس ايك زيبائشِي چادر (برائے پردہ) تھی جو سَتَرَتْ بِهْ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا انہوں نے اپنے حجرے كے ايك طرف لٹكا ركھی النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكَ هَذَا، تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا كہ ”زيبائشِي چادر كو ہمارے سامنے سے ہٹا دو كيونكہ اس كی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے (آكر) نماز میں صَلَاتِي»۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

خلل اندازی اور خرابی كا باعث بنتی ہیں۔“ (بخاری)

وَأَنفَقَا عَلَىٰ حَدِيثِهَا فِي قِصَّةِ بخاری اور مسلم دونوں ابو جہم كی چادر انجانیہ كے

ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کو اس کی طرف منسوب کر دیا ہے ”فی الصلاۃ“ کی زیادتی بخاری میں بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جمائی کے دوران آواز نہیں نکالنا چاہئے۔

مساجد کا بیان

۶ - باب المساجد

(۱۹۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا عَالَمَةً رَوَيْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ. وَأَنْ تُنْظَفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِسْنَاهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں جائے نماز متعین کرنے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی و تظیف۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِسْنَاهُ۔ مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب المساجد﴾ مساجد مسجد کی جمع ہے۔ مسجد میں واقع جیم پر کمرہ ہے وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہو اور جیم پر فتح بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا معنی سجدہ کرنے کی جگہ۔ ﴿فی الدور﴾ دور، دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر ”دور“ سے مراد محلہ یا قبیلہ ہے اس لئے کہ محلہ اور قبیلہ میں بہت سے گھر ہوتے ہیں یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلا معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہے ﴿وان تنظف﴾ تنظیف سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے۔ گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے ﴿وتطیب﴾ تطیب سے ماخوذ ہے اور صیغہ مجہول ہے اور اس میں خوشبو از قسم بخور وغیرہ لگائی یا جلائی جائے۔

حاصل کلام: مسجد اور نماز پڑھنے کی جگہوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہئے اور ان میں خوشبو لگانی چاہئے۔ اس حدیث میں ”دور“ سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہئے۔ انہیں خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنا چاہئے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہئے جہاں سنن و نوافل ادا کئے جاسکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(۱۹۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «قَاتِلِ اللَّهَ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ، «وَالنَّصَارَى».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ یہودیوں کو عارت و برباد کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔“ (اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نصاریٰ کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانُوا إِذَا مَاتَ

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ”جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا ہے تو یہ

فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَى عَلَى قَبْرِهِ اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔“ اس حدیث میں یہ
مَسْجِدًا. وَبِهِ: أَوَّلُكَ شِرَارُ الْخَلْقِ. الفاظ بھی ہیں کہ ”یہ بدترین مخلوق ہیں۔“

لغوی تشریح: ﴿قاتل﴾ لعن اور اہلک کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انہیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنالینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے ﴿زاد مسلم والنصارى﴾ مسلم نے یہود کے بعد لفظ نصاریٰ کا اضافہ نقل کیا ہے (یعنی اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں) ﴿شرار﴾ شر کی جمع ہے جو اسم تفضیل اشْر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور خلق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہے۔

حاصل کلام : قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتاب ہیں جنہیں آسمانی کتب دی گئیں۔ مگر ان بد بختوں نے اپنے انبیاء کرامؑ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور جس جرم بدتر کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب۔ یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آرہی ہے، ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے، ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیح سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجدوں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف خدا کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیئے جائیں مثلاً سجدہ، رکوع کیا جائے یا دو زانو ہو کر ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے یا قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں۔ میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر یا دوسری مساجد سے انہیں متبرک سمجھا جائے۔ یہ شرعاً درست نہیں۔

(۱۹۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ يَهْلًا، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، قَرَبَطُوهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِ الْمَسْجِدِ، الْحَدِيثِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کر دیا۔) بخاری و مسلم

لغوی تشریح: ﴿خیلا﴾ گھوڑ سواروں کا دستہ۔ جماعت ﴿فربطوہ﴾ اس کو باندھ دیا (مضبوطی کے ساتھ) ﴿بساریہ﴾ ستون کے ساتھ ساریہ کی جمع سواروں کی ہے۔ یہ قیدی جسے یہ دستہ گرفتار کر کے لایا، ثمامہ بن اثالؓ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے نیز ضرورتاً مسجد کو جیل قرار دینا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، تلاوت قرآن سنیں، صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں۔ امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بدست کھڑے دیکھیں اور ان سے تاثر قبول کریں۔ قیدی ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرہ کی غرض سے آ رہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسجد نبویؐ میں اسے نبی ﷺ نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا آخر کار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(۱۹۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے
أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانٍ يُنْشِدُ فِيْ كَہ حضرت عمرؓ کا گزر حضرت حسانؓ کے
الْمَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ پَاس سے ہوا، وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔
كُنْتُ أُنْشِدُ فِيْهِ، وَفِيْهِ مَنْ هُوَ خَيْرُ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا (اس
مَنْكَ. مَتَّقْ عَلَيْهِ. پر) حضرت حسانؓ نے کہا (گھورتے کیوں ہو؟)

میں تو اس وقت مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی (یعنی رسول اللہ ﷺ) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ینشد﴾ انشاد سے ماخوذ ہے ”یاء“ پر ضمہ اور ”شین“ پر کسرہ۔ اشعار پڑھنا ﴿فلحظ الیہ﴾ دیکھنا۔ ناپسندیدہ نگاہوں سے ﴿فقال﴾ سے مراد حضرت حسانؓ ہیں۔ ﴿وفیہ﴾ ”واو“ حالیہ ہے یعنی جبکہ وہ مسجد میں تھے۔ ﴿من هو خیر منك﴾ اس سے نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید کے خلاف ہوں، جن میں سے شرک کی بو آتی ہو، جو مذموم اور برے اشعار ہوں یا نمازیوں کیلئے دغل اندازی کا باعث ہوں کہ نماز میں توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسانؓ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی بھو ہوتی تھی۔ آپؐ سن کر فرماتے تھے ”روح القدس تیری مدد فرمائے۔ تمہارے اشعار کفار کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔“

راوی حدیث: ﴿حسانؓ﴾ حسان بن ثابت انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول اللہ ﷺ کے لقب سے مشہور تھے۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابتؓ سب سے بڑے شاعر تھے۔ ۵۴ھ میں حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ
سَمِعَ رَجُلًا يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ
فَلْيَقُلْ: لَا رَدَّهَا اللَّهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ
الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهَذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿یٰۤاِیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ پر فتح اور ”شین“ پر ضم۔ باب نصرینصر کے وزن پر۔ تلاش و طلب کرنا۔ ڈھونڈنا یا تلاش کرنے کیلئے اونچی آواز سے پکارنا ﴿صَالٰةٌ﴾ گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جاتا ہے ﴿لَارِدْہَا اللّٰہُ عَلَیْکَ﴾ بظاہر تو لا اس میں نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کیلئے کہ خدا کرے وہ چیز جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے۔ کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ ﴿لَمْ تَبْنَ﴾ بناء سے ماخوذ ہے۔ میغہ مجبول ہے یعنی اس غرض کیلئے ان کی تعمیر نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر گم تو نہیں ہوتے۔ تو پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ
مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَتَّاعُ فِي الْمَسْجِدِ
فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللَّهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ
السَّائِقِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ.

ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

(بخاری و مسلم)

قَرِيبٌ . مُتَقَّ عَالِيهِ .

لغوی تشریح: ﴿اصیب سعد﴾ سعد سے مراد سعد بن معاذ ہیں جو اوس کے سردار تھے۔ غزوہ خندق کے موقع پر ان کے بازو کی رگ (اکل ہفت اندام رگ) میں دشمن کا تیر لگا اور خون جاری ہو گیا۔ خون رکنے میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی کہ وہ انہیں اس وقت تک وفات نہ دے جب تک وہ بنی قریظہ کا انجام نہ دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ خون بہنا بند ہو گیا، پھر جب بنو قریظہ ان کے فیصلہ کے مطابق گڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور ان کو قتل کر دیا گیا (قابل جنگ مردوں کو) تو خون دوبارہ جاری ہو گیا، یہاں تک کہ وفات پا گئے اور ان کی وفات غزوہ خندق میں تیر لگنے کے ایک ماہ بعد ہوئی۔ اور غزوہ احزاب شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ اس معرکہ میں قریش، غطفان وغیرہ قبائل یہودی سازش سے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے اور سب نے ملکر مدینہ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کو جب ان لوگوں کی سازش کا علم ہوا تو انہوں نے مدینہ کی شمالی جانب خندق کھودی۔ محاصرے نے پچیس (۲۵) روز تک طول کھینچا۔ پھر ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گئے۔ ﴿حسب علیہ﴾ خیمہ اس کے لئے نصب کیا۔ ﴿لیعودہ﴾ عبادۃ سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے ہیں مریض کے حال احوال پوچھنے کے لئے جانے کو، ملاقات کرنے کو۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مسجد میں مریض کے قیام کے لئے خیمہ وغیرہ نصب کرنا جائز ہے۔ نیز مسجد میں سونا، بیمار یا زخمی کی بیمار پرسی اور تیمار داری کرنا اور اس کے علاج کا بندوبست کرنا بھی درست اور جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ﴾ یہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ کبار صحابہ میں شمار ہوتا ہے انہوں نے عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں شرکت کی اور اسلام قبول کیا۔ اور ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بنو عبدالاشل نے اسلام قبول کیا۔ اپنی قوم میں سردار اور شریف انسان تھے قوم ان کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتی۔ ان کی رگ اکل میں غزوہ خندق کے موقع پر ایک تیر لگا جس کی وجہ سے ذی قعدہ ۵ھ کو واقعہ بنی قریظہ کے بعد فوت ہوئے۔

(۲۰۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتُرْنِي، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الْحَبَسَةِ يَلْعُبُونَ فِي الْمَسْجِدِ، بَنِي هَوَيْتَ تَحْتِي فِي مِثْرَةٍ مِنْ حَبَشِيَّاتٍ كَالْهَيْلِ كَوْدِيهِ رَهِي تَحْتِي فِي مِثْرَةٍ مِنْ حَبَشِيَّاتٍ كَالْهَيْلِ كَوْدِيهِ. مُتَقَّ عَالِيهِ .

حدیث کا جزء ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یسنرنی﴾ آپ نے مجھے پردہ میں لیا ہوا تھا یعنی نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھ

رہی تھیں۔ ﴿الحبشۃ﴾ حبشی کی جمع ہے یعنی ملک حبش کے باشندے ﴿یلعبون﴾ گراںمیں یہ حبشہ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا کھیل نیزے اور ڈھال کے ساتھ تھا اور عید کا دن تھا۔ اس قسم کا کھیل جنگی مشق کی قسم میں سے ہے۔ اس قسم کی جنگی مشق کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خوشی کے دن جنگی کرتب کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ نیز عورت اجنبی مرد کو فی الجملہ دیکھ سکتی ہے مگر تفصیل سے نہیں یعنی اجنبی مرد کے اعضاء جسم کو بغور ملاحظہ نہیں کر سکتی۔

(۲۰۴) وَعَنْهَا أَنَّ وَلِيدَةَ سَوْدَاءَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک سیاہ کَانَ لَهَا حِجَابٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَتْ رَنگ لڑکی کا خیمہ مسجد میں تھا وہ میرے پاس باتیں تَأْتِنِي، فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. الْحَدِيثُ. کرنے کیلئے آیا کرتی تھی۔ (بخاری و مسلم) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لعوی تشریح: ﴿ولیدۃ﴾ لونڈی ﴿حباء﴾ ”خاء“ کے نیچے کسرہ ”باء“ مخفف۔ خیمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿فتحدث﴾ دراصل تحدث تھا۔ تشکلم کے معنی میں، بات کرنے، گفتگو کرنے کیلئے آتی ہے۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مسجد میں رات بسر کر سکتی ہے بشرطیکہ کسی فتنہ و فساد کا خطرہ نہ ہو اور اس کیلئے مسجد میں خیمہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث بخاری میں ہے۔

(۲۰۵) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”مسجد میں تھوکنہ گناہ ہے۔ اس کا کفارہ ﷺ: «الْبُصَاقُ فِي الْمَسْجِدِ حَظِيئَةٌ، تھوک کو دفن کرنا ہے۔“ (بخاری و مسلم) وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کیلئے تعمیر کی جاتی ہے، اسے ظاہری اور باطنی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ مسجد میں تھوکنہ آداب مسجد کے خلاف ہے شائستگی اور نظافت اور ذوق سلیم پر بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس لئے تھوکنہ گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے، تاکہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

(۲۰۶) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ. أَخْرَجَهُ الْحَمْسَةُ. تک کہ لوگ مسجدوں (کی تعمیر) میں فخر نہ کرنے إِلَّا التَّزْيِيزِي، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ. لگیں۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے بجز ترمذی کے۔

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یتساہی﴾ ایک دوسرے پر فخر کریں گے ﴿فی المساجد﴾ یعنی مسجدوں کی تعمیر کی بلندی میں۔ علوشان میں۔ اس کی زیبائش و تزئین میں اور خوبصورتی میں۔
حاصل کلام: قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدیں تعمیر کریں گے خوب نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کریں گے پھر باہمی مقابلہ کریں گے کہ ہماری مسجد فلاں کی مسجد سے خوبصورت اور بہترین بنی ہوئی ہے مگر آباد نہ ہوں گی۔ نمازیوں سے خالی ہوں گی، تعمیر کرنے والوں کی بے حسی اور عدم توجہ کا نوحہ کر رہی ہوں گی۔

(۲۰۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا أَمَرْتُ بِتَشْيِيدِ (بناؤ سنوار) کا حکم نہیں دیا گیا۔“ (اسے ابو داؤد نے الْمَسَاجِدِ). أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ. روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما امرت﴾ ”ما“ اس میں نافیہ ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ﴿بتشييد المساجد﴾ چونا گچ کرنا، آرائش کرنا، نقش نگاری کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا منع ہے۔ مسجدوں کو ذکر الہی اور خالص عبادت سے آباد کرنے کا حکم ہے۔ تزئین و آرائش سے توجہ الی اللہ میں فرق آجاتا ہے۔ مسجد کی عمارت سے مقصود تو عبادت گاہ کی علامت ہے۔ گرمی، سردی اور بارش وغیرہ سے تحفظ اور بچاؤ ہے۔ مساجد کی آرائش اور نقش و نگاری بادشاہوں کی سنت ہے۔ ولید بن عبد الملک پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نقش و نگار کرائے۔ ورنہ عہد رسالت مآب، خلافت راشدہ میں کہیں دور دور تک بھی اس کے نشانات نہیں ملتے۔ علماء حق کو مجبوراً خاموشی اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔

(۲۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي، حَتَّى الْقَدَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَفْرَغَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے۔ (جو باعث ثواب ہیں) یہاں تک کہ وہ تنکا بھی میں نے ان اعمال میں دیکھا جسے آدمی مسجد سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔“ (اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

رکوع کرو۔ پھر سیدھا کھڑے (ہو جاؤ) اور پورے اطمینان سے کھڑے رہو، پھر سجدہ کرو اور پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر دو سرا سجدہ کرو اور پورے اطمینان سے کرو۔ پس پھر باقی ساری نماز میں اسی طرح (اطمینان سے ارکان نماز ادا کرو) (۱) اسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ امام بخاری کے ہیں۔

ابن ماجہ نے مسلم کی سند سے رکوع سے کھڑے ہونے کے وقت یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ پورے اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔ احمد اور ابن حبان میں رفاعہ بن رافع بن مالک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اپنی کمر (پشت) کو سیدھا کرو کہ ہڈیاں اپنے مقام میں واپس آجائیں۔

نسائی اور ابوداؤد میں رفاعہ بن رافع سے ہے کہ جب تک وضو کامل نہ ہو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اس وقت تک نماز مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر تکبیر کے اور اللہ کی حمد و ثناء کرے اور اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے اگر تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو تو اسے پڑھ بصورت دیگر اللہ کی حمد و توصیف کر اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ۔ ابوداؤد میں ہے کہ ”پھر سورہ فاتحہ پڑھ اور مزید جو اللہ نے چاہا۔“ ابن حبان میں ہے ”پھر جو تم چاہو پڑھو۔“

لغوی تشریح: ﴿فاسبغ الوضوء﴾ اسبغ امر کا صیغہ ہے، مبالغہ کرو، پوری طرح کرو۔ ﴿تعتدل﴾ اعتدال پر آجائیں، برابر اپنی جگہ پر آجائیں۔ ﴿قائماً﴾ سیدھے کھڑے ہونا جس میں دائیں بائیں جانب جھکاؤ نہ ہو ﴿فاقم صلبك﴾ رکوع سے جب سر اٹھائے تو اپنی پشت اس طرح سیدھی کر کہ اس میں

تَعْتَدِلَ قَائِمًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَظْمَنَ سَاجِدًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى تَظْمَنَ جَالِسًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَظْمَنَ سَاجِدًا، ثُمَّ افْعَلْ ذَلِكَ فِي صَلَاتِكَ كُلِّهَا. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

وَلَا بِنِ مَاجَهُ بِإِسْنَادٍ مُسْلِمٍ: «حَتَّى تَظْمَنَ قَائِمًا» وَمِثْلُهُ فِي حَدِيثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ أَحْمَدَ وَابْنِ حَبَانَ. وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: فَاقْمِ صُلْبَكَ حَتَّى تَرْجِعَ الْعِظَامُ.

وَلِلنَّسَائِيِّ وَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ: إِنَّهَا لَنْ تَتِمَّ صَلَاةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسَبِّغَ الْوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى، ثُمَّ يُكَبِّرَ اللَّهُ تَعَالَى، وَيُحَمِّدَهُ، وَيُسَبِّحَ عَلَيْهِ. وَفِيهَا: فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ، وَإِلَّا فَاحْمَدِ اللَّهَ، وَكَبِّرْهُ، وَهَلِّلْهُ. وَلَا بِي دَاوُدَ «ثُمَّ اقْرَأْ بِأَمِّ الْقُرْآنِ، وَبِمَا شَاءَ اللَّهُ» وَلَا بِنِ حَبَانَ: «ثُمَّ بِمَا شِئْتَ».

کسی قسم کا ٹیڑھ اور جھکاؤ کی جانب میلان نہ ہو ﴿العظام﴾ ہڈیاں۔ پشت کی ہڈیاں اور اس کے سرے مراد ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی ہو سکتی ہے ﴿یشنی علیہ﴾ باب افعال سے ”یاء“ پر ضمہ ہے۔ اس کی حمد و تعریف اور تعریف بھی مبالغہ کی حد تک۔ ﴿وہللہ﴾ تحلیل سے امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ لا الہ الا اللہ کہو۔ یہ حدیث حدیث مسنی الصلاۃ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ نے نمازی کو ارکان نماز پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہر رکن نماز کو اپنی جگہ اور دو ارکان کے درمیانی وقفہ میں اطمینان و اعتدال واجب ہے۔ حدیث کے الفاظ ”ثم اقرا ما تيسر“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرأت قرآن واجب ہے ایک دوسری روایت میں ”ثم اقرا بام القرآن“ کے الفاظ بھی منقول ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ماتیسرا و بام القرآن دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں اور وہ فاتحہ ہی ہے۔ اس حدیث میں نماز کی ترتیب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں امام، مقتدی اور منفرد نماز ادا کرتے ہیں، انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو آپؐ نے بدترین چور اور ایسی نماز کو منافی کی نماز قرار دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿رفاعہ بن رافع بن مالکؓ﴾ ابو معاذ ان کی کنیت ہے، زرقی انصاری مدنی مشہور ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ان کے والد انصار میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ رفاعہ بن رافع بدر کے علاوہ باقی سب غزوات میں شریک رہے ہیں۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علیؓ کے طرفداروں میں شامل تھے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے شروع میں ۴۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۱۱) وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ أَمَكْنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَضَرَ ظَهْرَهُ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ أَسْتَوَى، حَتَّى يَعُودَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِأَظْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلَى رِجْلِهِ الْيُسْرَى، وَنَصَبَ الْيُمْنَى، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ فَلَمْ رِجْلَهُ

حضرت ابو حمید ساعدیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تکبیر (اولیٰ) کے وقت اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے دیکھا ہے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور اپنی پشت مبارک جھکا لیتے پھر جب اپنا سر رکوع سے اوپر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ہر جوڑ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا (اس کے بعد) پھر جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ (زمین) پر اس طرح رکھتے کہ نہ زیادہ سمٹے ہوتے اور نہ زمین پر بچھے ہوئے ہوتے۔ حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں۔ جب آپؐ دو رکعت پڑھ کر قعدہ کرتے

الْيُسْرَى، وَنَصَبَ الْآخَرَى، وَقَعَدَ تَوْبَايَا پَاؤں زَمِينَ پر بچھا لیتے اور دایاں پَاؤں کھڑا
رکھتے اور جب آخری قعدہ کرتے تو بایاں پَاؤں عَلٰی مَقْعَدَتِهِ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

(دائیں ران کے نیچے سے) آگے بڑھا دیتے اور دایاں

کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حذو منكبيه﴾ الحذو ”حاء“ پر فتح، ذال ساکن۔ مقابل برابر۔ دونوں ہاتھوں کو
کندھوں کے مقابل (برابر) اٹھاتے۔ ﴿المنكب﴾ ”میم“ پر فتح، نون ساکن۔ کاف کے نیچے کسرہ۔
کندھے اور بازو کے باہم ملنے کی جگہ ﴿امكن يديه من ركبتيه﴾ الركبة پنڈلی اور ران کے ملنے کی
جگہ امكان مضبوطی سے پکڑنا۔ یعنی دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا ﴿هصر
ظهره﴾ اپنی کمر جھکائی، پشت نیچے کی ﴿فقار﴾ ”فا“ پر فتح اور قاف مخفف۔ پشت کی وہ ہڈی جو اوپر سے
نیچے والے جوڑوں کو باہم ملاتی ہے ﴿غير مفترش﴾ نہ پھیلائے والے اپنے بازوؤں کو ﴿ولا
قابضهما﴾ اور نہ ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں کی طرف سیٹھرنے، سینٹنے والے ﴿قدم رجله اليسرى﴾
قدم تقدیم سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگے بڑھانا، دراز کرنا۔ یعنی دائیں ران کے نیچے سے بڑھا کر دوسری
جانب نکالنا ﴿نصب﴾ کھڑا رکھنا، قائم کرنا، دایاں پَاؤں کھڑا رکھا وقعد علی مقعدته بائیں چوڑ پر بیٹھ
گئے اسے تورک کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ کی نماز کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے کہ آپ ارکان نماز کو کس
طرح ادا فرماتے تھے۔ لہذا اہل ایمان کو اسی طرح نماز ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے۔ آپ کا
ارشاد گرامی ہے ”صلوا کما رايتمونی اصلی“ نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔
فرمان نبوی کی موجودگی میں اپنی سی کوشش کرنی چاہئے کہ نماز اسی طرح آرام، سکون و اطمینان سے ٹھہر
ٹھہر کر ادا کی جائے جس طرح آپ نے پڑھ کر عملاً تعلیم دی ہے۔ جلدی جلدی ارکان نماز ادا کر کے نماز کو
خراب نہیں کرنا چاہئے۔ تنگ وقت میں جلدی جلدی نماز پڑھنے والے کو مرغ کی ٹھونگوں سے تشبیہ دے
کر منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے۔ نمازیوں کو بہت فکر کرنی چاہئے کہ نمازیں بھی پڑھیں مگر حاصل بھی کچھ
نہ ہو۔ ایسی نمازوں کا کیا خاک فائدہ۔

راوی حدیث: ﴿ابو حمید الساعدي رَضِيَ عَنْهُ﴾ ابو حمید (تغییر کے ساتھ) ان کا نام عمرو تھا۔ اور یہ بھی
کہا گیا ہے کہ وہ منذر بن سعد بن منذر تھے۔ بعض نے مالک انصاری خزر جی مدنی بھی نام بتایا ہے۔ خزر ج
کے باپ ساعدہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ساعدی کہلائے۔ احد اور بعد کے غزوات میں شریک
ہوئے۔ ۱۱ھ میں امیر معاویہؓ کے دور امارت کے آخر میں یا یزیدؓ کے شروع دور میں فوت ہوئے۔

(۲۱۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ جب
حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ

اللہ ﷻ، اَنَّهُ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَىٰ «وَجَّهْتُ وَجْهِيَ» طرف متوجہ کیا اور میں مشرکوں سے نہیں۔ میری صَلَوةً، قَالَ: «وَجَّهْتُ وَجْهِيَ» طرف متوجہ کیا اور میں مشرکوں سے نہیں۔ میری لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ - نماز و قربانی، میرا جینا و مرنا اللہ رب العزت ہی کے إِلَى قَوْلِهِ - مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ لِنَے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم ہے أَنْتَ الْمَلِكُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی وَأَنَا عَبْدُكَ، إِلَى آخِرِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، مالک، تو ہی معبود ہے، تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں.....“ (آخر تک) (مسلم)

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ یہ رات کی نماز (تہجد) میں پڑھا کرتے تھے۔

لعنوا تشریح: ﴿اِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے سے، مراد ہے تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے افتتاح کے طور پر پڑھتے۔ ﴿وَجَّهْتُ وَجْهِيَ﴾ توجیہ سے ماخوذ ہے۔ میں نے چہرہ پھیر لیا ﴿فَطَر﴾ خلق کے معنی میں (پیدا کیا) ﴿مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ تک اس بارے میں دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں ﴿اَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ﴾ ہے۔ میں پہلا مسلمان (مطیع فرمان بندہ) ہوں۔ آیت قرآنی میں مذکور لفظ ﴿اَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ﴾ سے الفاظ کے لحاظ سے اور دوسرا ﴿اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ مصنف نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ تمام آیت اس طرح ہے ﴿اَنَا وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ اِنْ صَلَاتِي وَنَسْكَی وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اٰمَرْتُ وَاَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ (۶: ۷۹، ۱۶۲، ۱۶۳)﴾ (الی آخرہ) سے مراد اس مشہور و معروف دعا کے اختتام تک۔ پوری دعا کا ترجمہ اس طرح ہے: ”میں نے اپنا رخ اس ذات اقدس کی جانب کر لیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے، یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز، میری ہر عبادت، میرا جینا مرنا بھی اسی اللہ کیلئے ہے جو تمام جانوں کا مالک و پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں (ذات، صفات، حقوق و اختیارات میں) اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مطیع فرمان بندوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی آقا و مالک نہیں۔ تو ہی میرا آقا و پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ و غلام ہوں۔ میں نے (یقیناً) اپنی جان پر ظلم کیا اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ لہذا میرے سارے (ہی) گناہ بخش دے (حقیقت بھی یہی ہے) کہ تیرے سوا کوئی بھی دوسرا گناہ بخش نہیں سکتا۔ مجھے عہدہ اور اچھے اخلاق کی طرف راہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین اخلاق کی راہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔ مجھ سے میری بری خصلتیں ہٹا دے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ تیرے سوا برے اخلاق کو ہٹا بھی کوئی نہیں سکتا۔ بار بار تیرے حضور حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں۔ بھلائی ساری کی ساری تیرے قبضہ قدرت میں ہے اور برائی تیری جانب رجوع نہیں کر سکتی۔ میں تیرے ساتھ اور تیری

جانب ہوں۔ تو ہی بہت برکت والا اور بہت بلندی و برتری والا ہے۔ بخشش و خطا بخشی کا بخشی سے طلبگار ہوں اور توبہ کی صورت میں تیری جناب میں رجوع کرتا ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ دعائیں کی نماز (تہجد) میں پڑھتے تھے۔

مشہور محقق و محدث مولانا عبدالرحمن مبارک پوری نے ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی (ج: ۱) ص: ۲۰۳ پر اس حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم شریف کے باب صلاۃ اللیل میں دو طریق سے منقول ہے۔ ان دونوں طرق سے مروی روایت میں کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں پڑھتے تھے۔ نیز اس حدیث کو ترمذی نے ابواب الدعوات میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ تینوں میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ نماز شب میں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے (تو اس موقع پر یہ دعا پڑھتے) اور ابو داؤد نے اپنی سنن کی کتاب الصلوٰۃ میں بھی دو طریق سے روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں مانگتے تھے بلکہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آپؐ جب فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے تو اس وقت یہ دعا مانگتے اور دار قطنی کی ایک روایت میں ہے جب آپؐ فرض نماز کا آغاز فرماتے تو اس وقت وجہت وجہی الخ پڑھتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابن حبان نے بھی اسی طرح اس حدیث کی تخریج کی اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کیلئے کھڑے ہوتے اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے، انہوں نے فرض نماز کی قید لگائی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اسی طرح کہا۔ یہ قول کہ یہ دعا نقلی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور فرض نماز میں مشروع نہیں بالکل ہی باطل ہے۔ حاصل کلام: اس ضروری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دعا فرض نماز کے آغاز پر کرنا منسوخ ہے۔ تلخیص میں یہ نہیں۔ سبل السلام میں تلخیص کا حوالہ ہے مگر صحیح نہیں۔

(۲۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِلصَّلَاةِ سَكَتَ هُنَيْهَةً قَبْلَ أَنْ يَقْرَأَ، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: أَقُولُ: «اللَّهُمَّ بَاعِذْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ، كَمَا يُنْقَى الثُّوبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تھوڑا سا وقفہ فرماتے پھر قرأت شروع کرتے (ایک روز) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! وقفہ کے دوران آپؐ کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا ”اللہم باعد بینی و بین خطایای الخ پڑھتا ہوں۔ اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے مابین اتنا فاصلہ اور دوری فرما دے کہ جتنا مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے

اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالْثَّلَجِ اس طرح صاف فرما دے کہ جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی، برف، اولوں سے دھو ڈال۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ہنیہۃ﴾ ”ہاء“ پر ضمہ۔ ”نون“ پر فتح ”یاء“ ساکن۔ ہاء پر فتح۔ تھوڑا سا وقفہ ﴿نقسی﴾ ”نون“ پر فتح۔ ”قاف“ پر تشدید نیچے کسرہ۔ تنقیۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ پاک و صاف کر دے ﴿ینقی﴾ صیغہ مجہول ﴿الندس﴾ دال اور نون پر فتح، میل کچیل۔ ﴿الثلج﴾ ”ثاء“ پر فتح، لام ساکن۔ بخار جو فضا میں سردی کے درجہ انجماد تک پہنچنے کی وجہ سے مجمد ہو جاتا ہے اور سفید روئی کی طرح ہو کر زمین پر گرتا ہے (جسے برف کہتے ہیں) ﴿والبرد﴾ ”باء“ اور ”راء“ دونوں پر فتح ہے۔ بادلوں کا پانی جو سرد ہوا میں جم کر اولوں کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت سے پہلے قدرے وقفہ ہے اور اس میں یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعائے افتتاح بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھنی چاہئے۔

(۲۱۴) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اِلْحِ پڑھتے تھے اے اللہ! تو «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ»۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالذَّارِقُطِيُّ مَوْضُولًا، وَهُوَ مَوْقُوفٌ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وقفہ کے دوران میں) سبحانک اللہم وبحمدک الخ پڑھتے تھے اے اللہ! تو «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ»۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالذَّارِقُطِيُّ مَوْضُولًا، وَهُوَ مَوْقُوفٌ۔

وَنَحْوُهُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَحْمَدُ ابْنُ مَرْفُوعًا عِنْدَ الْخَمْسَةِ، وَفِيهِ: وَكَانَ يَقُولُ بَعْدَ التَّكْبِيرِ: «أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمِّهِ، وَنَفْعِهِ، وَنَفْثِهِ»۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تعوذ یعنی اعوذ باللہ السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفثه ونفسه پڑھتے تھے ”میں اللہ سمیع و علیم کی شیطان مردود سے پناہ لیتا ہوں اس کے وسوسوں سے“ اس

کے پھونکنے سے یعنی کبر و نخوت سے اور اس کے اشعار اور جادو سے۔“

لغوی تشریح: ﴿و بحمدک﴾ تیری حمد کے ساتھ تیری حمد و ستائش کرتا ہوں ﴿و تعالیٰ جدک﴾ تیری عظمت و کبریائی بلند و بالا ہے۔ ﴿موصولاً﴾ یعنی یہ حدیث متصل سند کے ساتھ مروی ہے کسی قسم کا انقطاع نہیں ہے۔ ﴿وہو﴾ یعنی دارقطنی کی یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں اور ﴿نحوہ﴾ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح ﴿وفیہ﴾ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں الرحیم مردود، ذیل، دھتکارا ہوا ﴿من ہمزہ﴾ اس کے جنون سے یعنی اس سے اللہ کی پناہ کہ وہ کسی کو مجنون بنا دے۔ اس سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے ﴿ونفسہ﴾ اس کے تکبر سے یعنی اس تکبر و نخوت سے اللہ کی پناہ جو وہ لوگوں کے دماغوں میں بھر دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر اور بڑا سمجھنے لگتے ہیں گویا ان کے دماغوں میں کبر و غرور کی ہوا بھر دیتا ہے ﴿ونفسہ﴾ یعنی شعرہ۔ اس کے اشعار سے اللہ کی پناہ۔ اس سے وہ مذموم اشعار مراد ہیں جن کو وہ لوگوں کے دماغوں میں ڈالتا ہے اور جادو بھی اس سے مراد ہے۔ ان تینوں کلمات کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہے۔

حاصل کلام: تکبیر تحریمہ کے بعد سورہ فاتحہ سے پہلے نبی ﷺ سے اللھم باعد الخ والی دعا ثابت ہے۔ بعض روایات کے مطابق انی وجہت وجہی والی دعا اور سبحانک اللھم الخ دونوں کو جمع بھی کیا جاسکتا ہے سبحانک اللھم والی حدیث اگرچہ موقوف ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی اسے بطور تعلیم بلند آواز سے پڑھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو سکھاتے تھے اس لئے یہ حکم مرفوع ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نیز سورہ فاتحہ کے شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی موافقت کرتے ہوئے اعوذ باللہ الخ کے پڑھنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اس لئے تعوذ پڑھنا ضروری ہے۔

(۲۱۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيرِ، وَالْقِرَاءَةِ بِ«الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهُ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلَكِنْ بَيِّنَ ذَلِكَ؛ وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَائِمًا، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ

جَالِسًا، وَكَانَ يَقُولُ فِي كُلِّ رَكَعَتَيْنِ رَكَعَتَيْنِ، وَكَانَ يَقْرَأُ رِجْلَهُ الْيُسْرَى، وَيَنْصِبُ الْيُمْنَى، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ، وَيَنْهَى أَنْ يَقْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعِيهِ أَفْتِرَاشَ السَّبْعِ، وَكَانَ يَحْتِمُ الصَّلَاةَ بِالتَّسْلِيمِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

تک کہ ٹھیک آرام سے بیٹھ نہ جاتے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے اور اپنے بائیں پاؤں کو زمین پر بچھا لیتے اور دائیں کو قائم رکھتے (کھڑا رکھتے) شیطان کی چوکڑی سے منع فرماتے اور درندوں کی طرح بازو آگے نکال کر بیٹھنے سے بھی منع فرماتے تھے اور نماز کو سلام کے ساتھ ختم کرتے۔ (مسلم۔ اس کی سند معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿یستفتح﴾ آغاز فرماتے، شروع کرتے، ابتدا کرتے ﴿والقراءة﴾ منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ قرأت شروع فرماتے ﴿لم یشخاص﴾ اشخاص سے ماخوذ ہے (باب افعال) اونچا نہ اٹھاتے ﴿ولم یصوبہ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے (باب تفعیل سے) یعنی بہت زیادہ نیچے نہ جھکاتے ﴿بین ذلک﴾ یعنی ان دونوں کیفیتوں (اونچ، نیچ) کے مابین رکھتے۔ ﴿فی کل رکعتین﴾ یعنی دونوں رکعتوں کے بعد ﴿التحیة﴾ یقول کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی تشہد ہے ﴿الضحیات لله﴾ اٹھ پڑھتے اور ﴿وکان یفرش رجله اليسرى﴾ اپنا بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے یعنی اس پر بیٹھ جاتے۔ یہ کیفیت دو جہدوں کے مابین اور پہلے تشہد کے موقع پر رکھتے جیسا کہ ابو حمید سعدی رحمہ اللہ سے مروی روایت میں اس کی وضاحت ہے ﴿وعقبه الشیطان﴾ عین پر ضمہ اور قاف ساکن (شیطان کی چوکڑی) اسے اقواء الکلب بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی سرین کو زمین پر رکھے، گھٹنے اور پنڈلیاں کھڑی کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ لے۔ اقواء کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ یہ ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کھڑے رکھے اور زمین پر بیٹھ جائے۔ یہ ممنوع نہیں ہے۔ آخری تشہد کے علاوہ ﴿افتراش السبع﴾ سبع سین پر فتح اور ”با“ پر ضمہ۔ درندوں کے پھیلانے کی طرح اور درندوں کا بیٹھنا اسی طرح ہے کہ اپنی سرین پنڈلیوں پر بچھا کر بیٹھے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا کر ان پر جھک جائے۔ ایک روایت میں لفظ الکلب مذکور ہے السبع کی بجائے ﴿وله علة﴾ علة اس روایت میں یہ ہے کہ ابوالجوزاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کو روایت کیا اور ابوالجوزاء کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا گیا ہے۔

(۲۱۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ، وَإِذَا رَفَعَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے اور جب رکوع کیلئے اللہ اکبر کہتے تو بھی اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے۔

(رفع الیدین کرتے) (بخاری و مسلم)

رَأْسُهُ مِنَ الرُّكُوعِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

وَفِي حَدِيثِ أَبِي حُمَيْدٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ .

اور ابو داؤد میں ابو حمید سے مروی حدیث میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے پھر اللہ اکبر (تکبیر) کہتے۔

اور مسلم میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی اسی طرح منقول ہے، جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے لیکن اس میں ”کندھوں کے مقابل“ کی جگہ اپنے کانوں کے مقابل تک اٹھاتے مذکور ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ . نَحْوُ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ، لَكِنْ قَالَ: حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوعَ أُذُنَيْهِ .

لغوی تشریح: ﴿یحاذی﴾ مقابل کے معنی یعنی بالمقابل ﴿نم یکبر﴾ افتتاح صلاۃ کے وقت پہلے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل اٹھاتے پھر اللہ اکبر کہتے۔ اس کے برعکس پہلے تکبیر پھر رفع الیدین اور تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کا ذکر بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل میں یہ وسعت ہے۔ ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور مصنف نے اسی پر انحصار کیا ہے۔ اس میں رکوع کے موقع پر اور رکوع سے اٹھتے وقت کا بھی ذکر ہے۔ ﴿نحو حدیث ابن عمر﴾ یعنی جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں تین مواقع پر رفع الیدین ثابت ہے ﴿فروع اذنیہ﴾ کانوں کے اطراف۔ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس میں رفع الیدین کندھوں تک کرنے کا ذکر ہے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق و موافقت اس طرح ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں تو کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے مقابل تک اٹھائے جائیں۔ یہ تطبیق اچھی ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ اسے بھی توسع پر محمول کیا جائے کہ کبھی کانوں کے برابر اور کبھی کندھوں کے برابر اٹھاتے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین مسنون ہے۔ بعض احادیث میں دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کی ابتدا میں بھی رفع الیدین ثابت ہے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ، ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور صحیح روایت کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بلکہ زاد المعاد اور التلخیص الحبیر وغیرہ میں مروی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم زیست رفع الیدین کرتے رہے۔ خلفائے راشدین بلکہ باقی عشرہ مبشرہ سے بھی رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ اس کے برعکس رفع الیدین نہ کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ جس کی تفصیل فتح الباری، التلخیص الحبیر اور ”جلاء القینین فی تخریج روایات البخاری فی جزء رفع الیدین“ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حضرت وائل بن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اس مسئلہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ رفع الیدین پر

نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ عمل رہا۔

چنانچہ فتویٰ ہے کہ واکل بن حجر رحمہ اللہ غزوہ تبوک کے بعد ۹ھ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے (البدایہ والنہایہ، ج ۵ ص: ۷۵۔ شرح العینی علی صحیح البخاری ج ۹ ص: ۴۳)

آئندہ سال جب دوبارہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو وہ سخت سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو کپڑوں کے نیچے سے رفع الیدین کرتے دیکھا، یہ ۱۰ھ کے آخری مہینے تھے۔ اس کے بعد ۱۱ھ میں سرورِ دو عالم ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے تک رفع الیدین کرتے رہے۔ نہ یہ عمل منسوخ ہوا نہ اس پر عمل متروک ہوا۔ اکثر صحابہ کرامؓ بلکہ کوفہ کے علاوہ باقی تمام بلاد اسلامیہ میں اس پر عمل رہا۔ فقہائے اسلام کی اکثریت نے اس کو پسند کیا ہے۔ (بخاری و مسلم کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے: سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، موطا امام مالک، مصنف عبدالرزاق، المصنف لابن ابی شیبہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مسند ابی عوانہ، سنن دارقطنی، سنن کبریٰ، للبیہقی وغیرہ۔)

(۲۱۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ حَضْرَتِ وَاكِلِ بْنِ حَجْرٍ رَوَايَتِ كَرْتِي هِي كِي مِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ نَبِيَّ كَرِيْمٍ ﷺ كِي سَاَتِه مَازَا اَدَا كِي اَبَا نَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى دَايَا هَاتِه اَبَا نَا يَمِيْنِ هَاتِه پَر رَكْه كَرِيْمِيْنِ پَر بَاَنْدِه عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرَى عَلٰى صَدْرِهِ. اَخْرَجَهُ لَيْسَ. (ابن خزيمه، ابْنُ حُزَيْمَةَ).

حاصل کلام: اس حدیث سے دو مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑا ہونا مسنون ہے اور ہاتھ کھلے چھوڑنا غیر مسنون۔ شوافع، احناف اور حنابلہ سب اس پر متفق ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ہی سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے خلاف نہیں آیا۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے سوا دوسرا کوئی قول نقل نہیں کیا بلکہ موطا امام مالک میں بھی ہاتھ باندھنے کی روایت موجود ہے تو پھر روایت پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ سے جو ہاتھ چھوڑنے کا ذکر ہے، وہ شاذ ہے، صحیح نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہاتھ باندھے کہاں جائیں سینے پر یا زیر ناف۔ بعض حضرات زیر ناف باندھتے ہیں، مگر زیر ناف ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے، صحیح نہیں۔ متذکرہ بالا حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی الصحیح میں لکھا ہے جس کی تائید مسند احمد میں حضرت حلب کی حدیث سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے تھے اور ایک روایت میں فوق السرة کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ تحت السرة کے مقابلہ میں فوق السرة والی روایت وزنی ہے اور اہلحدیث علماء کرام کے نزدیک قوی دلائل کی روشنی میں سینے پر ہاتھ

باندھنا ہی رائج ہے اور تحت السرة یعنی زیر ناف والی حدیث ضعیف ہے، قابل اعتبار نہیں۔

راوی حدیث: ﴿وائل بن حجر رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوہنیدہ یا ابوہندہ ہے۔ حجر ”ح“ پر ضمہ اور جیم ساکن۔ جلیل القدر صحابی تھے۔ حضرت موت کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب یہ نبی ﷺ کی خدمت میں اپنے وفد کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپؐ نے (ان کے اعزاز میں) اپنی چادر مبارک ان کے بیٹھنے کیلئے بچھا دی اور ان کیلئے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضرت موت کے قبائل پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خلافت معاویہؓ کے دور میں وفات پائی۔

(۲۱۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ حَضْرَتِ عِبَادَةَ بْنِ صَامِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَے ارشاد فرمایا ”جس نے (نماز میں) رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَفْرَأْ بِأَمِّ الْقُرْآنِ». مَثَقَّ عَلَيْهِ. ام القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

وَفِي رَوَايَةٍ لَابْنِ حَبَّانٍ ابْنِ حَبَّانٍ اور دارقطنی میں روایت ہے کہ ”جس وَالذَّارِقُطَنِيِّ: «لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَا نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ نماز کافی نہیں يَفْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»۔ ہوتی۔“

وَفِي أُخْرَى لِأَحْمَدَ وَأَبْنِ دَاوُدَ أَحْمَدُ، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان کی ایک دوسری وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حَبَّانٍ: «لَعَلَّكُمْ رَوَايَتِ مِیں ہے کہ ”شاید تم لوگ امام کے پیچھے تَفَرَّءُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟“ قُلْنَا نَعَمْ؛ (کچھ پڑھتے ہو، ہم نے عرض کیا جی ہاں (پڑھتے ہیں) قَالَ: «لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَفْرَأْ بِهَا»۔ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی (تو) نماز ہی نہیں۔“

لغوی تشریح: ﴿بِأَمِّ الْقُرْآنِ﴾ ام القرآن سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ یہ حدیث سورۃ فاتحہ کے (نماز میں) پڑھنے کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ ”لام“ نافیہ جس پر آتا ہے اس سے ذات کی نفی مراد ہوتی ہے اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے۔ یہ صفات کی نفی کیلئے اس وقت آتا ہے جب ذات کی نفی مشکل اور دشوار ہو اور اس حدیث میں ذات کی نفی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ نماز کا شرعاً معنی تو یہ ہے کہ وہ اقوال اور افعال کا مجموعہ ہے لہذا بعض یا کل کی نفی سے اس کی نفی ہوگی۔ اگر بالفرض ذات کی نفی میں دشواری پیش آئے تو پھر حقیقت کے قریب والی صفت پر محمول کیا جائے گا مثلاً اس کی صحت کی نفی اور اس کے کافی ہونے کی نفی۔ اس معنی کی تائید حدیث میں وارد الفاظ ﴿لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ﴾ سے ہوتی ہے اس کے معنی ہوئے کہ نہ نماز کافی ہوگی اور نہ صحیح۔ ابن حبان اور دارقطنی میں ہے کہ جب اس حدیث

سے نماز کی نفی اور اس کا صحیح نہ ہونا سورہ فاتحہ کی قراءت پر منحصر ہے تو پھر معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اس میں سب شامل ہیں خواہ امام ہو یا مقتدی یا اکیلا نماز پڑھنے والا۔ سورہ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا واجب ہے اس پر امام احمد رحمہ اللہ اور ابو داؤد رحمہ اللہ کی روایت جسے مصنف نے بیان کیا ہے کھلی اور واضح دلیل ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام ہو خواہ مقتدی یا اکیلا ہو۔ صحیح ترین مرفوع احادیث کی روشنی میں یہی مذہب حق اور بنی برصداقت ہے۔ شوافع، اہل حدیث اور اہل نطاہر اسی طرف گئے ہیں کہ ہر نمازی کو ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ہر ایک کیلئے اس کا پڑھنا واجب ہے۔ اس میں امام اور مقتدی کا کوئی فرق نہیں اور نہ ہی جبری اور سری کا۔ مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی الحمد (سورہ فاتحہ) کا پڑھنا لازمی اور لابدی ہے۔ ابو داؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا۔ جی ہاں! اس پر آپؐ نے فرمایا کہ الحمد (سورہ فاتحہ) کے سوا اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز قطعاً نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے ”ام الکلام“ اور ”التعلیق الممجد“ میں کہا ہے کہ ”کسی بھی صحیح حدیث سے فاتحہ خلف الامام کی ممانعت ثابت نہیں اور اس سلسلے میں جو نقل کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سری نمازوں میں اور جبری کے سکتات میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے۔ محدثین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔“ ان کے علاوہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کی ایک جماعت دلائل کی بناء پر فاتحہ خلف الامام کی قائل رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ اسی کے قائل تھے حتیٰ کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی سری نمازوں کے علاوہ جبری کے سکتات میں فاتحہ خلف الامام کو جائز قرار دیا ہے جس کی باحوالہ تفصیل توضیح الکلام جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سرداران انصار میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ غزوہ بدر کے ساتھ دوسرے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کی طرف قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ پہلے حمص میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں فلسطین کی طرف منتقل ہو گئے اور ”رحلہ“ میں وفات پائی اور بقول بعض ۳۴ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں بیت المقدس میں فوت ہوئے۔

(۲۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ابو بکر

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ اور عمر رضی اللہ عنہما سب نماز کا آغاز الحمد لله رب
وَعُمَرَ كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ الْعَالَمِينَ سے کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)
بِ«الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ قراءت کے
زَادَ مُسْلِمٌ: لَا يَذْكُرُونَ «بِسْمِ اللَّهِ شروع اور آخر دونوں موقعوں پر بسم اللہ
الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ» فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔
وَلَا فِي آخِرِهَا. مسند احمد، نسائی اور ابن خزیمہ کی ایک روایت میں

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيَّ وَابْنِ خُزَيْمَةَ: لَا يَجْهَرُونَ بِبِسْمِ اللَّهِ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو جہری طور
الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. (اوپنی آواز) پر نہیں پڑھتے تھے۔
نیز ابن خزیمہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ

وَفِي أُخْرَى لِابْنِ خُزَيْمَةَ: «كَانُوا بِسْمِ اللَّهِ» آہستہ پڑھتے تھے اور اسی پر مسلم کی نفی کو
يُسِرُّونَ. وَعَلَى هَذَا يُحْمَلُ النَّفْيُ محمول کیا جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے
فِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ، خِلَافًا لِمَنْ اُسے معلول کہا ہے۔
أَعْلَاهَا.

لعوی تشریح: ﴿لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللَّهِ﴾ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ فقرہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ
آپ کے صحابہ کرامؓ مطلقاً بسم اللہ الخ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ الخ
کو جہری (باواز بلند) نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿يسرون﴾ اسرار سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرامؓ بسم اللہ بغیر آواز
نکالے آہستہ آہستہ پڑھتے تھے ﴿وعلى هذا﴾ بسم اللہ کو بے آواز یعنی سرا پڑھنے کی بنیاد پر۔ ﴿يحمل
﴿میغہ مجہول۔ محمول کیا جائے گا﴾ النفی﴾ بسم اللہ کی نفی کو ﴿فی روایۃ مسلم﴾ مسلم کی وہ روایت
جو ابھی الفاظ میں بیان کی گئی ہے ﴿خلافاً لمن اعلمها﴾ یہ توجیہ اس شخص کے خلاف ہے جو یہ کہتا
ہے کہ مسلم میں بسم اللہ کی نفی کا جو اضافہ ہے یہ معلول ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ نفی کو حقیقی پر محمول کیا
جائے گا لیکن اس کے معلول ہونے کی صورت میں اس سے دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔ علت دراصل یہ
ہے کہ اوزاعی نے یہ اضافہ قنادہ کے واسطے سے مکاتبتاً نقل کیا ہے حالانکہ یہ علت درست نہیں کیونکہ
اوزاعی اس کے روایت کرنے میں تمنا نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اس کو روایت کرنے والے ہیں
جن کی روایت صحیح ہے۔ لہذا نفی کی وہ تاویل صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص:

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سورہ فاتحہ سے قرأت کا آغاز کرتے اور بسم
اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ بعض روایات میں بسم اللہ اوپنی آواز سے پڑھنے کا بھی ثبوت ہے اس لئے بسم اللہ

کو آہستہ اور اونچی آواز سے پڑھنا یعنی دونوں طرح جائز ہے تاہم اکثر اور صحیح تر روایات سے آہستہ پڑھنا ہی ثابت ہے۔ یہ موقف شارح بلوغ المرام نیز قاضی شوکانی وغیرہ اور علامہ مبارکپوری کے موقف کے خلاف ہے اور دلائل سے درست بھی نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے برعکس لکھا گیا ہے۔

(۲۲۰) وَعَنْ نُعَيْمِ الْمُجَمَّرِ قَالَ: حضرت نعیم المجمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے صَلَّيْتُ وَرَأَى أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَقَرَأَ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأَمِّ الْقُرْآنِ، حَتَّى تَعَالَى عَنْهُ، إِذَا بَلَغَ «وَلَا الضَّالِّينَ» قَالَ: آمِينَ. پر پہنچ گئے اور آمین کہی۔ راوی کا بیان ہے کہ جب وَقُولُ كُلَّمَا سَجَدَ، وَإِذَا قَامَ مِنْ السُّجُودِ: اللَّهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ يَقُولُ إِذَا اكْبَرْتُمْ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي ذَاتُ كَيْفٍ قَدَرْتُ فِي مِثْرِي جَانِبًا! لَا شُبُهَتَكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. یقیناً میں تم سے نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کی رواۃ الثَّانِي وَالْثَلَاثُ خُرُجَتَا۔ کے بہت مشابہ ہوں۔ (میری نماز رسول اللہ ﷺ کی

نماز کے بہت مشابہ ہے) (نسائی، ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث بسم اللہ الخ اور آمین بالبحر کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ جو آدمی امام سے متصل صف سے پچھلی صف میں ہوگا اسے امام کی قرأت اور دعا اسی صورت میں سنائی دے گی کہ وہ بلند آواز سے پڑھے (ورنہ اسے سنائی نہیں دے گی) پھر بسم اللہ اور آمین کے بلند آواز سے کہنے میں اختلاف رائے ہے باعتبار دلیل قابل ترجیح بات یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ اور آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ اکثر اوقات جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھی گئی ہے اور کبھی جہری طور پر بھی۔

سورۃ فاتحہ کے اختتام و اتمام پر آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے خواہ امام ہو یا مقتدی یا تھا۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک آمین کہنا واجب ہے اور اسے چھوڑنے والا گنہگار ہے۔ آمین کے معنی ہیں ”اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔“

راوی حدیث: ﴿نُعَيْمِ الْمُجَمَّرِ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ نعیم، نعیم کی تفسیر ہے۔ بحر میں میم پر ضمہ، جیم ساکن اور دوسرے میم کے نیچے کسرہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر جمعہ کو دوپہر کے بعد مسجد نبویؐ میں خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام بحر مشہور ہو گیا۔ مشہور تابعی تھے۔ ابو حاتم، ابن معین، ابن سعد اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(۲۲۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "جَب تَم سُوْرَةُ فَاتِحَةٍ پڑھو تو بسمِ اللّٰهِ: «إِذَا قَرَأْتُمُ الْفَاتِحَةَ فَاقْرَأُوا اللّٰهَ الرَّحْمٰنَ الرَّحِيْمَ سَاطِھِ ھِ پڑھا کرو، اس لَئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، فَإِنَّهَا كِه وَه ٻھى سُوْرَةُ فَاتِحَةٍ كِي اِيك آيَت ھِ ھے۔»

إِخْدَى آيَاتِهَا». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَوَّبَ (دارقطنی نے اس كا موقوف ھونا درست قرار ڊيا ھے) وَفَقَهُ.

لغوی تشریح: ﴿صوب﴾ تصویب سے ماخوذ ہے۔ حقیقت کو پہنچنے والی بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ جب بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے تو یہ جبراً پڑھنے کی دلیل ہوئی جب فاتحہ جبراً پڑھی جائے تو یہ بھی جبراً پڑھی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے مگر یہ حدیث موقوف ہے جبکہ مسلم میں صحیح حدیث اس کے معارض ہے۔ جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سورہ کو تقسیم کیا تو پہلا جزء الحمد للہ کو قرار دیا۔ بسم اللہ کو اس میں شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

(۲۲۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا فَرَعَ مِنْ قِرَاءَةِ أَمِّ الْقُرْآنِ، رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَالَ: آمِينَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ فَارُغْ ھوتے تو آمین بلند آواز سے کہتے۔ (اسے وَحْسَنَهُ، وَالْحَامِئُ وَصَحَّحَهُ. وَلَا يَبِي دَاوُدَ دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم وَالتِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ وَائِلِدِ بْنِ حَنْبَرٍ نَحْوُهُ. نے اسے صحیح قرار دیا ہے نیز ابوداؤد اور ترمذی میں وائل

بن حجر رحمہ اللہ کی روایت بھی اسی طرح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرأت کے اختتام پر آپؐ بآواز بلند آمین کہتے تھے۔ مگر آمین بالہر اور بالسر ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ بلند آواز یا آہستہ کہنے میں ہے۔ احناف آمین آہستہ کہنے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے تین ائمہ محدثین اور اہلحدیث بلند آواز سے آمین کہنے کے قائل ہیں۔

بہت سی صحیح احادیث سے آمین بالہر کی تائید و توثیق ہوتی ہے چنانچہ ترمذی، ابوداؤد اور داری میں وائل بن حجر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو دراز کیا اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے آمین بلند آواز سے کہی۔ اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے صحیح ابن حبان، دارقطنی، حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن کی قراۃ سے فارغ ہوتے تو اونچی آواز سے آمین کہتے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح، امام بیہقی نے حسن صحیح کہا ہے اور امام دارقطنی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اور امام ابن حبان اور ابن

خزیمہ نے اپنی کتاب ”الصحيح“ میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث بھی گزر چکی ہے۔
صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ وہ جب امام کے پیچھے نماز پڑھتے لوگ بھی آمین کہتے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی آمین کہتے اور اسے سنت سمجھتے تھے۔ ان کے شاگرد نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آمین نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ہمیں آمین کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور استاد ہیں، کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے آمین کہتے اور وہ لوگ بھی بلند آواز سے آمین کہتے جو انکے پیچھے تھے یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھتی۔ امام بخاری نے اسے مطلقاً روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور مسند الشافعی وغیرہ میں یہ صحیح سند سے مروی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہود مسلمانوں سے تین باتوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں سلام کے جواب پر صفوں کی درستگی اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر۔“ امام طبرانی نے الاوسط میں اسے بیان کیا ہے اور علامہ بیہقی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہود تمہارے ساتھ کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا سلام اور آمین پر حسد کرتے ہیں۔“ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر احادیث کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نماز میں جب امام سورۃ فاتحہ ختم کرے تو امام و مقتدی کو بلند آواز سے آمین کہنی چاہئے اور علمائے احناف کے مقتدر علماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

امام ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں متوسط درجہ کی آواز سے آمین کہنے کو پسند فرمایا ہے۔ مدارج النبوة اور اشعة اللمعات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہتے اور مقتدی بھی آپ کی موافقت کرتے اور جہراً آمین کہنے کی احادیث زیادہ اور بہت صحیح آئی ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تنویر العینین میں کہا ہے کہ جہراً آمین کہنے کی احادیث اکثر اور واضح ہیں اور التعلیق المجدد میں مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ آمین زور سے کہنا دلیل کی روشنی میں قوی ہے اور یہی بات انہوں نے ”سعیہ“ میں فرمائی ہے بلکہ وہاں تو صاف طور پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ”آہستہ آمین کہنے والی روایات ضعیف ہیں جو جہراً آمین کہنے والی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“ اس اظہار حقیقت کے بعد ہم مزید کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(۲۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي
أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور
جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: فقال اِنِّي عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھ

لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ سَكَتًا. لَهَذَا مَجْهَ كَوْنِي أَيْسَىٰ جِزْ سَكَا دِيسْ جُو (میری نماز شیناً، فَعَلَّمَنِي مَا يُجْزِيْنِي مِنْهُ، كَلْتِ) اس كى جگہ كاڻى ھو جائے۔ فرمایا ”فَقَالَ: «قُلْ: سُبْحَانَ اللَّهِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ» الْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ.

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوہ الا باللہ العلیٰ العظیم پڑھ لیا کرو۔“ الحدیث (اس روایت کو احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور دارقطنی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فعلمنی﴾ تعلیم سے امر کا صیغہ ہے ﴿ما یجزئنی﴾ زاء کے بعد ھمزہ ہے، معنی ہیں جو میرے لئے کافی ہو جائے ﴿منہ﴾ قرآن کے بدلہ میں ﴿الحول﴾ قدرت اور حیلہ۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو مجبوری کی صورت میں یہ کلمات پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ اس روایت سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ سورہ فاتحہ نماز میں فرض نہیں ہے تو یہ سینہ زوری ہے ورنہ کہاں مجبوری کی حالت اور کہاں غیر مجبوری۔ یہ آدمی تو معذور تھا اس لئے معذوری کے دور ہونے تک اسے متبادل راستہ بتلایا گیا ہے۔ معذور کیلئے شریعت مطہرہ نے ہر صورت رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ عارضی رعایت سے احکام میں تغیر و تبدل نہیں ہو جاتا۔ ایک معذور آدمی اگر یہ کہے کہ میں وضو نہیں کر سکتا اور کہا جائے کہ بھی پھر تم تیمم کر لو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اب وضو فرض ہی نہیں رہا ایسا کوئی بھی نہیں جو اس کا قائل ہو کہ عدم استطاعت وضو کی صورت میں تیمم کا مشورہ وضو کی فرضیت ساقط کر دے گا۔ اس لئے مجبوری کی صورت میں اگر ان کلمات کے پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے فاتحہ کی فرضیت کیسے ساقط ہو گئی؟

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو معاویہ ہے۔ ان کے والد کا نام علقمہ بن حارث اسلمی ہے۔ خود بھی شرف صحابیت سے سرفراز اور باپ بھی (باپ بیٹا دونوں صحابی) صلح حدیبیہ اور خیبر میں شریک ہوئے اور بعد والے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کوفہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ ۸۷ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں وفات پانے والے صحابہ کرام میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں۔ ان کی مینائی جاتی رہی تھی۔

(۲۲۴) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي بِنَا فَيَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي الرُّكْعَتَيْنِ أَلَاؤَ لَيِّنِينَ بِفَاتِحَةِ اور کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے۔ پہلی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھاتے تھے تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے

الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ، وَيُسْمِعُنَا الْآيَةَ رَكَعَتِ بَيْتِ لَمْبِي كَرْتِي تَحِي وَأَرْخِي دُونُو رَكَعَتُونِ أَحْيَانًا، وَيَطُولُ الرُّكْعَةُ الْأُولَى، فِي صَرْفِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ پڑھتے تَحِي۔ (بخاری و مسلم)

وَيَقْرَأُ فِي الْأُخْرَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

لغوی تشریح: ﴿بفاتحہ الكتاب﴾ یعنی فاتحہ (سورۃ فاتحہ) ہر رکعت میں پڑھتے تھے ﴿وسورتین﴾ ہر ایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھتے۔ ﴿یسمعون﴾ اسماع سے ماخوذ ہے، ہمیں سناتے تھے ﴿احیاناً﴾ حین کی جمع ہے، بعض اوقات ﴿یطول﴾ تطویل یعنی باب تفعیل z سے۔ طول دینا، لمبا کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت بالاتفاق سری (خاموشی سے) ہے۔ جبری نہیں۔ تو پھر بعض اوقات کوئی آیت سننے کی کیا حکمت اور وجہ ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نمازیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ اس وقت قرآن مجید ہی کا کوئی حصہ تلاوت فرما رہے ہیں دوسرا کوئی ذکر یا دعا نہیں پڑھ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا بھی نمازیوں کو علم ہو جائے کہ اس نماز میں فلاں سورت پڑھی جا رہی ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی رکعت میں قرأت ذرا نسبتاً لمبی اور دوسری میں چھوٹی ہونی چاہئے۔ ائمہ ثلاثہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے ساتھ امام محمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قرأت مساوی ہونی چاہئے۔ ظہر، عصر اور فجر میں تو پہلی رکعت کا لمبا ہونا نص سے ثابت ہے باقی دو کو انہی پر قیاس کر لیا ہے۔ ایسا آپؐ کیوں کرتے تھے؟ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو جائیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف الحمد کے سوا اور کچھ نہ پڑھے۔ لیکن بعض احادیث سے پچھلی رکعتوں میں قرأت کرنا بھی ثابت ہے۔ اس لئے آخری دو رکعتوں میں فاتحہ سے زائد نہ بھی قراءت پڑھی جائے تب بھی درست ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں کسی آیت کا بلند آواز سے پڑھنے سے سجدہ سہولازم نہیں آتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا فعل آپؐ سے ایک مرتبہ ہی عمل میں نہیں آیا بلکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے۔

(۲۲۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوَسَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: كُنَّا هَم ظَهْر اور عصر میں نبی ﷺ کی قرأت کا اندازہ لگایا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الظُّهْرِ كَرْتے تَحِي (کہ آپؐ دونوں رکعتوں میں کتنا قیام وَالْعَصْرِ، فَحَزَرْنَا قِيَامَهُ فِي الرُّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ مِّنَ الظُّهْرِ قَدَرُ دونوں رکعتوں میں اتنا قیام فرماتے جتنی دیر میں سورۃ

﴿اَلَمْ تَنْزِلْ﴾ السجدة وفي الم السجدة کی تلاوت کی جا سکے اور آخری دونوں الاُخْرَيْنِ قدر النصفِ مِنْ ذَلِكَ رکعتوں میں پہلی دونوں سے نصف کے برابر اور عصر وفي الاُولَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ، عَلٰی کی پہلی دونوں رکعتوں میں ظہر کی آخری دونوں قَدْرَ الْاُخْرَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، رکعتوں کے برابر اور عصر کی آخری دونوں میں عصر وَالْاُخْرَيْنِ عَلٰی النِّصْفِ مِنْ ذَلِكَ. کی پہلی دو رکعتوں سے نصف۔ (مسلم) رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لعنوی تشریح: ﴿نحذر﴾ باب نصر بنصر تخینہ لگاتے۔ قیاس کرتے۔ اندازہ لگاتے۔ ﴿قدر الم تنزیل السجدة﴾ یعنی فاتحہ کے بعد اس سورۃ کی مقدار کے برابر قرأت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظہر کی پہلی اور دوسری رکعت میں قرأت برابر ہوتی تھی۔ یہ بات پہلی مذکور حدیث کے خلاف ہے۔ اسے اوقات کے مختلف ہونے پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی برابر پڑھتے اور کبھی پہلی رکعت بڑی اور دوسری چھوٹی ہوتی تھی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ پہلی رکعت میں چونکہ دعائے افتتاح اور تعوذ زائد پڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں احادیث میں تطابق پیدا ہو جائے گا اور اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ ﴿وفي الاخرین قدر النصف﴾ یعنی نصف مقدار ﴿من ذلك﴾ یعنی پہلی دو رکعتوں کی طوالت سے کم۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر و عصر کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی مقدار قرأت کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں بھی سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری آیت پڑھنا مسنون ہے۔ جس طرح کبھی نہ پڑھنا بھی مسنون ہے، لہذا نمازی اگر آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ دوسری آیات بھی پڑھ لے تو اس کی اجازت ہے اور نہ پڑھے تب بھی گنجائش ہے۔

(۲۲۶) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ فلاں قَالَ: كَانَ فُلَانٌ يُطِيلُ الْاُولَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفْصَلِ، وَفِي الْعِشَاءِ بِوَسْطِهِ، وَفِي الصُّبْحِ بِطَوَالِهِ، فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشَبَّ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ نَماز سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی نَماز سے مشابہ نماز نہیں پڑھی۔ (نسائی نے اسے صحیح ہَذَا. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ. سند سے روایت کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿کان فلان﴾ سے مراد امیر مدینہ عمرو بن سلمہ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے عمر

بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تو ولادت ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی ہے ﴿بخفف العصر﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخفیف ظہر کے اعتبار سے عصر کی سب رکعتوں میں ہے ﴿بقصار المفصل﴾ قصار میں قاف پر کسرہ قصیرہ کی جمع ہے اور مفصل جس کے درمیان میں فاصلہ زیادہ ہو۔ یاد رہے کہ قرآن کا آخری حصہ جن چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے۔ کیونکہ اس حصہ کی سورت چھوٹی ہے اور ہر سورت کی نوعیت یہ ہے کہ جیسے گفتگو میں فاصلہ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ مفصل کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مشہور تو یہی ہے کہ اس کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے اور یہ بھی رائے ہے کہ دوسری کسی سورت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی انتہا آخر قرآن تک ہے۔ پھر مفصل کی تین اقسام ہیں۔ طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ پس طوال مفصل سورۃ حجرات سے شروع ہو کر سورۃ بروج تک اور اوساط مفصل سورۃ بروج سے شروع ہو کر سورۃ بینہ تک اور سورۃ بینہ سے لے کر قرآن پاک کے اختتام تک قصار مفصل کہلاتی ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۃ حجرات سے لے کر اختتام قرآن مجید تک مفصلات کہلاتی ہیں۔ مفصلات کی تین اقسام ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ صبح کی نماز میں طوال مفصل اور نماز عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔

راوی حدیث: ﴿سليمان بن يسار رحمہ اللہ﴾ ان کی کنیت ابویوب تھی۔ یسار ”یاء“ پر فتح ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد اور فقیہ تھے۔ بہت بڑے مرتبہ کے عالم تھے۔ بے شمار احادیث ان سے مروی ہیں۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۷۰ھ میں ۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۲۲۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ نَبِيَّ كَرِيمٍ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۃ طور پڑھتے رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ شَاهِدًا۔ (بخاری و مسلم) بِالطُّورِ. مَنَّعَ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿بالتطور﴾ یعنی سورۃ طور نماز مغرب میں پڑھتے شاہد ہے۔ حاصل کلام: عام معمول تو آنحضور ﷺ کا یہی تھا کہ مغرب میں قصار مفصل پڑھتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے مگر بعض اوقات لمبی سورت بھی پڑھتے تھے۔ جیسا کہ اس حدیث میں سورۃ طور پڑھنا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں المص، صافات، اور حم الدخان کا نماز مغرب میں پڑھنا بھی ثابت ہے اور آپ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سفر کے دوران صبح کی فرض نماز میں صرف موزتین کی تلاوت کی۔ بہر حال عام معمول وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا البتہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی جائز ہے۔

(۲۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَجْمَعُ فِي رُفْعِ النَّجْوَى رَكْعَتَيْنِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ (الم تنزيل) السَّجْدَةِ، «وَهَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ» مُتَقَدِّمًا عَلَيْهِ. وَلِلطَّبْرَانِيِّ (مسلم) اور طبرانی میں ابن مسعود سے مروی روایت مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَجْمَعُ فِي رُفْعِ النَّجْوَى رَكْعَتَيْنِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ (الم تنزيل) السَّجْدَةِ، «وَهَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ» مُتَقَدِّمًا عَلَيْهِ. وَلِلطَّبْرَانِيِّ (مسلم) اور طبرانی میں ابن مسعود سے مروی روایت میں ہے کہ ایسا آپ ہمیشہ کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿یدیم ذلک﴾ ادامہ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمع کے روز صبح کی نماز میں ان سورتوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔

حاصل کلام: ان سورتوں کا التزام کیوں کرتے تھے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت و حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم، روز قیامت بندوں کا میدان محشر میں جمع ہونا مذکور ہے اور احادیث میں مذکور ہے کہ قیامت بھی جمع کے روز قائم ہوگی غالباً اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آنجناب ﷺ جمع کے روز ان کا التزام فرماتے تھے۔ اس لئے جمع کے روز صبح کی فرض نماز میں ان دونوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ جن سورتوں کو نبی کریم ﷺ نے کسی نماز میں بالالتزام پڑھا ہو ہمارے لئے امتثال امر اور تعمیل عمل کرتے ہوئے ان سورتوں کو انہی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جاسکتی۔ مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انہی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی ہیں اور آج بحمد اللہ علمائے اہلحدیث اس کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۲۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَدَّثَنَا رَوَيْتُ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا مَرَّتْ بِهِ آيَةُ رَحْمَةٍ إِلَّا وَقَفْتُ عِنْدَهَا يَسْأَلُ، وَلَا آيَةَ عَذَابٍ إِلَّا تَعَوَّدُ مِنْهَا. أَخْرَجَهُ الْحَمْسَةُ وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيُّ. حضرت حذیفہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی جب ایسی آیت گزرتی جس میں رحمت الہی کا ذکر ہوتا تو آپ وہاں وقف فرما کر رحمت طلب فرماتے اور جب آیت عذاب گزرتی تو وہاں ذرا وقف فرما کر اس سے پناہ مانگتے۔ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وقف﴾ رک جاتے قرأت سے وقف فرما کر۔ ﴿یسال﴾ اللہ کی رحمت طلب فرماتے۔ حاصل کلام: یہ عمل غالباً آپ کا نماز تہجد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مسند احمد اور ابن ماجہ میں عبد الرحمن بن

ابی یللیٰ عن ابیہ سے روایت ہے کہ ایسا آپؐ نفل نماز میں کرتے تھے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابو داؤد اور نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تہجد کی نماز میں تھا اور اگر کوئی یہ عمل فرض نماز میں بھی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جبکہ وہ اکیلا فرض نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کسی کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ (سبل السلام)

(۲۳۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَلَا وَإِنِّي نَهَيْتُ أَنْ أَقْرَأَ سُجْدَةً فِي قُرْآنٍ يُرْهَنُ عَنْهُ نَفْسٌ أَوْ رَأْسٌ أَوْ سَاجِدَةٌ، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَمَعْظُمُوا فِيهِ الرَّبِّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنْ كَمْ تَهَارَى دُعَايُوهَا فِي الْوُجُوهِ» (مسلم)

نغوی تشریح: ﴿فقمن﴾ اس میں ”فا“ جزاء کیلئے ہے۔ فمّن میں ”قاف“ پر فتح اور میم کے نیچے کسرہ یعنی اس کی مستحق ہے۔ اس لائق ہے۔

حاصل کلام: نماز کے مختلف ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ہیئت الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے حسب حال اذکار مقرر ہیں اور سنت سے ثابت ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن رکوع و سجود میں ممنوع قرار دی ہے۔ اس کی جگہ آپؐ نے رکوع میں عظمت رب یعنی سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بعض محدثین اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک رکوع میں تعظیم رب اور سجدہ میں دعا کرنا واجب ہے البتہ جمہور علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ سجدہ قبولیت دعا کا ایک اہم ترین مقام ہے۔ اسی لئے آپؐ نے اس میں دعا کی ترغیب دی ہے۔ خود بھی سجدہ میں مختلف دعائیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دعا آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔

(۲۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَكُونُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي» (مسلم)

نغوی تشریح: ﴿وبحمدك﴾ اس میں ”واو“ عطف کیلئے ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری

حمد و توصیف میں محو ہوتا ہوں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ ”واؤ“ حالیہ ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں اس حال میں کہ میں تیری حمد و ثنائیں محو ہونے والا ہوں۔ رکوع و سجود کیلئے متعدد اذکار اور دعائیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ نمازی ان میں سے جسے چاہے منتخب کر سکتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ رکوع میں (سبحان ربی العظیم) اور سجدہ میں (سبحان ربی الاعلیٰ) کے علاوہ مذکورہ بالا دعا بھی پڑھی جاسکتی ہے بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ (اذا جاء نصر الله والفتح) نازل ہونے کے بعد آپ ہمیشہ رکوع و سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ نمازی ان مسنونہ دعاؤں میں سے وقتاً فوقتاً جسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔

(۲۳۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرُكْعُ، ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِينَ يَرْفَعُ صُلْبَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، ثُمَّ يَقُولُ وَهُوَ قَائِمٌ: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَهْوِي سَاجِدًا، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَسْجُدُ. ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ، ثُمَّ يَفْعَلُ ذَلِكَ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا، وَيُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ مِنَ الثَّنَيْنِ بَعْدَ الْجُلُوسِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب رکوع کیلئے جاتے تو اس وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر رکوع سے اٹھتے وقت سَمِعَ اللہ لِمَنْ حَمِدَهُ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور پھر جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہو جاتے تو رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہتے۔ پھر سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہہ کر سجدے کیلئے جھکتے پھر سجدے سے اٹھتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر سجدے میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر ساری نماز میں اسی طرح کرتے جاتے تھے۔ پھر جب دوسری رکعت کی (تکمیل) کے بعد تشہد پڑھ کر اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ﴾ بعض روایات میں ﴿رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ﴾ بھی مروی ہے یعنی ”لک“ سے پہلے ”واؤ“ ہے بھی اور نہیں بھی۔ دونوں طرح ثابت ہے۔ ”واؤ“ کو جب ثابت رکھیں گے اس صورت میں تو محذوف پر عطف ہوگا۔ جیسے ہم نے آپ کی اطاعت اور حمد و ستائش کی یا ”واؤ“ کو حالیہ تسلیم کیا جائے گا یا پھر اسے زائدہ قرار دیا جائے۔ ساری صورتیں ممکن ہیں۔ بعض روایات میں اللہم ربنا لک الحمد بھی آیا ہے۔ ﴿یہوی﴾ باب ضرب بضر ب سے ہوی یہوی جھکنا، مائل ہو جانا، گر جانا وغیرہ۔

حاصل کلام : نماز میں جو تکبیریں کسی جاتی ہیں ان میں سے پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ، تکبیر افتتاح یا تکبیر

اولیٰ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اب نماز میں داخلہ کے بعد وہ سارے کام اور چیزیں حرام ہو گئیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے حلال تھیں۔ باقی تکبیرات کو تکبیرات انتقال کہتے ہیں یعنی ایک رکن نماز سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کی تکبیریں۔ پہلی تکبیر (تکبیر تحریمہ) تو فرض ہے اور باقی تکبیریں عند البعض واجب ہیں مگر اکثر کے نزدیک مسنون ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں بعض امراء بنی امیہ نے ان تکبیروں کو غیر اہم اور معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر اس دور کے صحابہ کرامؓ لوگوں کو ان کے مسنون ہونے کی تعلیم و یاد دہانی کراتے تھے، تاکہ لوگ سنت نبویؐ پر عمل پیرا رہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ ہر دور میں علماء حق کا فریضہ ہے کہ وہ نادان اور جاہل لوگوں کو سنت رسول ﷺ کی اہمیت و فضیلت سے آگاہ رکھیں اور انکار سنت کے فتنہ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں۔

(۲۳۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَلِمِثْلِ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الشَّاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ - وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ - اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيٍّ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر اوپر اٹھاتے تو اللہ! ہمارے آقا و پروردگار تعریف صرف تیرے ہی لئے ہے اتنی تعریف جس سے آسمان و زمین بھر جائے اور اس کے بعد ہر وہ چیز بھر جائے جسے تو چاہے۔ اے بزرگی اور تعریف کے مالک! تو اس کا زیادہ مستحق ہے جو کچھ بندہ کہے اور سبھی تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو ہی نہ دے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی کو اس کی بزرگی اور بخت آپ کے عذاب کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مِلْءَ السَّمَوَاتِ﴾ ”ملء“ کے ہمزہ کو منصوب پڑھیں تو یہ مصدر ہوگا اور اگر ملء کے ہمزہ کو مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔ ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ ”ما شئت“ کا بیان ہے۔ یعنی جو کچھ بھی تو چاہے۔ ﴿بَعْدُ﴾ ”مبسی علی الضم اس کے بعد مضاف الیہ محذوف ہوتا ہے، مگر نیت میں موجود ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین بھر کی حمد و ثناء کے بعد۔ ﴿أَهْلَ الشَّاءِ وَالْمَجْدِ﴾ اگر اہل کے لام پر ضمہ پڑھیں تو اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر بنے گا۔

یعنی اسے بزرگی اور تعریف کے مالک! اور حرف نداء کے محذوف ماننے کی صورت میں اسے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور ”ثناء“ کے معنی زبان سے کسی کی تعریف کرنا ﴿والمجد﴾ عظمت و بزرگی۔ ﴿احق ما قال العبد﴾ احق کے قاف پر رفع اور موصولہ کی طرف مضاف ہے اور مبتداء محذوف کی خبر واقع ہو رہا ہے اور وہ ہے رینا لک الحمد کا قول۔ بندے کے اقوال کا وہ زیادہ استحقاق رکھتا ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ ﴿اللهم لا مانع﴾ خبر کا مبتداء ہو اور اس کا یہ قول کہ ”ہم سب تیرے بندے ہیں“ مبتداء اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ آیا ہو۔ لیکن پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ذالجد﴾ صاحب بزرگی۔ اس صورت میں کہ جد کی جیم پر فتح پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا۔ نصیب۔ وافر حصہ۔ استغنی۔ عظمت و غلبہ۔ ﴿منک﴾ تیرے مواخذہ اور گرفت سے یا یہ معنی کہ تیرے ہاں جو پکڑ اور مواخذہ ہے ﴿الجد﴾ دال پر رفع ہونے کی صورت میں فاعل ہے قول ﴿لا ینفع﴾ کا۔ یعنی کسی مالدار آدمی کو اس کی بزرگی اور تو نگری کوئی فائدہ نہیں دے گی اور اسے تیری پکڑ اور گرفت مواخذہ سے بچا نہیں سکتی۔ بس عمل صالح ہی وہاں نفع دے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل و حجت ہے کہ قومہ کی حالت میں یہ دعا پڑھنا مسنون و مشروع ہے۔ جن حضرات نے اس دعا کو نفل نماز کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اپنے ذہن کی بات ہے۔ مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس خیال کی تردید کیلئے کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں اس کا پڑھنا ثابت ہے۔ نیز اس دعا کے اس جملہ ”ولا ینفع ذالجد منک الجد“ سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے مالک و خالق کے پاس محض دنیوی جاہ و جلال اور عظمت و بزرگی کچھ بھی کام نہ دے گی اور نہ کسی حسب و نسب کا امتیاز کچھ فائدہ مند ثابت ہوگا وہاں تو عمل صالح کی قدر و قیمت ہوگی اور بس۔ کسی کا عالی نسب ہونا، بزرگوں کی اولاد ہونا، کسی معروف و مشہور خاندان سے متعلق ہونا عذاب الہی سے نہیں چھڑا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نوح علیہ السلام کا بیٹا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے حقیقی چچا ابوطالب عتاب الہی اور عذاب الہی کا شکار نہ ہوتے۔ آنحضرت ﷺ نے تو اپنے خاندان والوں کو بلا کر صاف طور پر کہہ دیا کہ عمل صالح کرو ورنہ اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل اور اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف فرما دیا تھا کہ ”بیٹی! میں تجھے عذاب الہی سے ہرگز نہیں بچا سکتا، گھمنڈ اور خوش فہمی میں نہ رہ جانا کہ میں نبی آخر الزماں ﷺ کی لخت جگر ہوں۔ محض میری بیٹی ہونا تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت اور پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ عمل صالح کیا کرو جو تجھے عذاب الہی سے بچا سکے“ اولوالعزم پیغمبروں اور خاص کر رسول آخر الزماں ﷺ جب اپنی اولاد سے یہ فرما دیں تو اور کون ہے جو غرور نسب میں مبتلا ہو کر بھی کامیاب و کامران ہو جائے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قومہ میں صرف سیدھا کھڑا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسنون دعاؤں میں سے کوئی دعا مثلاً یہ ہی دعا پڑھنی چاہئے۔

نظر آنے لگتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فَجَّ﴾ تفرج (باب تفعیل) سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی دوری اور دونوں پہلوؤں کے درمیان کشادگی اور فراخی پیدا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی رانوں کو اپنے بازوؤں سے اتنا الگ رکھے کہ بغلوں کا اندرون بھی نمایاں ہو جائے۔ اس حدیث کی بناء پر امام طبری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بغلیں جسم اطہر کے دوسرے اعضاء کی طرح سفید تھیں۔ سیاہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی دیگر خصوصیات و امتیازات کی طرح ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کی تصریح طبری نے کتاب الاحکام کے باب الاستقاء میں کی ہے کہ آپ کی بغلیں دوسروں کی طرح سیاہ نہ تھیں بلکہ سفید تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ابن بحینہ رحمہ اللہ﴾ ان کا پورا نام یہ تھا عبد اللہ بن مالک بن القشب (قاف پر کسرہ "شین" ساکن) الازدی یزید بحینہ تغیر ان کی والدہ کا نام ہے۔ والدہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ورنہ والد کا نام مالک ہے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ بڑے زاہد، شب زندہ دار، صائم التہار تھے۔ دنیا سے بڑے بے رغبت تھے۔ مدینہ سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع جگہ وادی ریم میں ۵۴ھ اور ۵۸ھ کے درمیان وفات پائی۔

(۲۳۶) وَعَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ حَضْرَتِ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷻ لِنَبِيِّهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدْتَ فَضَعْ أُنْفُسَكَ عَلَى الْأَرْضِ وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اٹھالے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ضع﴾ اس میں "فاء" جزاء کیلئے ہے اور ﴿ضع﴾ وضع سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی اس کے یہ ہوئے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر نکادو۔ رکھ دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سجدہ کرتے وقت ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے اور کہنیوں کو اوپر اٹھانے کا حکم ہے۔ البتہ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک روز صحابہ کرام نے سجدہ کو لمبے کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکوہ کیا تو آپ نے انہیں کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر ذرا آرام لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ مگر یہ روایت سنداً صحیح نہیں۔ بصورت دیگر یہ عذر پر تو محمول ہے۔ اکثر و بیشتر روایات میں یہی مذکور ہے کہ سجدہ میں آپ کی کہنیاں نہ زمین پر لگتیں اور نہ ہی رانوں وغیرہ سے جس کی وجہ سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ آپ کا یہ عمل امت کے ہر فرد کیلئے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ آپ کا حکم بھی یہ ہے (صلوا کما رایتُمونی اصلی) کہ "تم اسی طرح نماز پڑھو جیسا تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" کسی بھی صحیح و مرفوع روایت میں عورت کیلئے اس کے برعکس حکم ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿براء بن عازب رحمہ اللہ﴾ ابو عمارہ ان کی کنیت ہے۔ براء "باء" پر فتح ہے۔ باپ کا نام

عازب بن حارث بن عدی ہے۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ باپ بھی شرف صحابیت سے بہرہ ور اور بیٹا بھی۔ غزوہ بدر کے موقع پر کم عمری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ پہلا معرکہ جس میں انہوں نے شرکت کی وہ احد یا خندق دونوں میں کوئی ایک ہے۔ رے کو فتح کیا۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور معرکہ نمروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے تھے۔ کوفہ میں ۷۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۲۳۷) وَعَنْ وَاِثِلَ بْنِ حُجْرٍ حَضْرَتِ وَاِثِلَ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَب رُكُوعٌ مِّثْلُ رُكُوعِ النَّبِيِّ ﷺ (ہاتھوں کی) كَانَ إِذَا رَكَعَ فَرَجَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَإِذَا انْغَلَّتْ كَهْلِي رَكَعَتْ (ہاتھوں کی) انگریزوں کی) انگریزوں کی) انگریزوں کی) انگریزوں کی) (متدرک) سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ. رَوَاهُ الْحَاكِمُ.

حاکم

لعوی تشریح: ﴿ضم اصابعه﴾ اپنی انگلیاں باہم ملا لیتے۔ یعنی اس طرح اپنی انگلیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے سے ملاتے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو جاتا۔ حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ رکوع و سجود میں انگلیوں کی کیفیت کیسی ہونی چاہئے؟ معلوم ہوا کہ رکوع کی حالت میں انگلیوں کو کھلا رکھنا ہی مسنون ہے۔ نیز اس میں حالت سجدہ میں انگلیوں کا باہم ضم کرنا اس لئے ہے کہ انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے۔

(۲۳۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ رُكُوعًا مِّثْلَ رُكُوعِ النَّبِيِّ ﷺ (نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن وَصَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ. فرماتے دیکھا ہے۔) فرماتے دیکھا ہے۔) فرماتے دیکھا ہے۔) فرماتے دیکھا ہے۔) خزیمرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

لعوی تشریح: ﴿متربعا﴾ ترلع سے ماخوذ ہے۔ ترلع یہ ہے کہ دائیں پاؤں کے نچلے حصہ کو اپنی بائیں ران کے نیچے کر لینا اور بائیں قدم کا باطنی حصہ دائیں ران کے نیچے پورے اطمینان اور سکون کی حالت کے ساتھ اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھے کہ انگلیاں کھلی ہوئی ہوں جس طرح حالت رکوع میں کھلی ہوتی ہیں۔ اس طرح بیٹھنا مرض کی وجہ سے ہے اور یہ حدیث نبی ﷺ کی اس نماز کی کیفیت بیان کرتی ہے جب آپ گھوڑے سے نیچے گر گئے تھے اور پاؤں پر چوٹ آگئی تھی (پاؤں کا جوڑ کھل گیا تھا) (سبل السلام)

حاصل کلام: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب آدمی کسی وجہ سے معمول کے مطابق نماز ادا کرنے سے معذور ہو جائے اور قیام پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے چار زانو بیٹھ کر نماز ادا کرنی جائز ہے۔

(۲۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ مِثْلَ رُكُوعِ النَّبِيِّ ﷺ حَضْرَتِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا سے مروی ہے کہ نبی کریم اللہ تعالیٰ عنہما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ مِثْلَ رُكُوعِ النَّبِيِّ ﷺ کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے

ہے یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں کے علاوہ باقی تمام کو انہوں نے یہ تیغ کر دیا اور یہ واقعہ بھی مذکورہ بالا ماہ صفر کا ہے۔ نبی ﷺ کو ان دونوں المناک واقعات کی اطلاع ایک ہی شب میں ملی۔ اس سے نبی ﷺ نہایت ہی افسردہ اور غمگین ہوئے کہ پورا ایک مہینہ ان کیلئے بددعا فرماتے رہے اور پھر بددعا کرنا ترک کر دیا۔ اس قسم کی دعاء قنوت کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔ یہ دعاء قنوت بڑے بڑے المناک اور دردناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ورنہ نبی ﷺ دعاء قنوت نہیں پڑھتے تھے، الا یہ کہ مسلمانوں میں سے لوگوں کیلئے دعا فرمائیں یا کفار میں سے بد عمد، عمد شکن قسم کے لوگوں کیلئے بددعا فرمائیں۔ رہا نماز فجر میں مسند احمد اور دار قطنی کے حوالہ سے قنوت کے پڑھنے کا التزام و مواظبت کا اضافہ تو یہ قابل استدلال نہیں۔ نیز یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت آگے آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور قنوت نازلہ کسی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسے تمام نمازوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ نماز فجر میں آپؐ سے دعاء قنوت ثابت ہے۔ مہینہ بھر آپؐ عمد شکنی اور بد عمدی کی بناء پر مقتول صحابہؓ کی وجہ سے بددعا کرتے رہے۔ ظاہر ہے یہ فرض نماز ہی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد دعا فرماتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین تبلیغ ہے۔ مبلغین کی جماعت تیار رہنی چاہئے، جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جماعتی شکل میں تبلیغ کیلئے جانا چاہئے۔ نظم جماعت کی طرف بھی اس سے اشارہ ملتا ہے اور اطاعت امیر بھی اس سے ظاہر ہے۔ ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ ذاتی علم غیب نہیں رکھتے تھے اگر ان کو علم غیب ہوتا تو اپنے تیار مبلغین کو قتل کیلئے کیوں بھیجتے۔ جان بوجھ کر نعوذ باللہ تو آپؐ نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی اس وقت تک آپؐ کو اپنے بھیجے ہوئے مبلغین کی صورت حال کی کچھ خبر نہیں تھی۔ احناف اسی حدیث کی روشنی میں عند الضرورت قنوت نازلہ کے قائل ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نماز فجر میں ہمیشہ دعاء قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں۔ طریقہ دعا یہ ہے کہ امام رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

(۲۴۲) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَقْنُتُ إِلَّا إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ أَوْ عَلَى قَوْمٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

نہیں پڑھتے تھے۔ (اس کو ابن خزمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كان لا يقنط﴾ یعنی قنوت نازلہ نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿الا اذا دعا لقوم﴾ مگر جب کسی قوم کے نفع کیلئے دعا کرتے۔ مصیبت سے نجات و چھٹکارے کیلئے اور ﴿دعا على قوم﴾ یا کسی قوم پر بددعا کرتے۔

حاصل کلام: بظاہر ان احادیث میں تعارض محسوس ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں نماز فجر میں قنوت کا ہمیشہ

پڑھنا ثابت ہے اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کے نفع کیلئے دعایا کسی کی ہلاکت کیلئے بددعا کرتے تھے اور تیسری کے جو اس کے بعد آرہی ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر میں قنوت پڑھنا بدعت ہے۔ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ آپؐ اور صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدینؓ نماز فجر میں قنوت پڑھتے رہے ہیں۔ جس حدیث میں بدعت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بالالتزام، مسلسل اور بلائعہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اس التزام کو مسنون قرار دینا غیر مسنون اور بدعت ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ صبح کی نماز میں ہمیشہ بلائعہ، بلا ضرورت قنوت نہ پڑھی جائے۔ جس حدیث میں صبح کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھنے کا ذکر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قنوت کبھی منسوخ نہیں ہوئی۔ ضرورت پیش آنے پر آپؐ قنوت پڑھتے رہے اور جس حدیث میں کسی کے حق میں دعا اور کسی کیلئے بددعا کا ذکر ہے یہ تطبیق کی صورت ہی ہے کہ ضرورت لاحق ہونے کی صورت میں دعا و بددعا کرتے تھے۔ احناف اسی کے قائل ہیں۔ نیز احناف و تروں کے علاوہ کسی نماز میں ہمیشہ اور مسلسل قنوت پڑھنے کے حق میں نہیں ہیں اور جب مسلمانوں پر کوئی ناگمانی آفت، مصیبت نازل ہو جائے مثلاً دشمن نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے، کوئی وباء پھوٹ پڑی ہے، قحط سالی کا سال پیش آگیا ہے۔ ایسے حالات میں تو احناف بھی نماز پنج گانہ میں قنوت پڑھنا مسنون سمجھتے ہیں اور شوافع حضرات آدھے آخری رمضان میں قنوت وتر کے قائل ہیں باقی ایام میں وہ قائل نہیں البتہ فجر کی نماز میں بیٹگی اور دوام کے قائل ہیں اور دوسری نمازوں میں جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے یا وباء پھوٹ پڑے تو پڑھنے کے قائل ہیں۔

(۲۴۳) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ طَارِقٍ
الْأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي: يَا أَبْتَ! إِنَّكَ قَدْ
صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَبْنَى
بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ، أَفَكَانُوا
يَقْتَنُونَ فِيهِ الْعَجْرَ؟ قَالَ: أَيُّ بُنَى
مُحَمَّدٌ. رَوَاهُ الْحَنَسَةُ إِلَّا أَبَا دَاوُدَ.

غوی تشریح: ﴿ای ہسی﴾ ای حرف ندا ہے اور بنی ”با“ پر ضمہ اور ”یا“ پر فتحہ اور تشدید۔ ”ابن“ کی تفسیر ہے یائے شکلم مضاف ہے۔ معنی اے میرے بیٹے ﴿محدث﴾ احداث سے اسم مفعول ہے یعنی گھڑی ہوئی۔ تصنیف شدہ بات۔ (بدعت) جو دور رسالت میں موجود نہیں تھی۔ پس اس گفتگو کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ قوت نازلہ بسا اوقات پڑھنا ثابت ہے، اس پر دوام اور ہمیشگی ثابت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں یہ استدلال کرنا کہ نماز میں قنوت پڑھنا بدعت ہے درست نہیں۔ اس سلسلہ کی ضروری وضاحت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد التزام اور بیشکی ہے۔

مطلقاً قنوت کی نفی مراد نہیں۔

راوی حدیث: ﴿سعد رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام سعد بن طارق بن اشیم (احمد کے وزن پر) بن مسعود اشجعی کوئی ہے۔ ان کی کنیت ابو مالک تھی۔ ثقہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۴۰ھ کے آخر پر فوت ہوئے۔
﴿طارق اشجعی رضی اللہ عنہ﴾ طارق بن شیم بن مسعود اشجعی کوئی۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان سے صرف چودہ احادیث نقل کی گئی ہیں اور ان کے بیٹے سعد کے علاوہ ان سے کسی نے روایت نہیں کی۔ کوفیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے چند کلمات ایسے سکھائے ہیں جنہیں میں وتروں میں (دعائے قنوت کے طور پر) پڑھتا ہوں۔ اللھم اھدنی فیمن ھدیت الخ ”اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جنہیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے اور مجھے عافیت دے کر ان میں شامل فرما دے جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور جن کو تو نے اپنا دوست قرار دیا ہے ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت ڈال دے اور جس شر و برائی کا تو نے فیصلہ فرمادیا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ اور بچا لے۔ یقیناً فیصلہ تو ہی صادر فرماتا ہے تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا اور جس کا تو والی بناوہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا۔ آقا ہمارے پروردگار تو ہی برکت والا اور بلند و بالا ہے“ (اسے پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔) طبرانی اور بیہقی نے ولا یعز من عادت کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز نسائی نے ایک دوسرے طریق سے اس دعا کے آخر میں وصلی اللہ علی النبی کا اضافہ بھی روایت کیا ہے۔

(۲۴۴) وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي قُنُوتِ الْوُتْرِ: «اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَفِي شَرِّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لَا يَذُلُّ مَنْ وَالَّيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ». رَوَاهُ الْحَمَّصُ، وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ بَيْهَقٍ: «وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ». زَادَ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ فِي آخِرِهِ: «وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ».

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا دُعَاءً نَدْعُو بِهِ فِي الْقُنُوتِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ. وَفِي سَنَدِهِ صَعْفٌ.

اور بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں دعا سکھاتے تھے جسے ہم صبح کی نماز میں دعا قنوت کی صورت میں مانگتے تھے۔

(اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿تولنی﴾ یعنی میرے کام کو پھیر دے، اس کی اصلاح کر دے۔ ﴿فیمن تولیت﴾ یعنی ان لوگوں کے کاموں کی طرح جن کی تو نے اصلاح کی ہے ﴿وقنی﴾ میری حفاظت فرما ﴿شرما قضیت﴾ یعنی ہر اس شر سے جو اللہ کی تقدیر میں ہے۔ ﴿فانک تقضی﴾ یعنی تو مقرر کرتا ہے اور حکم فرماتا ہے جس کا بھی تو ارادہ کرتا ہے ﴿ولایقضی علیک﴾ مجھ کو کا صیغہ ہے۔ یعنی تجھ پر کسی قسم کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ﴿انہ﴾ اس کی شان یہ ہے۔۔ ﴿لایذل﴾ ”یاء“ پر فتح اور ذال پر کسرہ۔ یعنی وہ ذلیل نہیں ہوتا، رسوا نہیں ہوتا ﴿من والیت﴾ یہ ”مولاء“ سے ماخوذ ہے۔ ”معاذہ“ کی ضد ہے۔ یعنی جس کا تو والی بن جاتا ہے۔ ﴿ولایعز﴾ ”یاء“ پر فتح اور عین کے نیچے کسرہ۔ یعنی وہ صاحب عزت و شرف نہیں ہو سکتا۔ ﴿من عادیت﴾ یعنی جس کا تو دشمن ہو جائے۔ اس دعا کے ساتھ صبح کی نماز میں قنوت کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ﴿یعلمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے یعنی وہ ہمیں سکھاتے تھے۔ ”دعاء“ گزشتہ دعا یعنی اللھم اھدنی والی دعا۔ اور یہ بات کہ وہ ہمیں صبح کی نماز میں کرنے کے لئے یہ سکھاتے تھے، ضعیف ہے۔ جس طرح مصنف نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اس میں عبدالرحمن بن ہرمرزادی ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز وتر میں یہ دعا پڑھنا چاہئے۔ یہ دعا رکوع سے پہلے اور بعد دونوں طرح درست ہے لیکن مستدرک حاکم اور بیہقی میں جو یہ الفاظ ہیں کہ جب رکوع سے اٹھو تو یہ دعا پڑھو۔ یہ الفاظ شاذ اور محل نظر ہیں جیسا کہ مرعاة المفاتیح اور ارواء الغلیل میں ہے۔ اس دعا کے آخر میں جو ”صلی اللہ علی النبی“ کے الفاظ ہیں۔ بعض حضرات نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے مگر علامہ البانی نے کہا ہے کہ یہ زیادت صحیح ہے۔ (ارواء الغلیل ج ۲ ص ۱۷۷) اور یہی بات درست ہے۔ نماز وتر کی حیثیت کیا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور یہی بات رائج ہے۔

رہا تعداد کا معاملہ۔ تو اس کی تعداد ایک سے لے کر گیارہ تک احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ احناف تین کے قائل ہیں البتہ ان کے پڑھنے کی نوعیت مختلف ہے۔ تین وتر ایک ہی تشہد سے یا دو کے بعد تشہد، درود شریف، دعا اور سلام پھر ایک وتر علیحدہ پڑھا جائے۔ اکثر احادیث میں یہی دو سری کیفیت مروی ہے۔ پانچ یا سات وتر میں بھی صرف آخر میں ایک تشہد ہے۔ البتہ نو وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو آٹھ میں تشہد درود شریف و دعا کے بعد بغیر سلام کے نویں رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیا جائے یا یہ کہ دو دو

رکعت پر سلام اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے۔ مگر احناف صرف تین وتر کے قائل ہیں اور اس میں دو تشدد پڑھتے ہیں لیکن یہ صحیح تر روایات کے خلاف ہے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے یا بعد دونوں طرح درست ہے۔ دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھنی چاہئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

راوی حدیث: ﴿حسن بن علی رضی اللہ عنہ﴾ رسول اللہ ﷺ کے نواسے اور ان کے دل کا سرور اور دنیا میں ان کے لئے خوشبو تھے۔ جنت کے نوجوانوں کے سرداروں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳ھ کو پیدا ہوئے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا۔ لیکن اپنی خلافت کے سات ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان خون نہ پئے۔ ۴۹ھ کو فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(۲۴۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔“ (نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ)

اور یہ حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مروی

وَهُوَ أَقْوَى مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ. فَإِنَّ لِلْأَوَّلِ شَاهِدًا مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ. وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ مُتَّفَقًا مُؤَوَّفًا.

اس حدیث سے قوی تر ہے جس میں ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو سجدہ میں جاتے دیکھا ہے کہ آپ اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ (اس کو چاروں ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث کا شاہد ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً موقوف بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا سجد احدكم﴾ یعنی جب سجدہ کرنے کیلئے جھکے۔ ﴿فلا يبرك﴾ باب نصر ينصر سے نبی کا صیغہ ہے۔ یعنی نہ بیٹھے۔ ﴿كما يبرك البعير﴾ جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سجدہ کرنے کیلئے جھکتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنے چاہیں بعد میں گھٹنے۔ ﴿وهو﴾ سے مراد یہاں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے۔ ﴿اقوى﴾ سند کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ ﴿من حديث وائل بن حجر﴾ وائل بن حجر سے مروی حدیث سے جس میں گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھنے کا ذکر ہے۔ ﴿فان للال﴾ سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ بالا حدیث ہے

﴿شاهد﴾ یعنی گواہ اس سے مراد حدیث کو تقویت پہنچانے والا ہے۔ جسے ”دراوردی“ نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کیا ہے مگر ﴿وذكرہ﴾ یعنی وہ شاهد ذکر کیا ہے۔ ﴿البخاری موقوف﴾ یعنی بخاری نے موقوفاً چنانچہ نافع کا قول ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ بخاری نے تو موقوفاً نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: حضرت وائلؓ کی حدیث بیان کرنے میں شریک تھا ہے اور وہ جب تھا کوئی روایت بیان کرے تو اس کی روایت میں محدثین نے کلام کیا ہے اور وائلؓ کی حدیث کی تائید گو حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جو جہول ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ باعتبار سند حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث راجح ہے اور بحیثیت معنی تو یہ معلوم حقیقت ہے کہ حیوان کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں یعنی اس کے پہلے دونوں پاؤں اور یہ مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ اونٹ جب نیچے بیٹھنے کیلئے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیکتا ہے پھر بیٹھتا ہے۔ جس کی تفصیل تحفۃ الاحوزی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں یا گھٹنے۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک حضرت ابو ہریرہؓ سے جس میں ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کا ثبوت ہے اور دوسری حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے جس میں پہلے گھٹنے رکھنے کا ذکر ہے۔ مصنف یعنی حافظ ابن حجرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کو راجح قرار دیا ہے اور اس کی تائید ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عموماً محدثین اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں مگر احناف اور شوافع حضرت وائلؓ کی حدیث کے مطابق پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں مگر صحیح بات یہی ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے جائیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲۶۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ لِلشَّهَادِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرَى عَلَى رُكْبَتِهِ الْيُسْرَى، وَالْيُمْنَى عَلَى الْيُمْنَى، وَعَقَدَ ثَلَاثًا وَخَمْسِينَ، وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کیلئے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے پر رکھتے اور تہین کی گرہ دیتے (یعنی تہین کا عدد بناتے) اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: وَقَبَضَ أَصَابِعُهُ كُلَّهَا، وَأَشَارَ بِأَلْيَتِي تَلِي الْإِنْهَامَ.

اور ایک روایت میں ہے جسے مسلم ہی نے روایت کیا ہے کہ اپنی تمام انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے۔

نفعی تشریح: ﴿عقد ثلاثا و خمسين﴾ اپنی انگلیوں کو گرہ دے کر تہین کے عدد کی شکل بنالے۔ اس کی صورت اس طرح ہوتی کہ اپنے انگوٹھے کو سبابہ (انگشت شہادت) کے نیچے کر لیتے۔ ﴿سبابہ﴾

”ہا“ پر تشدید اگٹھ کے متصل انگشت کو کہتے ہیں۔ اس انگشت کا نام سبابہ یعنی گالی دینے والی کیوں پڑ گیا؟ اس لئے کہ دور جاہلیت میں گالی گلوچ کے موقع پر اس انگلی سے اشارہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے مذہب زمانے میں بھی آج کل لوگ اس طرح اشارہ کر کے گالی مراد لیتے ہیں۔ روایات سے تشدد کی حالت میں بیٹھے وقت دائیں ہاتھ کو گرہ دینے کی صورت میں تین حالتیں یا صورتیں بنتی ہیں۔ پہلی تو یہی ترتیب کی شکل جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری اس طرح کی انگشت شہادت کو چھوڑ کر باقی ساری انگلیوں کو ہتھیلی کے ساتھ ملا دینا اور یہ وہی ہیئت ہے جس کا ”وقبض اصابعہ کلہا“ کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ انگشت وسطیٰ اور انگوٹھے کا حلقہ بنایا جائے۔ اسے ابن ماجہ نے وائل بن حجر رحمہ اللہ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ اس موقع پر مناسبت کے لحاظ سے یہ ذہن نشین رہے کہ حساب کا شمار کرنے کیلئے اہل عرب بھی ایک معروف طریقہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جیسے صاحب سبل السلام نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ ایک کے عدد کیلئے خضر (یعنی چھوٹی انگلی) کو ہتھیلی کے باطن (اندرونی طرف) کے قریب گرہ کی شکل میں موڑ دینا اور دو کے عدد کیلئے خضر اور بنصر (چھوٹی کے ساتھ والی) دونوں کو ہتھیلی کے اندرونی طرف موڑ دینا اور تین کیلئے انگشت وسطیٰ (بڑی درمیانی) کو بھی خضر اور بنصر کے ساتھ بند کر دینا اور چار کے عدد کیلئے خضر کو کھول دینا اور پانچ کیلئے بنصر کو خضر کے ساتھ کھول دینا اور وسطیٰ کو بدستور بند رکھنا اور چھ کے عدد کیلئے تنہا بنصر کو بند کر دینا اور باقی انگلیوں کو کھلا رکھنا اور سات کے عدد کیلئے خضر کو ہتھیلی سے ملے ہوئے انگوٹھے کے حصہ کی طرف دراز کر دینا اور آٹھ کے عدد کیلئے بنصر کو ان کے اوپر پھیلا دینا اور نو کے عدد کیلئے ان پر انگشت وسطیٰ کو پھیلا دینا۔ یہ طریقہ تو تھا اکائی کی گنتی کیلئے۔ اب دہائی کو لے لیں۔ دس کے عدد کو نمایاں کرنے کیلئے انگوٹھے کا سر انگشت شہادت کی طرف گرہ کی صورت میں موڑ دیا جائے اور بیس کے عدد کیلئے انگشت شہادت اور وسطیٰ کے درمیان میں انگوٹھے کو داخل کرنا اور تیس کے عدد کیلئے انگشت سبابہ کے سر کو انگوٹھے کے سر پر گرہ کی شکل دے دیں۔ یعنی دس کے عدد کے اظہار کیلئے جو صورت بنتی ہے یہ اس کے برعکس ہے اور چالیس کیلئے انگوٹھے کو انگشت سبابہ کے درمیان جہاں گرہ پڑتی ہو پر سوار کر دینا اور انگوٹھے کو اس کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور پچاس کیلئے انگوٹھے سبابہ کی جڑ کی طرف موڑ دینا۔ یعنی انگوٹھے کے اندرونی حصہ کو اس خط پر رکھنا جو سبابہ اور انگوٹھے کے درمیان ہے اور ساٹھ کے عدد کیلئے سبابہ کو انگوٹھے کی پشت پر سوار کر دینا یعنی چالیس کی جو صورت بنتی ہے اس کے برعکس اور ستر کے عدد کیلئے انگوٹھے کے سر کو سبابہ کی وسطیٰ گرہ (باطنی حصہ) پر ڈال دینا اور سبابہ کی ایک طرف کو انگوٹھے کی طرف لوٹا دینا اور اسی کے عدد کیلئے سبابہ کی ایک جانب کو اس کی جڑ کی طرف لوٹا دینا اور انگوٹھے کی جانب سے سبابہ کے پہلو پر انگوٹھے کو پھیلا دینا اور نوے کے عدد کے لئے سبابہ کو انگوٹھے کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور انگوٹھے کو اس کے اوپر پھیلا دینا پکڑنے کی صورت میں۔ رہی سینکڑوں کی گنتی کا طریقہ تو اکائیوں کی طرح ہے نو سو تک بائیں ہاتھ میں اور ہزاروں کی گنتی کا طریقہ شمار بائیں ہاتھ میں جس سے دہائیاں شمار کی گئی ہیں۔

اب رہا تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ کرنا کہ یہ کب اور کس طرح کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشہد کے آغاز ہی سے لے کر اختتام تشہد تک انگلی کو ایک ہی ہیئت میں رکھے اور یہ صورت ترین کے عدد کی سی بنتی ہے۔ یہ اشارہ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے مگر یہ روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں اس کی تردید کرتی ہے کیونکہ ۱۰ اشارہ باصبعہ السبابة ﴿ کا عطف قول ماقبل پر ہے اور عطف مغایرت کا متقاضی ہے اور اشارہ ترین کی گرہ سے پیدا شدہ ہیئت پر زائد چیز ہے نیز ابن خزیمہ اور بیہقی میں حضرت واکل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اوپر اٹھائی پھر میں نے دیکھا کہ آپؐ اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے“ ظاہر ہے کہ حرکت تو کسی چیز کو ایک ہی ہیئت پر برقرار رکھنے کے منافی ہے اور جس روایت میں آیا ہے کہ آپؐ حرکت نہیں دیتے تھے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ اشارہ اس وقت کرتے جب لا الہ الا اللہ کہتے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تشہد کی حالت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے یا تو وہ کسی محسوس چیز کی طرف ہو گا یا کسی معنی کی جانب جو ذہن میں ہو گا۔ نماز تو بہر حال کسی حسی اشارہ کا موقع و محل نہیں اور نہ امام کے سامنے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرے۔ لہذا اشارہ میں کوئی ایسی چیز ہی ہو سکتی ہے جس کا ذہن میں تصور ہو اور اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب کلمہ توحید لا الہ الا اللہ ہے کیونکہ کسی چیز کی وحدانیت بیان کرنے کیلئے ایک انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا لوگوں کے ہاں متعارف اور مشہور ہے۔ لیکن یہ بات گو عقلاً قابل توجہ ہے مگر سنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آپؐ لا الہ الا اللہ پر یوں اشارہ کرتے کہ ”لا الہ“ پر انگلی کو اوپر اٹھاتے اور ”الا اللہ“ پر نیچے کر لیتے۔ یہ اشارہ بلاشبہ اشارہ توحید بھی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی ”دو انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا ”احد“ احد کہ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو“ اور اسی بنا پر یہ شیطان کیلئے بمنزلہ نیزہ کے ہے لیکن کلمہ توحید پر یوں اشارہ کی کیفیت بہر حال سنت سے ثابت نہیں۔ اس کے برعکس حدیث کے ظاہری الفاظ ”یدعوہا“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد طلب مغفرت اور دعا ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشارہ ابتدا سے آخر تشہد تک ہونا چاہئے، کیونکہ آداب دعا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے جیسا کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے اور آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور لا الہ الا اللہ فی الجملہ دعا بھی ہے کیونکہ دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعائے ثنا اور دوسری دعائے طلب اور پورا تشہد دعا کی ان دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اشارہ ابتدا سے اختتام دعا تک ہونا چاہئے اور اشارہ کے ساتھ انگلی کو حرکت بھی دینی چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں (عقد ثلاثا وخمسین) تشہد میں بیٹھے ہوئے جب اشارہ فرماتے تو اپنے انگوٹھے کو پاس والی انگلی کی جڑ میں رکھتے اور باقی انگلیوں کو بند رکھتے۔ اسی طرح ہمیں کرنا چاہئے تاکہ سنت پر عمل ہو جائے۔ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ پر سب ائمہ متفق ہیں۔ ملا علی قاری

کہ حمد اور درود کو چھوڑ دیا تھا۔ ﴿ثم دعاه﴾ پھر اسے اپنے پاس بلایا کہ اسے آداب دعا سکھائیں۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا جلدی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ دعا تو نام ہی عاجزی و
 انکساری اور اظہار تذلل کا ہے۔ اس لئے جب دعا کی جائے تو پورے اہتمام و اطمینان سے دعا کی جائے۔
 پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے پھر رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے پھر دعا کی جائے۔ یہ
 حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تشہد کے عین مطابق ہے کہ تشہد میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ
 کی تعریف و ثناء ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ حدیث تشہد کے بعد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کا محل تشہد
 ہے۔

تشہد میں پہلے السلام علیک ایہا النبی اور پھر السلام علینا و علی عباد اللہ
 الصالحین کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اور آپؐ ہی کی بدولت ہمیں نماز کا طریقہ و سلیقہ
 حاصل ہوا۔ اس میں خطاب کا لفظ ”السلام علیک“ دکائی ہے جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ
 میں کہا ہے۔ آپؐ خود بھی یہ کلمات یوں ہی پڑھتے تھے۔ نیز آپؐ کے انتقال کے بعد صحابہ کرام السلام
 علی النبی کے الفاظ پڑھنے لگے تھے۔ (بخاری) خطاب کبھی حاضر فی الذہن کیلئے بھی ہوتا۔ بہر نوع تشہد
 میں اس خطاب سے خرافیوں کا وجودی وحسی حاضر و ناظر مراد لینا غلط اور بے بنیاد ہے۔

راوی حدیث: ﴿فضالۃ بن عبید اللہ﴾ ”فا“ پر فتح اور عبید، عبد سے تصغیر۔ فضالہ بن عبید بن نافذ
 بن قیس۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ پہلا معرکہ، جس میں یہ شریک
 ہوئے معرکہ احد تھا۔ اس کے بعد سب غزوات میں شریک رہے۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ شام کی
 طرف نقل مکانی کر گئے تھے اور دمشق میں سکونت پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
 جنگ کیلئے نکلے اس وقت یہ وہاں کے قاضی (جج) تھے۔ ۵۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۲۴۹) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ
 الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
 قَالَ: قَالَ بَشِيرُ بْنُ سَعْدٍ: يَا رَسُولَ
 اللَّهِ! أَمَرَنَا اللَّهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ،
 فَكَيْفَ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ؟ ثُمَّ
 قَالَ: «قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى
 مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا
 صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى
 مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا
 بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ فِي الْعَالَمِينَ،
 حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ
 بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)!
 اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپؐ پر درود بھیجنے کا حکم ارشاد
 فرمایا ہے لہذا ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجیں؟
 تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا ”اس طرح کہا کرو
 اللہم صل علی محمد..... الخ اے اللہ!
 محمد (ﷺ) اور آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما جس طرح
 تو نے رحمت نازل فرمائی، ابراہیمؑ پر اور برکت نازل
 فرما محمد (ﷺ) اور آل محمدؐ پر جس طرح تو نے
 برکت نازل فرمائی ابراہیمؑ پر دونوں جہانوں میں۔ یقیناً

إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ. وَالسَّلَامُ كَمَا تَوَسَّوْهُ صِفَاتُ هُوَ وَأَوْرَافُ بَنُ خَزِيمَةَ فِيهِ: اس کا علم تمہیں سکھایا گیا ہے۔" (مسلم) اور ابن کثیر نے اس میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہم جب نماز پڑھ رہے ہوں تو اس وقت آپؐ پر درود کس طرح پڑھیں۔

لغوی تشریح: ﴿امرنا اللہ ان نصلی علیک﴾ اللہ کا حکم ﴿صلوا علیہ وسلموا تسلیما﴾ میں ہے "والسلام کما علمتم" تعلیم سے صیغہ مجہول ہے۔ یعنی جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے تعلیم دی گئی ہے اور اس کا احتمال ہے کہ علم سے ماخوذ صیغہ معلوم ہو اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے التحیات للہ الخ کی صورت میں تمہیں سکھایا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ پر نماز میں درود و سلام بھیجنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سمیت بہت سے ائمہ رحمہم اسے واجب ہی قرار دیتے ہیں۔ درود شریف کے مختلف الفاظ احادیث میں مروی ہیں۔ جس کی تفصیل جلاء الافہام اور القول البدیع میں موجود ہے اور صحیح ترین روایت جو نماز میں درود شریف پڑھنے کی ہے وہ یہی ہے۔ "آل" میں لغوی اعتبار سے گو آپؐ پر ایمان لانے والے تمام مومن و متقی بھی مراد ہیں مگر صحیح تراتب یہ ہے کہ یہاں اس سے آپؐ کے وہ رشتہ دار مراد ہیں جن پر صدقہ و زکوٰۃ حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو مسعود انصاری رحمہ اللہ﴾ ان کا نام عقبہ بن عمرو ہے اور ابو مسعود ان کی کنیت ہے۔ انصار مدینہ میں ہونے کی بنا پر انصاری کہلائے۔ بدر میں شامل ہونے والے جلیل القدر اور بزرگ صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تو تھے مگر کم سن تھے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۳۰ھ کے بعد انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔

﴿بشیر بن سعد رحمہ اللہ﴾ ابو نعمان کنیت تھی۔ بشیر "باء" پر زبر "شین" کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن) بن سعد بن ثعلبہ بن جلاس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یا خلاص ("خاء" کے فتح اور لام کی تشدید کے ساتھ)۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری اور قبیلہ خزرج میں سے ہونے کی وجہ سے خزرجی کہلائے۔ بدر اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابی تھے۔ احد و خندق اور بعد کے معرکوں میں شامل رہے۔ عین تمر میں ۱۳ھ کو شہید ہوئے۔

(۲۵۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ تَوَاجِهًا لِلَّهِ بِأَرْبَعٍ، يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْغَلَمِ وَالْجُنْمِ وَالْجُبْنِ وَالْجُبْنِ وَالْجُبْنِ» (اور پوری

أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: إِذَا قَرَأَ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْأَخِيرِ.

ہوں اور عذاب قبر سے پناہ طلب کرتا ہوں اور موت و حیات کے فتنہ سے تیری پناہ کا طلبگار ہوں اور مسیح دجال کے فتنہ کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں۔ ”جب تم سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو۔ تو اس وقت ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔“

لغوی تشریح: ﴿فتنۃ المحیا﴾ محیا سے زندگی مراد ہے اور اس کے فتنہ سے مراد انسان کو جو آزمائشیں دنیا میں پیش آتی ہیں اور وہ خواہشات یا نادانی و جہالت کی وجہ سے جن دشواریوں اور پریشانیوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے یا وہ بلائیں جو صبر و تحمل نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ سب ہی مراد ہیں۔ ﴿الممات﴾ ممات سے مراد موت ہے اور موت کے فتنہ سے مراد برا خاتمہ ہے۔

حاصل کلام: تشہد میں درود و سلام کے بعد اس استعاذہ کو ابن حزم نے واجب قرار دیا ہے۔ تابعین میں امام طاووس رحمہ اللہ کا بھی موقف یہی تھا۔ بلکہ حافظ ابن حزم تو دونوں تشہدوں میں استعاذہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی علماء اسے آخری تشہد میں درود کے بعد پڑھنے کو مستحب ہی کہتے ہیں۔

اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس کا انکار نص قرآن اور حدیث صحیح کا انکار ہے۔

(۲۵۱) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصَّدِيقِ حَضْرَتِ ابُو بَكْرٍ صَدِيقِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سے مروی ہے کہ میں نے رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: عَلَّمَنِي دُعَاءَ اَدْعُوْا اِیسی دعا سکھائیں جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ بِہِ فِی صَلَاتَیْ! قَالَ: «قُلْ: اللّٰهُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا کَثِیْرًا، وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، فَاعْفُرْ لِی مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِی، اِنَّکَ اَنْتَ الْعَفُوْرُ الرَّحِیْمُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا ”یہ دعا پڑھا کرو۔ اللہم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً، ولا یغفر الذنوب الا انت، فاعفر لی مغفرة من عندک، وارحمنی، انک انت العفور الرحیم۔“ متفق علیہ۔

بیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت لغزش اور غلطی و خطا کا امکان رہتا ہے۔ ابوبکر الصديق

ﷺ جیسا انسان بھی اپنے آپ کو اس سے مستغنی نہیں سمجھتا۔ حالانکہ ان کو رسالت مآب ﷺ کی طرف سے الٰہدق کا خطاب عطا ہوا تھا۔

راوی حدیث: ﴿ابوبکر الصديق ۛ﴾ ابوبکر کنیت تھی۔ الصديق لقب تھا۔ عبداللہ بن عثمان نام تھا۔ عثمان جو ابو قحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ یتیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پہلے خلیفہ راشد تھے۔ انبیائے کرامؑ کے بعد تمام انسانوں میں افضل انسان تھے۔ سفر ہجرت مدینہ کے موقع پر غار ثور میں آپؐ کے ساتھی تھے۔ اسی بنا پر ان کو صاحب غار کہا جاتا ہے۔ گورے چٹے، دبلے پتلے جسم کے انسان تھے۔ تعریف سے مستغنی ہیں۔ بڑے عزم و استقلال اور صمیم الارادۃ تھے۔ احباب و رفقاء کیلئے رحیم و رقیق اور اعداء السلام اور دشمنان دین کیلئے ناقابل شکست چٹان تھے۔ ۱۳ھ میں جمادی الاخریٰ میں وفات پائی۔

(۲۵۲) وَعَنْ وَاِثِلَ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَكَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِينِهِ: السَّلَامَ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ، وَعَنْ شِمَالِهِ: السَّلَامَ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے دائیں جانب سلام پھیرتے ہوئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور اسی طرح بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" (ابوداؤد نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے سلام میں ”وبرکاتہ“ کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یہ اضافہ گو اس موضوع کی اکثر روایات میں نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے علاوہ بعض دیگر روایات سے بھی اس کی صحت ثابت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نتائج الافکار میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس لئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کتنا بھی درست ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بلکہ کبار صحابہ و تابعین کے نزدیک السلام علیکم کہہ کر نماز سے فارغ ہونا فرض ہے مگر احناف اسے صرف سنت قرار دیتے ہیں اور کسی بھی ایسے عمل کو نماز سے فارغ ہونے کیلئے کافی سمجھتے ہیں جو نماز کے منافی ہو لیکن یہ صریح احادیث کے خلاف ہے اور سنت قولی و عملی کے منافی ہے۔

(۲۵۳) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ،

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی صاحب نصیبہ کو تیرے بغیر کوئی نصیبہ فائدہ نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منقول دعا اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ کے ماسوا کوئی بھی معبود نہیں کہ جس کی طرف حاجات و ضروریات کی تکمیل کیلئے رجوع کیا جاسکے۔ دنیا و مافیہا اور آسمانوں کی ہر ایک چیز اس کی مخلوق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ہر وقت محتاج ہے۔ وہ قادر مطلق ہے کسی کو کچھ دینے اور نہ دینے کے جملہ اختیارات بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کی سرکار میں دنیوی جاہ و حشمت، عزت و سلطنت اس کے فضل اور رحمت کے سوا ذرا بھر بھی کارگر اور منافع بخش ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ دعا نماز فرض سے فارغ ہو کر پڑھنی مستحب ہے۔

(۲۵۴) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِمْ ذُبْرَ كُلِّ صَلَاةٍ: «اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْدَلِ الْعُمْرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے آخر میں یہ تعوذ پڑھا کرتے تھے۔ اللہم انی اعوذ بک من البخل..... الخ ”اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں بخل سے اور بزدلی سے اور تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میں رذیل ترین عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿بہن﴾ ان کلمات کے ذریعہ سے مراد ہیں وہ کلمات جو اس حدیث میں مذکور ہیں ﴿دبر کل صلاۃ﴾ نماز کے اختتام کے موقع پر یا سلام پھیر دینے کے بعد۔ ﴿الجبن﴾ جیم پر ضمہ اور ”با“ ساکن۔ کمزوری اور ضعف یا پھر دشمن سے نبرد آزمائی کا خوف و اندیشہ۔ ﴿من ان ارد﴾ ارد صیغہ متکلم ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ یعنی میں لوٹایا جاؤں یا اس طرف پھیرا جاؤں۔ ﴿الی اردل العمر﴾ یعنی خفیس اور ذلت آمیز عمر کی طرف وہ اس وقت ہوتی ہے جب بدھاپا شدت اختیار کر جائے اور کبر سنی انسان کو بچوں سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور حیوان سے زیادہ رذیل بنا دیتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بول و براز بھی اپنے کپڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کھانا پینا اور خورد و نوش بھی بستر پر ہو جاتا

ہے۔ اللہ سے استدعا ہے کہ ہم سب کو ایسی رسوا کن اور رذیل ترین عمر سے اپنی پناہ میں رکھے۔
حاصل کلام: حدیث کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعویذ اختتام نماز یعنی سلام پھیرنے سے پہلے بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد بھی۔ بڑی بامعنی دعا ہے۔ اس کا التزام کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ﴾ ابواسحق ان کی کنیت تھی۔ باپ کا نام مالک تھا۔ قریش سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرشی کہلائے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں نمبر ہے یا بقول بعض ساتواں نمبر۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (جنہیں حضور ﷺ نے زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری و بشارت دے دی تھی) اللہ کی راہ میں تیر اندازی کرنے والے یہ پہلے شخص ہیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ کی راہ میں انہوں نے تیر چلایا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ فاتح عراق ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ پستہ قامت مگر گٹھا ہوا بدن، گندمی رنگ، مدینہ سے دس میل دور واقع مقام عقیق میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت مدینہ طیبہ لائی گئی اور ۵۵ھ میں جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

(۲۵۵) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَنْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهِ اسْتَغْفَرَ اللَّهَ ثَلَاثًا، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے اور پھر اللہم انت السلام ومنك السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام پڑھتے۔ ”اے اللہ! میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور اے اللہ! تو سلام ہے یعنی تو ہی سلامتی والا ہے اور سلامتی تجھ ہی سے ہے اے بزرگی و برتری کے مالک! تو بڑی برکت والا ہے) (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے نماز کے ان اذکار کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کا استغفار بطور شکر اور تعلیم کے تھا اور اہل ایمان کا استغفار نماز میں کمی و بیشی، وسوس اور خیالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کمی و زیادتی اور آمد خیالات کی بنا پر نماز میں نقص واقع ہو گیا۔ بقضائے بشریت ہم اس کی مغفرت اور درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی عبدیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے معبود سے معافی کی استدعا کرتا ہی رہے۔

نبی ﷺ استغفار کس طرح پڑھتے تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے استفسار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار کون سا تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ حضور ﷺ استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ فرماتے۔

اس حدیث میں دعا کے جتنے فقرات مذکور ہیں وہی پڑھنے مسنون ہیں مگر یار لوگوں نے اس پر صبر نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے اضافہ فرما کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثلاً اسی دعا میں اس طرح اضافہ کر دیا اللہم

انت السلام ومنك السلام واليك يرجع السلام حيناً ربنا بالسلام تباركت يا ذا الجلال والكرام وغيرہ کا۔ ہر حال حدیث میں یہ اضافہ کیسے مقول نہیں اپنی طرف سے یہ اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند کے مصداق ہے۔

(۲۵۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ قَالَ: «مَنْ سَبَّحَ اللَّهَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَحَمِدَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَكَبَّرَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، فَبَلَغَ تِسْعَ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ الْمِائَةِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَخَدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَيْدِ الْبَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: أَنَّ التَّكْبِيرَ أَرْبَعٌ وَثَلَاثُونَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا اور ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور اللہ اکبر بھی ۳۳ مرتبہ یہ مجموعی طور پر ۹۹ یعنی ایک کم سو ہوئے اور سو مکمل کرنے کیلئے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وهو علی کل شئی قدیر کہا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں خواہ ان کی تعداد سمندر کی جھاگ کے مساوی ہو۔“ (مسلم) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ کے۔

لغوی تشریح: ﴿سبح﴾ تسبیح بیان کی یعنی سبحان اللہ کہا۔ ﴿زید البحر﴾ زاء اور ”با“ دونوں پر فتح۔ جھاگ۔ جب پانی موجزن ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ آ جاتی ہے۔ اس قسم کی عبارت بیان کرنے سے مقصود کسی شے کی کثرت بیان کرنا ہوتا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن گناہوں اور خطاؤں کے معاف کئے جانے کا ذکر ہے ان سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ مگر جہاں تک کبار کا تعلق ہے تو ان کیلئے توبہ ناگزیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہر نماز کے اختتام پر خواہ وہ نفل نماز ہو یا فرض یہ کلمات پڑھنے مسنون بھی ہیں اور بکثرت گناہوں کے بخشے جانے کی نوید بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے ان کلمات کا فرائض کے بعد پڑھنا مشروع ہونا ثابت کیا ہے۔

اس دعا کا پس منظر جو بخاری میں مذکور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک روز فقراء مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مالدار صاحب ثروت لوگ تو سب نیکیاں اور بھلائیاں لوٹ کر لے گئے۔ وہ لوگ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں اور وہ صدقہ و خیرات بھی ہم سے زیادہ کرتے ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں ہے) آپ نے (انہیں تسلی دیتے ہوئے) فرمایا ”میں تمہیں ایسا عمل نہ سکھاؤں یا بتلاؤں کہ تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کا ثواب بھی حاصل کر لو اور کوئی تم سے آگے بھی نہ بڑھ سکے

بشرطیکہ کوئی وہی عمل کرے جو تم کرو۔“ اس موقع پر آپؐ نے ہر نماز کے بعد مذکورہ کلمات کہنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

ان کلمات کو پڑھنے کی دو صورتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ اور الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ یا ۳۴ مرتبہ۔ دوسرا یہ کہ ۳۳، ۳۳، ۳۳ مرتبہ تینوں کلمات اور ۳۴ مرتبہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وهو علی کل شئی قذیر پڑھ کر سو کی تعداد پوری کرے۔ اگر تینوں کلمات بالترتیب ۳۳، ۳۳، ۳۴ اور ۳۴ مرتبہ پڑھے جائیں تو پھر لا الہ الا اللہ الخ نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ اس طرح تعداد ۱۰۰ میں ایک عدد کا اضافہ ہو کر سو کی بجائے تعداد ایک سو ایک ہو جائے گی جو سنت سے ثابت نہیں۔

(۲۵۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَهُ: «أَوْصِيكَ يَا مُعَاذُ: لَا تَدَعَنَّ ذُبْرَ كُلِّ صَلَاةٍ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا ”اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے اختتام کے بعد ان کلمات کو کبھی فراموش نہ کرنا“ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک“ اے اللہ! مجھے اپنے ذکر اور شکر اور حسن عبادت کی توفیق سے نواز یا اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں ذکر کروں تیرا اور شکر ادا کر سکوں تیرا اور عمدہ اور بہتر عبادت بجالاؤں

تیری۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لَا تَدَعَنَّ﴾ تا، دال اور عین تینوں پر فتح۔ معنی ہیں نہ ترک کرنا۔ ودع یدع سے نبی کا صیغہ ہے جب اسے چھوڑ دے، نظر انداز کر دے۔ ﴿اعنی﴾ حمزہ پر فتح اور عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید۔ ﴿الاعانۃ﴾ سے دعا کا صیغہ ہے۔ ایک نون کو دوسرے نون و قالیہ میں مدغم کر دیا گیا اس طرح وہ مشدد ہو گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ میری نصرت فرما اور مجھے توفیق سے نواز۔

حاصل کلام: ﴿لَا تَدَعَنَّ﴾ اس پر مدلول ہے کہ اس دعا کو فرض نماز کے بعد نظر انداز کرنا اور ترک کر دینا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ نبی اصل تو تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ اس دعا کے علاوہ کتب احادیث مثلاً مسلم، ابوداؤد، نسائی، احمد اور ترمذی وغیرہ میں اور بہت سی دعائیں آپؐ سے پڑھنا ثابت ہیں۔ حتیٰ الوسع زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ سنت پر عمل بھی ہو اور اس کی اشاعت و ترویج بھی۔

(۲۵۸) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے ہر فرض نماز کے

ﷺ: «مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ اِدَا كَرْنِے كَے بَعْدِ آيَةِ الْكُرْسِيِّ پڑھی۔ اس كو جَنّتِ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ مِیں داخل ہونے سے موت کے سوا اور كوئی چیز الْجَنَّةِ إِلَّا الْمَوْتُ»۔ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، (مرتے ہی جنت میں داخل ہو وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَزَادَ فِيهِ الطَّبْرَانِيُّ: «وَقُلُ هُوَ جَاے گا بشرطیکہ عقیدہ توحید صحیح ہو) (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور طبرانی

نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قل هو الله احد" بھی پڑھے)۔

حاصل کلام: آیت الکرسی کی فضیلت کے بارے میں آپؐ کے اور بھی ارشادات کتب حدیث میں منقول ہیں۔ اس کی اتنی فضیلت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں توحید الہی کو صاف طور پر نکھار کر بیان کیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت، اس کی قدرت اور اس کا علم ماسکان و مایکون اور کائنات کی حفاظت وغیرہ صفات کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اور سورہ اخلاص تو تہائی قرآن کے برابر ثواب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اصل میں تین بنیادی عقائد ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اس سورہ میں اللہ کی وحدانیت، اس کی صمدیت کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ سورہ بھی اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ لہذا جو آدمی اہتمام کے ساتھ ان کو نماز فرض کے بعد پڑھے گا اسے مرتے ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (انشاء اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دنیا میں کوئی منکر آج تک نہیں پایا گیا۔ نیز اس سے جنت کا وجود بھی معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت بھی مخلوق ہے یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی۔

راوی حدیث: ﴿ابو امامہ رضی اللہ عنہ﴾ ابوامامہ کنیت ایاس بن ثعلبہ بلوی نام تھا اور انصار کے قبیلہ بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ والدہ کی تیمارداری میں مشغولیت کی وجہ سے غزوہ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔

(۲۵۹) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ حَضْرَتِ مَالِكِ بْنِ حُوَيْرِثٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَے فرمایا "نماز اسی طرح پڑھو جس رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «صَلُّوْا كَمَا طَرَحَ مَجْھے پڑھتے تم نے دیکھا ہے۔» (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے براہ راست تو خطاب صحابہ کرامؓ سے ہے۔ لیکن عمومی حکم میں امت مسلمہ کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ امیریمانی نے کہا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں آپؐ نے جو افعال جس طرح ادا فرمائے بعینہ اسی طرح ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ جس کا کسی دوسری دلیل

سے غیر واجب ہونا ثابت ہو جائے تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔ (سبل)

(۲۶۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلُّ قَائِمًا، پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ، وَلَا فَاوُمَ». بل لیٹ کر پڑھو۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ ہو رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔ سکے تو اشارہ سے ہی پڑھ لو۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿فعلى جنب﴾ اپنی دائیں جانب لیٹ کر۔ اس صورت میں پاؤں کا رخ قبلہ رخ نہ ہونا چاہئے بلکہ استقبال قبلہ کے وقت بائیں جانب ہونا چاہئے۔ ﴿فاوُم﴾ ایما سے امر کا صیغہ ہے۔ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کسی صورت بھی معاف نہیں مجرہ ہوشی کی حالت کے۔ نیز ثابت ہوا کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے بامجبوری یا بیماری کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر ایسا بھی کرنا دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ ان حالتوں میں کسی پر بھی اگر قادر نہ ہو تو پھر اشاروں سے۔ گویا نماز کسی صورت بھی ترک نہ کرے۔

(۲۶۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: قَالَ لِمَرِيضٍ - صَلَّى عَلَى وَسَادَةٍ، نے اس کا تکیہ پھینک دیا اور فرمایا ”اگر پڑھ سکتے ہو فَرَمَى بِهَا، - وَقَالَ: «صَلُّ عَلَى الْأَرْضِ إِنْ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَاوُمَ اپنے سجدہ کو رکوع سے ذرا نیچے کرو۔“ (اسے یہتی نے رُوِيَ عَنْهُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ، وَلَكِنْ مَوْقُوفٌ هُوَ نَاصِحٌ قَرَّارٌ يَدُلُّ عَلَى صَحِّحِ أَبُو حَاتِمٍ وَفَقَهُ۔

لغوی تشریح: ﴿وسادة﴾ میں ”واو“ پر تینوں اعراب آسکتے ہیں وسادة وسادة وسادة (تکیہ۔ جسے سونے والا اپنے سرہانے رکھتا ہے۔ ﴿فرمى بها﴾ اس آدمی سے اسے دور ہٹا دیا۔ ﴿فاوُم ایما﴾ یعنی اشارہ سے نماز پڑھو۔ ﴿احفض﴾ اسے اسفل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اس سے نیچا۔ حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ نمازی کا کسی اونچی چیز پر سجدہ کرنا درست نہیں۔ اسے زمین پر ہی سجدہ کرنا چاہئے۔ اگر کسی امر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر نمازی کو اشارہ ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

البتہ سجدہ اور رکوع کے اشارہ میں فرق کیا جائے۔ سجدہ کا اشارہ ذرا نیچے ہونا چاہئے یہ نسبت رکوع کے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا تعلق اس کے خالق و مالک سے کسی صورت اور کسی لمحہ بھی منقطع نہیں ہونا چاہئے۔ ہر آن اس کی یاد دل و دماغ میں رچی بسی رہنی چاہئے۔ یہی مقام عبدیت ہے۔

سجود سہو وغیرہ کا بیان

۸ - بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ وَغَيْرِهِ

(۲۶۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهَرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلَاةَ، وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يُكَبِّرُ فِي كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ النَّاسُ مَعَهُ، مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوسِ.

حضرت عبداللہ بن بحدینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو نماز ظہر پڑھائی تو دو رکعتیں ادا کر کے تشدد میں نہ بیٹھے اور سیدھے کھڑے ہو گئے اور مقتدی بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تا آنکہ جب آپ نے نماز پوری ادا کر لی، لوگ سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے کہ آپ نے بیٹھے ہی اللہ اکبر کہا اور دو سجدے کئے۔ سلام پھیرنے سے پہلے۔ پھر سلام پھیرا۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا۔ البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ہر سجدہ کیلئے اللہ اکبر کہتے تھے بیٹھے ہوئے اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا بھول جانے کے قائم مقام۔ (دو رکعت کے بعد تشدد میں بیٹھنا بھول گئے تھے اس کی تلافی کیلئے دو سجدے کئے۔

لعنوی تشریح: ﴿باب سجود السهو﴾ سہو بھول کر کی بیشی کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں نماز میں بھول مراد ہے۔ ﴿فقام فی الركعتین الاولیین﴾ یعنی دو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد۔ ﴿ولم یجلس﴾ پہلے تشدد کیلئے نہ بیٹھے۔ ﴿قضى الصلاة﴾ سلام کے ماسوا ارکان نماز سارے پورے کر لئے۔

حاصل کلام: عربی میں بھول کیلئے دو الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک سہو اور دوسرا نسیان۔ پہلے کا اطلاق عموماً افعال کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے کا بالعموم معلومات کیلئے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی بھی آجاتے ہیں۔ علماء میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کیلئے نسیان کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کو کبھی بھی ابلاغ احکام الہی اور شریعت کے پہنچانے میں

نسیان لاحق نہیں ہوا۔ لاحق ہونے کا امکان بھی نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سَقَرُئِكَ فَلَا تَنسَى) باقی سو کا جہاں تک معاملہ ہے۔ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ سو کا امکان ہے اور عمل ہوا بھی ہے۔ متعدد صحیح احادیث اس بارے میں کتب احادیث میں موجود ہیں اور بہت سے واقعات عملی طور پر اس کا ثبوت ہیں۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی سو کو نبی کریم ﷺ کیلئے ثابت سمجھتے ہیں۔ غالباً آج تک کسی نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا بلکہ اس کی تو بہت سی حکمتیں ہیں، جنہیں صاحب علم و بصیرت لوگ ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر تشدد اول بھول کر رہ جائے تو اس نقصان کی تلافی سجدہ سو سے ہو جاتی ہے۔ سجدہ سو قبل از سلام کیا جائے یا بعد از سلام۔ احادیث سے آپ کا عمل دونوں طرح ثابت ہے۔ زندگی بھر ایک گنگے بندھے طریقے پر آپ ﷺ کا عمل ثابت نہیں ہوتا کہ بس فلاں طریقہ پر ساری عمر عمل فرماتے رہے۔ البتہ جب ائمہ رحمہم اللہ کا دور آیا اور تقلید شخصی پر عمل درآمد شروع ہوا تو ائمہ کرام رحمہم اللہ کے مقلدین نے اپنے اپنے دائرہ میں صورتیں معین کر لیں۔ بہر حال ایک رائے یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جس جس مقام پر جو طرز عمل اختیار فرمایا وہاں اسی طرح عمل کیا جائے۔ مگر باقی مواقع پر جس طرح تحقیق سے ثابت ہوا ہو اس پر عمل کرے۔ امام شوکانی رحمہم اللہ نے نیل الاوطار میں اس طرز عمل کو بہتر قرار دیا ہے کہ نماز میں کمی واقع ہو جانے کی صورت میں سجدہ سو سلام پھیرنے سے پہلے کیا جانا چاہئے اور اگر زیادتی واقع ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے۔ البتہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ کرنا پھر تشدد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرنا، صحیح احادیث کی روشنی میں آنحضور ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں۔

(۲۶۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ فِي بَيْتِهِ إِحْدَى صَلَاتَيْ الْعِشِيِّ رَمَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ قَامَ إِلَى خَشْبَةِ فِي مُقَدِّمِ الْمَسْجِدِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهَا وَفِي الْقَوْمِ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ، فَهَابَا، أَنْ يُكَلِّمَاهُ، وَخَرَجَ سَرْعَانَ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقْصُرَتِ الصَّلَاةُ، وَرَجُلٌ فِي يَدَيْهِ سِرٌّ قَالَ: أَتَيْتُ أَمَّ قُصْرَتِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَنْسَيْتُ أَمْ قُصْرَتِ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: لَمْ أَنْسَ وَلَمْ آدِ تَحَايَ نَبِيَّ ﷺ (اس کے لمبے ہاتھوں کی وجہ سے اس بارے میں بات کرنے سے ذرا خوفزدہ تھے۔)

تُقَصِّرُ، قَالَ: بَلَى قَدْ نَسِيتَ، فَصَلَّى رُكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

(سے) ذوالیدین کہہ کر بلاتے تھے، نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ (آج) بھول گئے ہیں یا نماز کم کر دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا ”نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے۔“ اس شخص نے پھر عرض کیا ہاں آپ ضرور بھول گئے ہیں۔ تو پھر آپ نے دو رکعتیں جو چھوٹ گئی تھیں پڑھیں اور سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر معمول کے سجدوں کی طرح سجدہ کیا یا اس سے ذرا لمبا پھر سجدہ سے اللہ اکبر کہہ کر سر اوپر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر زمین پر رکھا اور معمول کے سجدہ کی طرح یا ذرا اس سے طویل سجدہ کیا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنا سر اٹھایا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

وَفِي رِوَايَةٍ لِّلْمُسْلِمِ: «صَلَاةُ الْعَصْرِ». وَلِأَبِي دَاوُدَ: فَقَالَ: أَصَدَقَ ذُو الْيَدَيْنِ؟ فَأَوْمَتْهُمَا أَيْ نَعَمْ. وَهِيَ فِي الصَّحِيحَيْنِ، لَكِنْ بِلَفْظٍ: «فَقَالُوا». وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَلَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَقْنَهُ اللَّهُ تَعَالَى ذَلِكَ».

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی اور ابوداؤد میں مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ”کیا ذوالیدین نے ٹھیک کہا ہے؟“ تو لوگوں نے سر ہلا کر اشاروں سے کہا ہاں! یہ اضافہ صحیحین میں بھی ہے لیکن ان میں ”فقالوا“ کے لفظ کے ساتھ مروی ہے (یعنی زبان سے انہوں نے کہا) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کو جب تک اللہ کی جانب سے یقین نہ ہوا اس وقت تک سجدہ سو نہیں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿العشى﴾ عین پر فتح۔ شین کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ پر تشدید۔ عشی زوال آفتاب سے لے کر غروب شمس تک کے درمیانے وقت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے نماز ظہر کا تعین ثابت ہوتا ہے اور بعض سے نماز عصر کا مگر شک بدستور باقی رہا رفع نہیں ہوا۔ ﴿فی مقدم المسجد﴾ تقدیم سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔ معنی مسجد کے سامنے، آگے، دروازے پر۔ ﴿ہابا﴾ دونوں خوفزدہ ہوئے۔ ﴿سر عان الناس﴾ ان نمازیوں میں جو جلدی میں تھے۔ ”سرعان“ میں سین پر فتح راء ساکن ہے اور فتح بھی

ہے اور ایک قراءت کے مطابق سرعان کے سین پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ ﴿اقصرت﴾؟ حمزہ یہاں استفہام کیلئے ہے۔ یعنی سوالیہ۔ اس امر واقع میں یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کسی معاملہ کے بارے میں بغیر علم کے بختہ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ سے اس بارے میں پوچھنے کیلئے دوڑے۔ انہوں نے دریافت کرنے کا طرز عمل اس لئے اختیار کیا کہ وہ زمانہ نسخ کا زمانہ تھا کیونکہ نبی کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود تھی۔ ایک فعل (عمل) کی جگہ دوسرے فعل کا حکم آسکتا تھا۔ ﴿قصرت﴾ قاف پر ضمہ اور راء کے نیچے کسرہ۔ صیغہ مجہول ہے اور ایک قراءت کی رو سے قاف پر فتح اور صادر پر ضمہ صیغہ معروف باب کرم بکرم کے وزن پر۔ معنی یہ ہوا کہ نماز مختصر اور چھوٹی ہو گئی ہے۔ ﴿ورجل یدعوہ﴾ اسے نام لے کر بلاتے تھے۔ ﴿ذالیدین﴾ ذوالیدین اس کو اس لئے کہتے کہ اس کے ہاتھ نسبتاً لمبے تھے اور اس کا نام تو خرباق بن عمرو تھا۔ ﴿انسیت؟﴾ اس میں حمزہ استفہامیہ ہے اور نیت میں تا خطاب کیلئے ہے۔ ﴿امقصرت؟﴾ صیغہ واحد غائب صیغہ معروف بھی ہو سکتا ہے اور صیغہ مجہول بھی۔ ﴿لم انس﴾ انس میں حمزہ اور سین دونوں پر فتح ہے۔ معنی ہے میں نہیں، بھولا۔ مضارع پر لم داخل ہو کر اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہ حدیث مجدد سمو کے علاوہ اور مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب نمازی کو گمان غالب ہو کہ اس نے نماز مکمل پڑھ لی ہے پھر سلام بھی پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز نماز میں کمی و بیشی کی اطلاع دینے کی صورت میں دیدہ و دانستہ اور عمدہ گفتگو کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ ﴿فاموموا﴾ تو انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ ﴿ولکن بلفظ فقالوا﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں مروی روایت میں ﴿فاموموا﴾ کی جگہ فقالوا کا لفظ ہے۔ یعنی انہوں نے سر کے اشارہ سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر۔ ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ ﴿بقنہ اللہ﴾ باب تفعیل سے دل میں اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سہو سرزد ہوا ہے اور یہ نبوت کے مخالف و متضاد نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ بھی انسان تھے۔ سہو وغیرہ ایک انسان سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ عالم الغیوب نہ تھے اور نہ آپؐ نے کبھی عالم ماکان وما بکون ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر علم غیب ہوتا تو سمو کی تصدیق کیلئے لوگوں سے دریافت نہ فرماتے کہ کیا ذوالیدین نے ٹھیک اور سچ کہا ہے؟ سمو کی تصدیق ہونے پر اسے تسلیم کر لیا۔ اگر غلط سرزد ہو جانے پر کوئی اصلاح کرے تو اسے صحیح ہونے پر مان لینا چاہئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سجدہ سمو کرتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا چاہئے۔ اس حدیث سے سجدہ سمو سلام سے پہلے ثابت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا تشہد بھول جائے تو اس کی تلافی سمو کے دو سجدوں سے ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف ”صلی النبی“ ہے، مگر بعض روایات میں ”صلی بناء“ کا لفظ منقول ہے۔ یعنی ہمیں نماز پڑھائی۔ اس صورت میں راوی حدیث بھی ان نمازیوں میں شریک تھے۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت ﴿فاموموا للہ فانحسین﴾ سے منسوخ نہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ اس

آیت کے نزول سے چار پانچ سال بعد اسلام لائے ہیں۔ صحابہؓ کی یہ گفتگو سہواً نہیں قصداً ہوئی ہے۔ لہذا اصلاح نماز کیلئے اتنی سی بات نماز کو باطل قرار نہیں دیتی۔

راوی حدیث: ﴿خرباق بن عمرو سلمیؓ﴾ بنو سلیم سے ہونے کی وجہ سے سلمی کہلائے۔
 سہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ انہوں نے امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی اور
 ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ذی شخب مقام پر
 وفات پائی اور بعض روایات میں ذوالیدین کی بجائے ذوالشمالین بھی وارد ہے۔ بعض کا خیال ہے دونوں سے
 ایک ہی شخص مراد ہے۔ یہ وہم ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ دو شخص تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ
 ذوالشمالین بدر میں شہید ہوئے ہیں اور یہ واقعہ بیان کرنے والے ابو ہریرہؓ اور عمران بن حصینؓ
 ہیں اور یہ دونوں تو اسلام غزوہ خیبر کے سال لائے ہیں۔

(۲۶۶) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمْ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ تَشَهَّدَ، ثُمَّ سَلَّمَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَالحَاجِمُ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی تو آپ کو سو ہو گیا (یعنی آپ بھول گئے) تو (پہلے) دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا اور پھر سلام پھیرا۔ (اسے ابوداؤد ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز میں بھول لاحق ہونے والا واقعہ وہی ہے جس میں ذوالیدین نے دریافت کیا تھا کہ کیا نماز کم ہو گئی ہے یا آپؐ بھول گئے ہیں؟ ذوالیدین والا واقعہ صحیحین اور سنن کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ کسی کتاب میں مروی حدیث میں سجود سو کے بعد تشہد کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ صحیح مسلم میں خود حضرت عمران کی اسی روایت میں تشہد کا ذکر نہیں۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ ترمذی کی اس روایت میں تشہد کا لفظ شاذ ہے جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے کہا۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فی الجملہ تشہد کا ذکر ثابت ہے۔ جمہور کے نزدیک سلام سے پہلے سجدہ سو ہو تو تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں، البتہ اگر سلام کے بعد سجدہ سو کیا جائے تو اختار ہے خواہ تشہد پڑھے یا نہ پڑھے۔

(۲۶۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَذَرْكُمْ صَلَّى أَمَّا لَا أَمْ أَرْبَعًا؟ فَلْيُطْرَحِ الشَّكُّ، وَلْيَبْنِ عَلَى مَا اسْتَبَقَنَ، ثُمَّ يَسْجُدْ»

سَجَدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، فَإِنْ كَانَ صَلَّى خَمْسًا شَفَعْنَ لَهُ صَلَاتَهُ، وَإِنْ كَانَ صَلَّى تَمَامًا غَانَا نَزْعِيمًا رَكَعَاتٍ كُفَّتْ بِنَادِيهِ (چھ بنا دیں گے) اور اگر وہ پہلے ہی پوری نماز پڑھ چکا ہے تو یہ دو سجدے لِلشَّيْطَانِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

شیطان کیلئے باعث ذلت و رسوائی ہوں گے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ”فلم یدر“ را کے نیچے کسر۔ درایہ سے ماخوذ ہے مگر حرف علت (ممرہ) حذف ہو گیا ہے مضارع پر لم کے داخل ہونے کی وجہ سے۔ معنی اے علم نہیں، اے معلوم نہیں۔ ”فلیطرح“ چھوڑ دے، ترک کر دے، دور پھینک دے۔ ”ولین“ بناء سے ماخوذ ہے۔ ”علی ما استیقن“ جس پر یقین ہو۔ مثلاً جب اسے شک ہوا کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار۔ تو اس صورت میں اسے تین شمار کرنی چاہیں اور چوتھی کو پورا کرنے کیلئے کھڑے ہو کر ایک رکعت مزید پڑھ لے۔ ﴿فان كان صلى خمسا﴾ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ نمازی چار رکعت والی نماز پڑھے گا۔ ”شفعن صلاته“ تو دو سجدے نماز کو جفت بنا دیں گے اور یہ سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہوں گے۔ شفع وتر کے مقابلہ میں یعنی وتر کے معنی طاق جو جوڑا نہ بن سکے اور شفع کا معنی جفت جو جوڑا بن سکے۔

”تماما“ تماما سے مراد چار رکعت جو نمازی کو مطلوب ہیں۔ ”ترغیما تذلیلا“ اور اہانۃ کے معنی میں ترغیم و راصل تو ناک کا مٹی کے ساتھ رگڑنا، خاک آلود کرنا، خاک آلودگی، ذلت، رسوائی اور اہانت کے معنی میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نمازی کو رکعات کی تعداد میں اشتباہ پڑ جائے تو اسے کم پر بنا رکھنی چاہئے۔ اس میں یقین کا امکان ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نماز میں شک واقع ہونے کی صورت میں اسے تحری کرنی چاہئے۔ یعنی یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر دیکھے اگر گمان غالب کسی طرف ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور اگر تحری کے باوجود دونوں اطراف مساوی نظر آئیں تو پھر کم پر بنا رکھے۔

(۲۶۶) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَحَدَتْ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَتَنَى رَجُلِيهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ سلام پھیرا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول (ﷺ) کیا نماز میں کوئی نئی چیز رونما ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا ”وہ کیا ہے؟“ انہوں نے عرض کیا آپ نے تو اتنی نماز ادا فرمائی ہے۔ ابن مسعود کا بیان ہے کہ آنحضور نے اپنے دونوں پاؤں دوہرے کئے (اور

ان پر بیٹھ گئے) اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا ”اگر نماز میں کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہوئی تو میں خود تمہیں اس سے باخبر کرتا۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ میں بھی انسان ہوں، اسی طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم لوگ بھول جاتے ہو، لہذا جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کرا دیا کرو اور تم میں سے جب کسی نماز میں شک واقع ہو جائے تو صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کر لے پھر اپنی نماز اس بنیاد پر مکمل کر لے۔ پھر دو سجدے کر لے۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”(پہلے) نماز مکمل کرنی چاہئے پھر سلام پھیرے اور پھر سجدہ کرے“ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ سو سلام و کلام کے بعد کئے ہیں۔

مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں مروی عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت میں ہے کہ جس شخص کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرنے چاہئیں۔ (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انا بشر مثلکم کے الفاظ اپنے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی اصلاح کرنی چاہئے جو بشریت رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں اور قرآنی نصوص صریحہ کی یہ تاویل کرتے ہیں جو سراسر باطل اور لغو ہے کہ قرآن مجید میں تو منکروں کو خاموش کرنے کیلئے بشر کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت تو وہ بشر نہیں تھے بشریت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، لیکن ان عقلمندوں سے ذرا کوئی پوچھے کہ اس حدیث میں جن لوگوں کو (انا بشر کم مثلکم) کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں کیا وہ بھی کافر تھے کہ انہیں خاموش کرانا مقصود تھا یا وہ اہل ایمان صحابہ کرامؓ تھے جن کی صداقت ایمانی پر قرآن خود شاہد ہے۔

اس حدیث میں تحوی الی الصواب کا حکم ہے۔ تحری دراصل وہ ہے جسے عبدالرحمن بن عوف

ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «إِنَّهُ لَوْ حَدَّثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ، وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أُنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيَتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ». مَقْنُ عَلَيْهِ.

وَفِي رَوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «فَلْيَتِمَّ، ثُمَّ يُسَلِّمُ، ثُمَّ يَسْجُدُ». وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ سَجْدَتَيْ السَّهْوِ بَعْدَ السَّلَامِ وَالْكَلامِ.

وَلِأَحْمَدَ وَأَبْنِ دَاوُدَ وَالتَّسَائِي مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ مَرْفُوعاً: مَنْ شَكَّ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خَزِيمَةَ.

ﷺ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ نمازی کو اگر ایک اور دو میں شبہ ہو تو ایک کو یقین سمجھے اور دو اور تین میں شک لاحق ہو تو دو رکعت کو درست قرار دے اور تین اور چار میں اگر اشتباہ پڑ جائے تو تین کو یقینی تصور کرے اور نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے سو کے کر لے۔ نیز یہ بھی مسئلہ معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کی اتباع کرنی چاہئے خواہ امام بھول ہی کیوں نہ جائے۔ البتہ بھولنے کی صورت میں مقتدی امام کو سبحان اللہ کہہ کر متنبہ کرنے کی کوشش ضرور کریں۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما﴾ ابو جعفر ان کی کنیت ہے۔ عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب نام ہے۔ ان کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا۔ ہجرت حبشہ کے دوران اسلام میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے تھے۔ ۷ھ کے اوائل میں اپنے والد کے ہمراہ مدینہ میں واپس آئے۔ بڑے سخی، بہادر، پاک دامن اور خوش مزاج تھے۔ کثرت سے سخاوت کرنے کی وجہ سے بحر الجود (سخاوت کا سمندر) کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ۸۰ھ میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۲۶۷) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ حَدَّثَنَا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ، فَقَامَ فِي الرُّكْعَتَيْنِ، فَاسْتَمَّ قَائِمًا، فَلْيَمْضِ، وَلَا يَعُودْ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَمَّ قَائِمًا سَجَدَ سَجْدَةً وَاحِدَةً، وَلَا سَهْوًا عَلَيْهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”تم میں سے جب کسی کو دو رکعتوں میں شک پیدا ہو جائے اور کھڑا ہو جائے بلکہ بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے تو اسے جاری رکھے اور واپس نہ لوٹے بعد میں اسے دو سجدے سو کے کر لینے چاہئیں اور اگر بالکل سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے تو اس صورت میں اس پر سجدہ سجدہ (اسے ابو داؤد اور ابن ماجہ اور دارقطنی نے سنید ضعیف۔ یہ الفاظ بھی اسی دارقطنی کے ہیں۔ اس کی سند ضعیف ہے)

۳۳۲

لغوی تشریح: ”فقام فی الرکعتین“ یعنی پہلے تشهد میں نہ بیٹھے۔ ”فاستم قائما“ پوری طرح سیدھا کھڑا ہو جائے۔ ”ضعیف“ اس لئے ضعیف ہے کہ اس روایت کے تمام طرق جابر جھنی پر مدار رکھتے ہیں اور یہ سخت ضعیف ہے۔

(۲۶۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حَدَّثَنَا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «كُلُّ مُقْتَدِيٍّ عَلَى سَبْعَةِ سَجَدَاتٍ سَوَاءٌ كَانَ أَمَامَ إِمَامٍ أَوْ لَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”کسی مقتدی پر سجدہ سجدہ سو نہیں ہے۔ ہاں اگر امام

«لَيْسَ عَلَى مَنْ خَلَفَ الْإِمَامَ سَهْوٌ، بَهْلُولُ جَاءَ تَوْطِئُ امَامٍ اُورِ مَقْتَدِي دُونُوں پَر سَجْدَهٗ سَو قَانِ سَهَا الْإِمَامُ فَعَلَيْهِ وَعَلَى مَنْ هِيَ» (اسے بزار اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ خَلَفَهُ. رَوَاهُ الْبَزَّازُ وَالْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: "ضعیف" یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی خارجہ بن معب ہے جو ضعیف ہے۔

(۲۶۹) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ ثَوْبَانِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَے مَرُوں هِے كَهْ نَبِی ﷺ نَے تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا كَهْ "هر سَو كِلَے دَو سَجْدَهٗ هِیں جَو سَلَام پَھیرنے لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا كَعْد هِیں۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ دونوں نے يُسَلِّمُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ﴾ اس سے دو مسئلے مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز میں جتنی بار بھول ہوئی ہے تو ہر بھول کے عوض دو سجدے کئے جائیں۔ لیکن یہ حدیث چونکہ ضعیف ہے اس لئے اس سے احتجاج و استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ ذوالیدین والی حدیث اس کے معارض ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور پھر ناداستہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے تو انہوں نے دو سجدے ہی کئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ سجدہ سو کا موقع و محل سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ سجدہ سو کے محل وقوع میں احادیث مختلف ہیں۔ اس باب کی دو احادیث جو عبد اللہ بن جبینہ اور ابوسعید الخدری سے مروی ہیں ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سو سلام پھیرنے سے پہلے مسنون ہے اور ذوالیدین اور عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن جعفر کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ سو کا محل اور موقع سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر ائمہ کرام کی آراء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ہر قسم و نوع کا سجدہ سو صرف سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے سلام سے پہلے سجدہ کر لے اور چاہے سلام پھیرنے کے بعد کر لے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر سجدہ نماز میں کسی اضافہ کی وجہ سے کیا جائے تو پھر سلام پھیرنے کے بعد ہے اور اگر نماز میں کسی کمی واقع ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ کسی حدیث میں جس موقع پر جس طرح سجدہ ثابت ہے اسی طرح کرنا چاہئے۔ باقی کے بارے میں قیاس نہیں کیا جائے گا۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس سو میں آنحضرت ﷺ نے پہلے سجدہ سو کیا وہاں پہلے اور جہاں بعد میں کیا وہاں بعد میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ نمازی کو اختیار ہے خواہ سلام سے پہلے کرے یا بعد میں۔ دونوں طرح درست ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی سند

میں اختلاف ہے اور اسماعیل بن عیاش متکلم فیہ ہے۔ جب یہ شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور یہ روایت بھی شامیوں سے ہے اور ایک اور راوی ابوبکر بن عیاش اس میں ضعیف ہے۔ امام اثرم نے تو فرمایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ذوالیدین کی حدیث اس کے برعکس ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

(۲۷۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَجَدْنَا مَعَ رَسُولِ إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ وَسُورَةُ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. سورة اقراء باسم ربك (سورة علق) میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدہ تلاوت کیا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے سجدہ تلاوت کا مشروع ہونا ثابت ہے۔ اس کی مشروعیت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے وجوب میں اختلاف آراء ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ سجدہ تلاوت مسنون ہے، واجب نہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ سجود قرآن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورہ ص اور مفصل کی سورتوں میں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفصل سمیت چودہ سجدے ہیں۔ سورہ حج کے پہلے سجدے کے تو قائل ہیں مگر دوسرے کے قائل نہیں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک سورہ حج کے دونوں سجدوں سمیت کل پندرہ ہیں اور زیادہ وزنی اور قائل ترجیح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲۷۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: (ص) لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ، وَقَدْ رَأَيْتُ اَلْبَتَّةَ فِيْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كُو اس میں سجدہ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَسْجُدُ فِيْهَا. رَوَاهُ كَرْتِي دِيْكَهَآ۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ص﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ سورہ ص میں سجدہ تلاوت ہے۔ ﴿لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ﴾ یعنی یہ ان سجدوں میں سے نہیں ہے جن کے کرنے کیلئے تاکید کی گئی ہے، بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام سے جس سجدے کے کرنے کا ذکر ہے، اس میں صرف خبر و اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی اقتداء کے طور پر سجدہ کیا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿فَسَبِّحْهُمَ اقْتَدِهْ﴾ (ان کی راہ راست کی اقتداء کر) کی تعمیل میں۔ اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ مسنون اعمال میں بعض کی زیادہ تاکید ہے اور بعض کی کم۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ سورہ ص میں تو آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا ہے، البتہ آپؐ نے اس کا حکم نہیں فرمایا اور اس کی تاکید نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال اگرچہ مسنون ہیں، مگر ان کے بارے میں تاکید نہیں۔ وہ بھی سنت خیر الانام کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۲۷۲) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورہ نجم میں سجدہ تلاوت کیا۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سے سورہ نجم کا سجدہ مشروع ہے۔ جو مفصل میں سجدہ تلاوت کے قائل نہیں انہیں غور کرنا چاہئے۔

(۲۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَضِيَ عَنْهُ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَرَأْتُ عَلَى نَبِيِّ ﷺ کے روبرو سورہ النجم کی قرأت کی، مگر النَّبِيُّ ﷺ النِّجْمَ، فَلَمْ يَسْجُدْ فِيهَا۔ آپؐ نے اس میں سجدہ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری و متفق علیہ۔ مسلم)

حاصل کلام: نبی کریم ﷺ کا سورہ نجم میں سجدہ نہ کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ النجم کا سجدہ مشروع نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ اس میں کبھی سجدہ آپؐ نے چھوڑ بھی دیا ہے۔ یہ وجود قرآن کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر واجب ہوتا تو پھر کبھی نہ چھوڑتے۔ کبھی کر لینا اور کبھی نہ کرنا ہی اس کے سنت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ لہذا جسور کا مسلک ہی صحیح ہے۔

راوی حدیث: (زید بن ثابت رضی اللہ عنہ) ابوسعید ان کی کنیت تھی یا ابو خاربہ۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ وحی کی سب سے زیادہ کتابت یہی کیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ میں فرائض یعنی میراث کے بڑے ماہر تھے۔ خندق کا معرکہ وہ پہلا معرکہ ہے جس میں یہ شریک ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کی خدمت انہی نے انجام دی تھی اور عہد خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کی نقول بھی انہی نے تیار کی تھیں۔ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں یہود کا رسم الخط صرف پندرہ دن میں سکھ لیا تھا اور وہی آپؐ کے خطوط تحریر کیا کرتے تھے۔ کتابت کے بعد آپؐ کو پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ ۳۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مدینہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ وفات پائی۔

(۲۷۴) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورہ رَضِيَ اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: فَضَّلْتُ حج کو دو سجدہ تلاوت کی وجہ سے فضیلت دی گئی سُورَةُ الْحَجِّ بِسَجْدَتَيْنِ۔ (رواہ أبو داؤد ہے۔ اس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے) اور احمد فی الترمذی، ورواہ أحمد والنسائی مؤصلاً اور ترمذی نے عقبہ بن عامر کی حدیث سے اسے من حیدر عقبہ بن عامر، ورواہ: مَنْ لَمْ موصول قرار دیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے۔ جس

يَسْجُدُهَا فَلَا يَقْرَأُهَا. وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ. نے اس سورہ کے دونوں سجدے نہ کئے وہ اسے نہ

پڑھے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿فصلت﴾ غائب کا صیغہ ہے۔ تفضیل سے ماخوذ ہے۔ باب لفعیل ہے۔ مبنی للمفعول ہے۔ ﴿فی المراسیل﴾ سے مراد کتاب المراسیل ہے اور سنن کی کتب میں موصول بیان ہوئی ہے۔ ﴿ومن لم يسجدهما﴾ سورہ حج کے دونوں سجدے جس نے نہ کئے۔ ﴿فلا يقرأها﴾ تو پھر وہ سورہ حج نہ پڑھے اور اصول کی کتابوں میں تثنیہ کے ساتھ ہے یعنی ﴿فلا يقرأهما﴾ یعنی دونوں آیات سجدہ نہ پڑھے۔ ﴿وسنده ضعيف﴾ اس کی سند میں ابن لھیعہ نامی راوی ہے اس لئے یہ ضعیف ہے۔ لیکن اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ شیخ عبد اللہ مبارک پوری نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجہ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو (مراعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ج ۲ ص ۱۳۸۔ طبع اول) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو مراسیل ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ سنن ابی داؤد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورہ حج کے دونوں سجدے کرنے چاہئیں۔ نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ پھر اسے پڑھے ہی ناں۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے اور سجدہ تلاوت کرنا مسنون ہے۔ ترک سنت سے بہتر ہے کہ مستحب عمل ہی نہ کرے یعنی اس کی تلاوت نہ کرے، تاکہ ترک سنت کا مرتکب نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرامؓ سورہ حج میں دونوں سجدے کرتے تھے، اس لئے اس روایت کو ناقابل عمل کہنا غلط ہے۔

راوی حدیث: ﴿خالد بن معدان رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ کلاعی (کاف پر فتح) ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے۔ فقہاء تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہؓ سے ملاقات کی ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ یا ۱۰۸ھ میں ہوئی۔ معدان کے میم پر فتح اور عین ساکن ہے۔

(۲۷۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّا نَمُرُّ بِالسُّجُودِ، فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ أَصَابَ، وَمَنْ لَمْ يَسْجُدْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لوگو! ہم آیات سجدہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری) اور مؤطا میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا مگر قاری اگر چاہے تو کر سکتا

وَفِيهِ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَقْرِضْ هِ السُّجُودَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ. وَهُوَ فِي الْمُوَطَّأِ.

لغوی تشریح: ﴿لَمْ يَفْرُضِ السُّجُودَ﴾ فرض، یفرض باب ضرب یضرب سے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اسے فرض نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول اس کی دلیل ہے کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

حاصل کلام: بعض نسخوں میں ان یشاء کی جگہ ان نشاء جمع کے صیغہ سے بھی منقول ہے (ہم چاہیں تو سجدہ کریں) یعنی قاری کو اختیار ہے، فرض و واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا۔ سامعین صحابہ سب خاموش رہے۔ اس سے اجماع سکوتی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز لم یفرض اور ان یشاء بھی اس کی تائید مزید ہے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ اہلحدیث بھی سجدہ تلاوت کو مسنون ہی قرار دیتے ہیں مگر احناف اسے واجب کہتے ہیں۔

(۲۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَفْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ، فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ، وَسَجَدْنَا مَعَهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ يَسْتَدِلُّ فِيهِ لَيْثٌ.

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے جب آیت سجدہ پر سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہی سجدہ کرتے۔ (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فِيهِ لَيْثٌ﴾ لام کے نیچے کسرہ اور ”ياء“ ساکن۔ معنی ضعف اور کمزوری، کیونکہ اس روایت کی سند میں عبد اللہ عمری ہے جو ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت کیلئے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرنا مشروع ہے۔ حاکم نے اس روایت کو عبید اللہ عمری کے حوالہ سے نقل کیا ہے جسے انہوں نے ثقہ کہا ہے اور اس حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے اور ابوداؤد کی روایت جسے متن میں بیان کیا گیا ہے عبد اللہ اکبر کی ہے، وہ ایک ضعیف راوی ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ سامع پر بھی سجدہ مشروع ہے خواہ نماز میں مصروف و مشغول ہو۔ سجدہ تلاوت کیلئے طہارت ضروری اور لازمی نہیں تاہم طہارت کا ہونا بہتر اور افضل ہے۔ عبد اللہ بن عمرؓ، شعبیؒ اور ابن حزمؒ طہارت کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔ سجدہ تلاوت میں یہ دعا پڑھنی چاہئے: سجد وجہی للذی خلقہ وصورہ وشفق سمعہ وبصرہ وبحولہ وقوتہ ”میرا سر اس ذات کے سامنے جھک گیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت دی اور اسکو سماعت عطاء کی اور بینائی سے نوازا۔ طاقت و قوت بھی عنایت کی۔“ اور ایک روایت میں فتبارک اللہ واحسن الخالقین بھی منقول ہے۔

(۲۷۷) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ يَسْرُهُ خَرَّ سَاجِدًا لِلَّهِ. رَوَاهُ الْحَمَمَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی خوشخبری ملتی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑتے۔ (نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے)

لعفی تشرح: ﴿یسرہ﴾ ایسا کام جو آپؐ کی خوشی، فرحت و سرور اور بشارت کا باعث ہوتا۔ ﴿خو﴾ گر پڑتے۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی نعمت کے حصول اور ناپسندیدہ کام سے بچنے کے موقع پر سجدے میں گر پڑتے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے سجدوں کیلئے با وضو ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے طہارت شرط نہیں۔

حاصل کلام: کسی نئی نعمت کے حاصل ہونے پر، کسی مصیبت سے بچ نکلنے پر، کسی خوشی و مسرت کے موقع پر سجدہ شکر بجالانا شریعت سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں اور نہ مکروہ۔ حدیث سے تائید امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی ہوتی ہے۔

(۲۷۸) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَطَالَ السُّجُودَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَقَالَ: إِنَّ جِبْرِيلَ أَتَانِي، كَرَمِيرَةٍ بِأَسَاسِ تَوَدُّهُ مَرْدَةً سَنَ كَرَمِيٍّ فِي اللَّهِ فَتَسْرِنِي، فَسَجَدْتُ لِلَّهِ شُكْرًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا پھر سجدے سے سر اٹھا کر فرمایا کہ ”ابھی جبریلؑ ایک خوشخبری لے کر میرے پاس آئے تو وہ مردہ سن کر میں نے اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: سند احمد میں یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اور اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ بشارت اور خوشخبری یہ تھی کہ جو شخص حضور ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں اپنی طرف سے نازل فرمائے گا۔ یہ خوش کن اطلاع پا کر حضور ﷺ سجدہ میں گر پڑے اور شکر یہ ادا کیا۔ لہذا جب کسی کو ایسا موقع پیش آجائے تو اسے بھی سجدہ شکر ادا کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ قریش کے زہرہ قبیلہ سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ بدر واحد کے علاوہ باقی سب غزوات وغیرہ میں شامل رہے۔ ان کا شمار ان خوش قسمت دس انسانوں میں ہوتا ہے جنہیں رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ ان چھ افراد میں سے ایک تھے جنہیں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے نامزد فرمایا تھا۔ عہد نبوی میں انہوں نے ایک مرتبہ چار ہزار اور پھر چالیس ہزار دینار صدقہ و خیرات کئے پھر انہوں نے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جہاد کیلئے پیش کئے۔ امہات المؤمنینؓ کیلئے اپنے ایک حصہ کی وصیت کی کہ ان کی نذر کر دیا جائے، اس کی بعد میں قیمت لگوائی گئی تو وہ چار لاکھ دینار تھی۔ ۳۴ھ میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

(۲۷۹) وَعَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ سَجَدَ لِي سَجْدَةً، كَرَمِيرَةٍ بِأَسَاسِ تَوَدُّهُ مَرْدَةً سَنَ كَرَمِيٍّ فِي اللَّهِ فَتَسْرِنِي، فَسَجَدْتُ لِلَّهِ شُكْرًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا۔

بَعَثَ عَلِيًّا إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ. قَالَ: فَكُتِبَ عَلَيَّ بِإِسْلَامِهِمْ، فَلَمَّا قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْكِتَابَ خَرَّ سَاجِدًا، شُكْرًا لِلَّهِ عَلَى ذَلِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَأَضْلَفَهُ فِي الْبَحَارِيِّ.

راوی نے حدیث بیان کی جس میں اس نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کے اسلام میں داخل ہونے کی روداد حضور ﷺ کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وہ مکتوب پڑھا تو آپ اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ ریز ہو گئے۔ (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے)

حاصل کلام: آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں اہل یمن کے اسلام قبول کرنے پر سجدہ شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ باعث خوشی اور مقام مسرت ہے اور یہ بھی ایک عظیم نعمت الہی ہے اس لئے بطور شکر یہ سجدہ شکر بجالانا مشروع ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی کثرت تعداد باعث مسرت اور موجب انبساط ہوا کرتی تھی اور ایک یہ دور ہے کہ مسلمان بچوں کی پیدائش روکنے کی شب و روز سکیمیں اور عملی تدبیریں بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زور و شور سے اس مہم کو چلایا جا رہا ہے اور کروڑہا روپیہ اسے کامیاب بنانے پر صرف کئے جا رہے ہیں۔

نفل نماز کا بیان

۹ - باب صَلَاةِ التَّطَوُّعِ

(۲۸۰) عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ كَعْبٍ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «سَلْ»، فَقُلْتُ: أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ: «أَوْ غَيْرَ ذَلِكَ؟» فَقُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: «فَأَعْنِي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ نے مجھے (مخاطب کر کے) فرمایا ”مانگ لے (جو کچھ مانگنا ہے)“ میں نے عرض کیا میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ آپ نے فرمایا ”کچھ اس کے علاوہ مزید بھی۔“ میں نے عرض کیا بس وہی مطلوب ہے۔ آپ نے فرمایا ”تو پھر اپنے مطلب کے حصول کیلئے کثرت سجدہ سے میری مدد کر۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة التطوع﴾ یعنی نفلی نماز۔ اور نفلی عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے ہی کوئی عبادت کرے جو کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے فرض نہیں کی گئی۔ ﴿سل﴾ سوال سے صیغہ امر ہے۔ معنی ہے کہ طلب کرو، مانگو۔ ﴿مرافقتک﴾ رفاقت و مصاحبت۔ ﴿فاعنی﴾ یہ ”اعانہ“ سے امر کا صیغہ ہے اور اس میں ”یا“ یاء متکلم ہے۔ ﴿علی نفسک﴾ یعنی اپنے جی کی خواہش و مراد

کے حصول کیلئے۔ ﴿بِكُشْرَةِ السُّجُودِ﴾ سجود سے یہاں نفل نماز مراد ہے۔ بعض نوافل کثرت سے پڑھا کر۔ سجدہ کی کثرت تو کثرت نماز کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کثرت یا قلت تو نفل نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔ (فرائض میں تو کمی بیشی ناممکن ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سجدہ سے مراد نفل نماز ہی ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ کو سارے ارکان نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ سجدہ تقرب الہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرب الہی اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کیلئے کثرت سے نوافل ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو اتباع سنت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر نوافل سے اتنی رغبت نہیں جتنی تاکید ان کے بارے میں معلوم ہوتی ہے اور کچھ لوگ تو زبانی عاشق رسول ہونے کے دعویدار ہیں مگر نفل تو کچا فرائض بھی نہیں پڑھتے، رہتے پھر بھی وہ عاشق رسول ہی ہیں بلکہ نادان اور بے علم و جاہل لوگوں نے ان کو رتبہ ولایت پر بٹھا رکھا ہے جنہوں نے کبھی نماز پڑھ کر نہ دیکھی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابو فراس ان کی کنیت ہے۔ اسلم قبیلہ سے تھے اس لئے اسلمی کہلائے۔ اصحاب صفہ میں سے تھے، مدینہ کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضور سفر میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكَعَاتٍ: رَكَعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرَبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكَعَتَيْنِ قَبْلَ الصُّبْحِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رَوَايَةٍ لَّهُمَا: وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ فِي بَيْتِهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی ﷺ کی دس رکعتیں یاد ہیں۔ دو رکعتیں ظہر کی نماز سے پہلے اور دو بعد میں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر پر ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح دو رکعتیں عشاء کی فرض نماز کے بعد گھر پر اور دو رکعتیں صبح سے پہلے۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں یہ بھی ہے کہ دو رکعتیں نماز جمعہ کی (فرض) نماز کے بعد گھر پر پڑھتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ لَا يُصَلِّي إِلَّا رَكَعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

اور مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ صبح صادق کے بعد صرف ہلکی سی دو رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کی صرف دو رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور دو رکعتیں بعد کی ثابت ہوتی ہیں اور دوسری حدیث سے چار پہلے اور دو بعد میں کا ثبوت بھی موجود ہے۔

(۲۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَدْعُ أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ چھوڑیں اور دو رکعتیں نماز فجر کی بھی نہیں قَبْلَ الْغَدَاةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. چھوڑیں۔ (بخاری)

لعوی تشریح: ﴿لَا يَدْعُ﴾ نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ جملہ بیہنگی اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال اس سے مراد یہ ہے کہ ان رکعات کو بکثرت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ﴿اربعاً قبل الظهر﴾ ظہر سے قبل چار رکعتیں۔ یہ اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے خلاف ہے (اس میں دو رکعتوں کا ذکر ہے اور اس میں چار کا) دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ آپؐ نے کبھی ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو ادا فرمائی ہیں۔ اس جگہ صرف دونوں صورتوں کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ کی خبر دی گئی ہے کہ آپؐ کا طرز عمل دونوں طرح تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سننِ رواتب میں سے نہیں بلکہ یہ تو زوال کا سایہ ڈھلنے کے وقت کی نماز تھی اور یہ ایسی گھڑی تھی جس میں آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھتا ہے جیسا کہ بزار نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ جب یہ نماز گھر پر ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب ان کو مسجد میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ راوی نے جو کچھ جس شکل میں ملاحظہ کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے۔ پہلی صورت بہتر اور عمدہ ہے۔ ﴿قبل الغداة﴾ نماز فجر سے پہلے۔

حاصل کلام: روز و شب میں نبی کریم ﷺ فرائض کے علاوہ کچھ نوافل بھی ادا فرمایا کرتے تھے جن کا زیادہ اہتمام فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ ان کو سنت مؤکدہ اور جن پر دوام اور بیہنگی نہیں فرمائی ان کو سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا نام دے دیا گیا۔ ہیں یہ سب نوافل ہی۔ اس حدیث میں ظہر کے فرائض سے پہلے چار رکعت کا ذکر ہے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو پہلے گزری ہے دو رکعتیں پہلے اور دو بعد میں ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں میں تطبیق کی صورت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر سے قبل دو رکعتیں قابلِ ترجیح ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چار رکعات قابلِ ترجیح ہے۔ اس سلسلہ کی ساری روایات سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا عمل دونوں طرح تھا۔ اس کے باوجود چار پڑھنا دو کے مقابلہ میں زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

(۲۸۳) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُداً مِنْهُ عَلَى رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. اور مسلم میں ہے کہ نماز فجر کی دو (رکعتیں) (سنتیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نوافل میں سے سب سے زیادہ اہتمام فجر کی دو سنتوں کا رکھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ: «رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنْ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا».

لغوی تشریح: ﴿علی شئی﴾ کسی چیز کی اتنی حفاظت نہیں کرتے۔ ﴿اشد﴾ اکثر کے معنی میں یعنی بہت زیادہ۔ کثرت کے ساتھ۔ گرائمر میں یہ یا تو لم یکن کی خبر واقع ہو رہا ہے یا حال یا پھر مصدر اور اس صورت میں علی شئی کی خبر ہوگی۔ ﴿تعاهدا﴾ تحفظ کرنے اور اہتمام کرنے کے معنی میں۔ ﴿منہ﴾ اس سے (معنی یہ ہے کہ آپ کے کسی چیز کا اہتمام و تحفظ کرنے کی بہ نسبت) یعنی نبی ﷺ کا فجر کی دو سنتوں پر التزام و دھیان دوسری سنتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس میں شک کی ذرا برابر گنجائش نہیں کہ حضور ﷺ نے سنن رواتب میں سے فجر کی دو سنتوں کا جتنا التزام فرمایا اتنا دوسری سنتوں کا اہتمام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضور سفر میں بھی انہیں کبھی نہیں چھوڑا۔ ان دو سنتوں کی اتنی تاکید کے پیش نظر احناف نے تو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود ان کو پہلے پڑھنا لازمی قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ صراحتاً حدیث کے مخالف ہے کیونکہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے دوسری کوئی نماز پڑھنا درست نہیں۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے کہ اذا اقيمت الصلوة فلا صلاة الا المكتوبة ”کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں۔“

(۲۸۴) وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ امِّ الْمُؤْمِنِينَ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ هَبَّ أَنْ يَكُونَ فِي رَكْعَةٍ نَوَافِلَ صَلَّى اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً فِي يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ بُنِيَ لَهُ بِهِنَّ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ». (مسلم) اور ایک روایت میں تطوعاً بھی (نفل کے طور پر پڑھے) رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ: «تَطَوُّعًا».

اور ترمذی کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اتنا اضافہ بھی ہے کہ ”چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت بعد میں اور دو رکعت نماز مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت صبح کی نماز سے پہلے۔“

اور پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت کیا ہے کہ ”جس شخص نے ظہر کی پہلی چار رکعتوں کی حفاظت کی اور چار رکعت بعد میں باقاعدگی سے پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آتش جہنم پر حرام کر دیا۔“

لغوی تشریح: ﴿وَاللَّحْمَةُ عَنْهَا﴾ عنہا کی ضمیر راجع ہے حضرت ام حبیبہؓ کی طرف یعنی پانچوں نے ان کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے ﴿وَارْبَعٌ بَعْدَهَا﴾ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ دو سنتیں پڑھنے کے بعد چار مزید مراد ہوں یعنی ظہر کے بعد چار رکعات اور یہ بھی احتمال ہے کہ دو پہلے جو عام طور پر پڑھی جاتی ہیں اور دو مزید ان میں شامل کر لی جائیں تو یہ چار بن جائیں گی ﴿حَرَمَهُ اللَّهُ﴾ تحریم سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کی آگ میں داخل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب و روز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان پر التزام کرنا چاہئے کیونکہ نبی ﷺ نے ان پر اہتمام فرمایا ہے۔ ظہر کی فرض نماز کے بعد دو کی بھی گنجائش اور چار کی بھی۔ چار کی فضیلت بڑی بیان ہوئی ہے اور اگر کوئی چھ پڑھ لیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ام حَبِيبَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا﴾ ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں اور ہجرت حبشہ کرنے والوں میں شامل تھیں۔ ان کا شوہر عبید اللہ بن جحش بھی ان کے ساتھ تھا مگر وہ وہاں جا کر نصرانی بن گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ یہ نکاح کے وقت وہیں حبشہ ہی میں تھیں۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں۔ ۴۲ھ یا ۴۳ھ یا ۵۰ھ میں فوت ہوئیں۔

(۲۸۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «رَحِمَ اللَّهُ أَمْرًا صَلَّى أَرْبَعًا» (اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی و الترمذی، وَحَسَنُهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَصَحَّحَهُ۔) (اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: نماز عصر سے پہلے یہ چار رکعتیں سنن رواتب (موکدہ سنتیں) نہیں ہیں بلکہ نفل ہیں۔ اس کی فضیلت پر رحم اللہ امرا کے دعائیہ کلمات دلالت کرتے ہیں کہ جو یہ چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

(۲۸۶) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُعَفَّلٍ الْمُرَبِّيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ، صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ»، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: لِمَنْ شَاءَ، كَرَاهِيَةً أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً. رواه البخاري.

حضرت عبداللہ بن مغفل بن مغل مزی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ”مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ مغرب سے پہلے نماز پڑھو پھر تیسری مرتبہ فرمایا یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو پڑھنا چاہے“ آپؐ نے یہ اس اندیشہ کے پیش نظر فرمایا کہ لوگ اسے سنت نہ بنا لیں۔“ (بخاری)

وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ جَبَّانَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى قَبْلَ الْمَغْرَبِ رَكَعَتَيْنِ . وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرَانَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا، وَلَمْ يَنْهَنَا .

ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعت ادا فرمائیں اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غروب شمس کے بعد (فرض نماز سے پہلے) دو رکعت پڑھتے تھے اور نبی ﷺ ہمیں ملاحظہ فرما رہے ہوتے تھے، نہ تو آپ ہمیں اس کا حکم دیتے اور نہ منع فرماتے۔

لغوی تشریح: ﴿لَمِنْ شَاءَ﴾ یعنی یہ حکم اس شخص کیلئے جو پڑھنا چاہے ﴿کَراہیۃ﴾ تعلیل کی وجہ سے منسوب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے لَمِنْ شَاءَ اس لئے فرمایا کہ آپؐ کو یہ اندیشہ تھا ﴿اِنْ يَتَخَذَهَا النَّاسُ﴾ کہ لوگ اسے چھ بنالیں۔ ﴿سُنَّة﴾ ہمیشہ کیلئے مسنون طریقہ اور اسے چھوڑنا ناپسند کریں۔ اس سے یہ معنی نہیں کہ آپؐ نے اس کے استحباب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو کام مستحب بھی نہ ہو اس کے لئے براہِ گنہتہ کیا جائے اور اس میں ترغیب دی جائے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نمازِ مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب ہے اور یہ حدیث قوی ہے اور جس روایت کو ابنِ حبان نے روایت کیا ہے وہ فعلی حدیث ہے اور جو روایت مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ تقریری ہے۔ پس مغرب سے پہلے نفل پڑھنا سنت کی تینوں قسموں (قولی، فعلی، تقریری) سے ثابت ہے اور صحیح مسلم کے حوالہ سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿فَلِمَ يَأْمُرُنَا﴾ آپؐ نے ہم کو اس کا حکم نہیں دیا تو یہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایات کے منافی ہے۔ جنہیں ان کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ حکم کی روایت نہ ملی ہو یا ان کا اس سے مراد تاکید کی حکم ہو۔

حاصل کلام: مغرب کے فرضوں سے پہلے دو گانہ پڑھنا سنن زائدہ میں شمار ہوتا ہے۔ سنن موکدہ میں نہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ﴾ مزنیہ قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر مزنی کہلائے۔ مغفل میں میم پر ضمہ، عین پر فتح اور "فاء" پر فتح اور تشدید۔ یہ اصحاب شجر میں شمار کئے گئے ہیں۔ پہلے مدینہ میں رہائش رکھی۔ بعد ازاں مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ان دس اصحابؓ میں شامل تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو تعلیم دینے کیلئے بھیجا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْفُفُ الرُّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ

الصُّنْحُ، حَتَّىٰ إِنِّي أَقُولُ: أَفْرَأُ بِأَمِّ هِيَ؟ (بخاری و مسلم)
الْكِتَابُ؟ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿افرا﴾ اس میں عمرہ استغمام کیلئے اور یہاں شک و تردد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کیا آپؐ نے ام القرآن کو پڑھایا نہیں؟ اور یہ شک اس لئے واقع ہوا کہ اس میں آپؐ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ صبح کی دو سنتیں مختصر ہلکی پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور علماء نے اسی بنا پر کہا ہے کہ ان دو رکعتوں میں مختصر قیام افضل ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان میں بھی لمبا قیام افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے دو تلامذہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے بھی ان کی مخالفت کی۔ سورہ فاتحہ کے علاوہ آپؐ چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے۔

(۲۸۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ قَرَأَ فِي رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ «قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ» وَ «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کی دو رکعتوں میں سے پہلی میں قل یا ایہا الکافرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد پڑھی۔ (مسلم)

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: ان دو رکعتوں میں ان دونوں سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ اتباع سنت کے جذبہ کے تحت ان کو پڑھنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری کوئی سورہ پڑھنا ممنوع ہے۔

(۲۸۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ أَضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز فجر کی دو رکعت سنت پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿علی شقہ﴾ پہلو کے بل۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کو ادا کر کے آپؐ اپنے دائیں پہلو پر تھوڑا سالیٹ کر استراحت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں آپؐ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(۲۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ الرُّكْعَتَيْنِ»

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کوئی شخص جب نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھ چکے تو اسے اپنے دائیں پہلو

قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيُضْطَجِعْ عَلَى كَعْبِ لَيْثٍ جَانِبَيْهِ۔“ (اس حدیث کو احمد، ابوداؤد جَنِّهِ الْاَيْمَنُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابُو دَاوُدَ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے) وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ۔

حاصل کلام: ان دو احادیث سے فجر کی سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں پہلو پر تھوڑا سالیٹ کر استراحت حاصل کرنا مسنون ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے حضور ﷺ کا عمل اور دوسری سے آپؐ کا حکم ثابت ہے۔ اس بنا پر اہل الظواہر کے نزدیک یہ لیٹنا واجب ہے جو نمازی اس پر دیدہ دانستہ عمل نہیں کرتا اس کی نماز فجر نہیں ہوتی۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ بعض نے اسے مکروہ سمجھا ہے مگر صحیح حدیث کے مقابلے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا سنت کی بنا پر نہ تھا۔ آپؐ چونکہ رات کو طویل قیام کرتے اس لئے سنتوں کے بعد استراحت کے لئے تھوڑا سالیٹ جاتے۔ لیکن یہ ان کا قول سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس مسئلے پر شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق ڈالوی رحمہ اللہ نے ”اعلان اہل العصر باحکام رکعتی الفجر“ میں بڑی تفصیل سے قابل دید بحث کی ہے بلکہ صبح کی سنتوں کے متعلقہ سب مسائل کے حل کیلئے اس رسالہ سے کوئی صاحب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(۲۹۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمْ الصُّبْحَ صَلَّى رَكْعَةً وَاحِدَةً، نُورَتْ لَهُ مَا قَدْ صَلَّى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْخَمْسَةِ - وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ - بِلَفْظِ «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى». وَقَالَ النَّسَائِيُّ: تَرْمِذِي، نَسَائِيٌّ اور ابن ماجہ میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”رات کی نماز دو دو رکعت کی صورت میں (پڑھی جائے) اور جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع ہونے کا خدشہ و اندیشہ لاحق ہونے لگے تو (آخر میں) ایک رکعت پڑھ لے۔ پہلے پڑھی ہوئی اس کی ساری نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔“ (بخاری و مسلم۔ اور پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے)

اور ابن حبان نے صلاة الليل والنهار مثنیٰ مثنیٰ ”دن رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔“ کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ نسائی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿مثنیٰ مثنیٰ﴾ دو دو رکعتیں۔ یعنی ہر دو رکعت کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا جائے۔ ﴿توتر له ما قد صلى﴾ اس کی ادا شدہ نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔ ﴿هذا خطأ﴾ یعنی روایت میں

دن کا ذکر خطا ہے۔ کسی ایک راوی کا وہم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اوقات میں پڑھی جانے والی نماز کو دو، دو رکعتوں کی صورت میں پڑھنا چاہئے اور دو کے بعد سلام پھیرنا چاہئے۔ امت کی غالب اکثریت نے اسی کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک بھی ثابت ہے بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک ہی ہے۔ لیکن احادیث سے تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ تک کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

جہاں تک امام نسائی رحمہ اللہ کے لفظ النہار (یعنی دن) کو خطا کہنے کا تعلق ہے۔ ان کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ، امام ابن حبان رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی سلسلہ الصحیحین میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دن ہو یا رات نوافل دو، دو کی تعداد میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ دو دو رکعتوں کے پڑھنے کی صورت میں درود اور بعد از درود دعائیں زیادہ مرتبہ پڑھی جائیں گی۔ اس لئے ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ویسے دن کو دو، دو کر کے پڑھے یا چار، چار دونوں طرح جائز ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے دن کو چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا بھی ثابت ہے۔

ایک رکعت وتر پڑھنے کی صورت میں تو تشدد ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا۔ اگر تین بار زائد پڑھے تو کیا صورت ہوگی؟ احمد، نسائی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں تو صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ جب تین وتر پڑھتے تھے تو صرف آخری رکعت میں ہی تشدد پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ تین رکعت وتر پڑھے جائیں تو درمیان میں تشدد نہ پڑھا جائے مگر احناف رات کے وتروں کو مغرب کی تین رکعات پر قیاس کر کے دو مرتبہ تشدد پڑھنے کے قائل ہیں۔ حالانکہ وتروں کو مغرب کی نماز کی طرح پڑھنے کی ممانعت حدیث سے صراحتاً وارد ہے۔

(۲۹۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ، رَاتِ الْنَازِلَةِ» (مسلم)

صَلَاةُ اللَّيْلِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے تہجد کی نماز کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی فضیلت پر خود قرآن مجید کی شہادت کا واضح ثبوت ہے۔ کتب احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے بعد کونسی نماز افضل ہے؟ فرمایا رات کے آخری حصہ کی نماز۔ ترمذی میں عمرو بن عبسہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے پروردگار سے تمام اوقات سے زیادہ تقرب رات کے آخری حصہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بندگان خدا کو چاہئے کہ خواصان خاص کے زمرہ میں شامل

ہونے کیلئے شب بیداری کو اپنا معمول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بارگاہ رب العزت میں حاضری اور سرگوشی و مناجات کا سب سے اچھا موقع ہوتا ہے۔

(۲۹۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الْوُتْرُ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ، مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتَرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتَرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتَرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ الْأَزْهَرِيُّ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَرَوَّجَحَ النَّسَائِيُّ وَفَقَّهُ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”وتر ہر مسلمان پر حق ہے (اس کا ادا کرنا ضروری ہے) جسے پانچ وتر پڑھنا پسند ہو تو ایسا کرے اور جسے تین وتر پسند ہوں تو وہ اس طرح کرے اور جسے ایک وتر پڑھنا پسند ہو تو وہ ایسا کرے۔“ (ترمذی کے علاوہ اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے البتہ نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الوتر حق﴾ ثابت ہے۔ شریعت میں اس کا ثبوت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دادا نے المنتقی میں بیان کیا ہے کہ ابن منذر نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں۔ الوتر حق وليس بواجب کہ وتر برحق ہے مگر واجب نہیں اور یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس حدیث میں لفظ حق وتر کی مشروعیت پر دال ہے وجوب پر نہیں۔ لہذا جس نے لفظ ”حق“ کی بنیاد پر وتر کو واجب قرار دیا ہے اس کا یہ استدلال باطل ہے۔

حاصل کلام: وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے واجب کہتے ہیں مگر جمہور علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ ”وتر کا پڑھنا حق ہے“ کے الفاظ وجوب پر تو دلالت نہیں کرتے۔ البتہ اس کی اہمیت پر ضرور دال ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں بھی ہے الوتر حق فمن لم يوتر فليس منا ”وتر برحق ہے۔ جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں۔“ اس حدیث میں بھی وتروں کو پڑھنے کی تاکید بیان کی گئی ہے مگر وجوب کا بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے سفر و حضر میں وتر پڑھے ہیں اور سواری پر بھی سفر کے دوران وتر پڑھے ہیں جو اس کی دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وتر ایک، تین، پانچ سب درست ہیں۔ احناف کا صرف تین وتر پر اکتفا کرنا صحیح اور صریح روایات کی بنا پر درست نہیں۔

(۲۹۴) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الْوُتْرُ بِحَتْمٍ كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلَكِنْ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وتر فرضوں کی طرح حتیٰ اور لازمی نہیں ہے بلکہ سنت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔

سُنَّہٗ سَنَّہَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: رَوَاهُ النَّسَائِيُّ (اسے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے
والتِّرْمِذِيُّ وَحَسَنُهُ، وَالْحَاكِمِيُّ وَصَحَّحَهُ. اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

نغوی تشریح: ﴿یس بحتم﴾ حتم کے معنی واجب اور ضروری کے ہیں۔ ﴿کھیئة المكتوبة﴾ فرض نماز کی طرح لازمی نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث جمہور علماء کی دلیل ہے جو وتر کے وجوب کے قائل نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن اور امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عاصم بن ضمرہ کوئی متکلم فیہ ہے۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اعدل الاقوال ذکر کیا ہے کہ وہ صدوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انہوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ کی تحسین و تصحیح نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا۔

(۲۹۵) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَامَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، ثُمَّ انْتَبَرُوهُ مِنَ الْقَابِلَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ، وَقَالَ: إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الْوِتْرُ. رَوَاهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت جابر رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان میں قیام فرمایا پھر اگلے دن کیلئے صحابہ آپ کا انتظار کرتے رہے اور آپ حجرت سے باہر تشریف نہ لائے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ وتر کی نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ (اس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿القابلہ﴾ آئندہ آنے والی رات۔ ﴿ان یکتب﴾ فرض قرار دے دی جائے۔

یکتب یہاں مجبول واقع ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شب معراج میں جب اللہ نے پانچ نمازیں فرض قرار دے کر ثواب پچاس کے برابر رکھا اور فرما دیا کہ میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاتی تو خوف اور اندیشہ کس بات کا لاحق ہوا؟ مصنف علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح بخاری میں اس کے تین جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے: آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ نوافل جن کا رات کے اوقات میں ادا کرنا صحیح ہے کہیں ایسا نہ ہو نماز تہجد کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا مقرر کر دیا جائے یا یہ خوف لاحق ہوا کہ قیام اللیل کو فرض عین کی طرح نہ سہی بہر حال فرض کفایہ کے طور پر لازمی قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ نماز عید کے سلسلہ میں لوگوں نے کہا ہے یا پھر یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ قیام رمضان کو خصوصی طور پر فرض نہ کر دیا جائے اور اس صورت میں یہ پانچ نمازوں پر ایک زائد نماز نہ ہوئی کیونکہ سال بھر میں قیام رمضان ہر روز تو بار بار نہیں کیا جاتا۔ پھر مصنف نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری دانست میں تینوں جوابات میں سے پہلا جواب ہی قوی ہے اور یہ حدیث نماز تراویح باجماعت پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اندیشہ مذکور کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مصنف نے اس حدیث کو یہاں یہ بتانے کیلئے بیان کیا ہے کہ وتر واجب نہیں۔

ضمناً یہ مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ علم غیب نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ کو علم غیب ہوتا تو اندیشہ

اور خوف لاحق ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ نیز اس حدیث کی رو سے آپؐ نے نماز تراویح صرف ایک ہی روز پڑھائی ہے مگر دوسری احادیث میں تین رات۔ بلکہ صحیح ابن حبان میں حضرت جابرؓ ہی سے مروی ہے کہ جن تین راتوں میں آپؐ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں تراویح کی تعداد آٹھ رکعت تھی۔

(۲۹۶) وَعَنْ خَارِجَةَ بِنْتِ حُذَافَةَ حَضْرَتِ خَارِجَةَ بِنْتِ حُذَافَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَرَأِ النَّبِيُّ ﷺ فِي نَمَازٍ مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا "اللَّهُ تَعَالَى لَمْ يَرَأِ النَّبِيُّ ﷺ فِي نَمَازٍ مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا" "إِنَّ اللَّهَ أَمَدَكُمْ نَمَازَ كَيْفَ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ حُمْرٍ سَرَخٍ أَوْ نَوَاسِثٍ مِنْ بَسْتٍ بَسْتَرٍ هِيَ" "ہم نے عرض کیا النعم،" قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا اللہ؟ قَالَ: «الْوُتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ» "وتر نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ"۔ رَوَاهُ: " (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور الْحَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعيب سے وَرَوَى أَحْمَدُ عَنْ عَمْرِو بْنِ اَنَسٍ اَنَّهُمْ لَمْ يَرَوْا نَمَازًا مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا "اللَّهُ تَعَالَى لَمْ يَرَأِ النَّبِيُّ ﷺ فِي نَمَازٍ مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا" "ہم نے عرض کیا النعم،" قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا اللہ؟ قَالَ: «الْوُتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ» "وتر نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ"۔ رَوَاهُ: " (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور الْحَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعيب سے

وَرَوَى أَحْمَدُ عَنْ عَمْرِو بْنِ اَنَسٍ اَنَّهُمْ لَمْ يَرَوْا نَمَازًا مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا "اللَّهُ تَعَالَى لَمْ يَرَأِ النَّبِيُّ ﷺ فِي نَمَازٍ مَعَ تَمَامِهَا مَدَّةً فَرَمَايَا" "ہم نے عرض کیا النعم،" قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا اللہ؟ قَالَ: «الْوُتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ» "وتر نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ"۔ رَوَاهُ: " (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور الْحَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعيب سے

لَعْنَى تَشْرِيحٍ: ﴿امدکم﴾ امداد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تمہاری مدد فرمائی ﴿بصلاة﴾ ایک نماز سے۔ یعنی تمہارے لئے ایک اور نماز کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی اس کی دلیل ہے کہ وہ نماز لازم نہیں۔ اگر یہ واجب ہوتی تو عبارت بھی وجوب و التزام والی ہوتی۔ ﴿حمر النعم﴾ "حما" پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع ہے اور نعم نون اور عین دونوں پر فتح۔ چوپایہ جانور کے معنی میں اور یہاں اس سے مراد اونٹ ہے اور اہل عرب کے نزدیک اونٹ ان کے اموال میں عزیز ترین اور معزز مال شمار ہوتا تھا۔

حاصل کلام: امداد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے چیز تو موجود ہے اسے تقویت دینے کیلئے مدد دی ہے۔ اصل اور امدادی چیز کی شان یکساں تو نہ ہوگی اور نماز کو سرخ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿خارجہ بن حذافہؓ﴾ خارجہ بن حذافہ قرشی عدوی۔ (حذافہ کے حاء پر ضمہ اور ذال پر تخفیف)۔ یہ اتنے شجاع تھے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ عمرو بن عاصؓ نے حضرت عمرؓ سے تین ہزار شہ سواروں کی مدد طلب کی تو انہوں نے اس کے جواب میں تین بہادر و شجاع آدمی بھیج دیے جن میں ایک زبیر بن عوامؓ دوسرے مقداد بن اسودؓ اور تیسرے خارجہ بن حذافہؓ تھے۔ عمرو بن عاصؓ نے انہیں ایک خارجی سے کہنے پر مصر کے قاضی بنے۔ ۴۰ھ میں رمضان المبارک میں قتل ہوئے۔ انہیں ایک خارجی نے عمرو بن عاصؓ سمجھ کر قتل کیا تھا کیونکہ خوارج نے حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو بیک وقت قتل کرنے کی سازش کی تھی۔

﴿عمرو بن شعيب﴾ ابو ابراہیم ان کی کنیت تھی۔ عمرو بن شعيب بن عبد اللہ بن عمرو بن عاص سہمی

قرشی مدنی۔ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ نسائی نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔
 ﴿شعیب﴾ ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جن کا نام محمد تھا ان کے زمانہ صغریٰ میں وفات پا گئے تھے تو ان کی کفالت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے کی۔ اس سے ان کا سماع صحیح ہے۔ یہ اسناد نہ تو مرسل ہے اور نہ منقطع بلکہ متصل ہے اور حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے۔ ان کے دادا کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲۹۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت
 عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”وتر برحق
 قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْوُتْرُ ہے جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق
 حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا»۔ نہیں۔“ (ابوداؤد نے اسے کزور سند کے ساتھ نقل کیا ہے
 أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ لَيْدٍ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے احمد کے نزدیک اس کا شاید
 وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى بھی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر وہ ضعیف
 عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ۔ (ہے)

لغوی تشریح: ﴿الوتر برحق﴾ حق کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں کہ یہ لفظ وجوب پر دلالت نہیں کرتا ﴿فمن لم یوتر فلیس منا﴾ جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نے اس سے وتر کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ابوالمنیب عبید اللہ بن عبداللہ عتکی متکلم فیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے بلکہ امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے یعنی یہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے مرفوع حدیث نہیں۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کیونکہ خلیل بن مرة عن معاویہ بن قرۃ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور معاویہ بن قرۃ کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس نے تو ان سے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس لئے یہ منقطع روایت ہے اور خلیل بن مرة بذات خود منکر حدیث ہے۔ لہذا یہ حدیث اور اس کی شاہد حدیث، دونوں ہی احتجاج کے لائق نہیں اور ان احادیث صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو وتر کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابھی ایک حدیث کے تحت ”الوتر حق“ کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد وتر کی اہمیت ہے اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو سل ہے۔ مروی مناصب قضاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اور ثقہ تابعین میں شمار کئے گئے۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر میں سے تھے۔ ۱۱۵ھ میں مروی میں فوت ہوئے۔

(۲۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ
 تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے

اللہ ﷻ بَرِّدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثًا، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُؤْتِرَ؟ قَالَ: يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ، وَلَا يَنَامُ قَلْبِي. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

زائد نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں ایسی حسن خوبی سے ادا فرماتے تھے کہ ان کے حسن اور طوالت کا کیا کہنا۔ پھر چار رکعات ادا فرماتے بس ان کی خوبی اور طوالت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ وتر ادا کئے بغیر سو جاتے ہیں۔ فرمایا ”عائشہ (رضی اللہ عنہا) میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔“ (بخاری و مسلم)

وَفِي رَوَايَةٍ لَّهُمَا عَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ عَشْرَ رَكْعَاتٍ، وَيُؤْتِرُ بِسَجْدَةٍ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ، فَبِلَكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ.

اور بخاری و مسلم دونوں کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رات کو آپ دس رکعتیں پڑھتے تھے اور بعد میں ایک وتر اور اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں۔ یہ سب ملا کر کل تیرہ رکعتیں ہوتیں۔

لغوی تشریح: ﴿ماکان یزید الخ﴾ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی مسنون ہے اور بس۔ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی چیز ہے۔ ﴿یصلی اربعاً﴾ بظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چاروں رکعتوں کو مسلسل ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ آپ دو رکعت پڑھتے۔ چار کے بعد کچھ توقف کرتے اس لئے انہیں چار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا رات کی نماز دو رکعت ہے تو اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿فلا تسال عن حسنهن وطولهن﴾ دریافت کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہاں نئی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود نماز کی تعریف کرنا ہے اور یہ انتہائی عمدہ و بہترین اور طوالت سے کنایہ ہے۔ ﴿اتنام قبل ان تؤتر﴾ اس میں مہمرہ استفہام کیلئے ہے۔ گویا آپ آٹھ رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر تین وتر ادا فرماتے بغیر اس کے کہ سونے کے بعد اٹھنے کے وقت وضو فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہو گا کہ نیند نواقض وضو میں سے ہے اس لئے انہوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا، جس کا جواب آپ نے ان کو ﴿ان عینی﴾ کے فقرے میں دیا۔ عینی نون پر فتح اور ”یا“ پر فتح اور تشدید عین کا تشبیہ ہے اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور معنی یہ ہیں حدث اگر واقع ہو تو اس کا تعین ہو جاتا ہے کیونکہ میرا دل بیدار رہتا ہے سوتا نہیں اور مجرد نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ تو ہوا کے خارج ہونے

کے احتال کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا گمان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوتے ہیں: (۱) نبی ﷺ کا دل نہیں سوتا صرف آنکھیں سوتی تھیں اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انبیاء کے دل جاگتے اور آنکھیں سوتی ہیں۔ (۲) گہری نیند جس میں دل غافل ہو جائے ناقض وضو ہے۔ (۳) نماز تہجد عمدہ طریقے پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہئے۔ (۴) ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی پڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ آپؐ یہ نماز گھر ہی میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کے وہ اعمال جو آپؐ عموماً گھر میں سرانجام دیتے تھے بالخصوص رات کے ان کی صحیح خبر اہل خانہ ہی کو صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔

میں رکعت تراویح کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور طبرانی نے ابوشیبہ، ابراہیم بن عثمان، عن الحکم، عن مقسم، عن ابن عباس کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں، وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ ابوشیبہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ، ابن معین رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، امام مسلم رحمہ اللہ، ابوداؤد رحمہ اللہ، ترمذی رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ سبھی کی یہ رائے ہے کہ یہ شخص ضعیف ہے۔ شعبہ نے تو اسے کذاب قرار دیا ہے۔ اس کے مقابل صحیح مرفوع روایات میں آٹھ رکعت تراویح کا ذکر ہے۔ اس لئے تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں کہا ہے کہ تراویح کی مسنون تعداد تو آٹھ رکعات ہے اور اس سے زائد مستحب اور نفل ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد انور کاشمیری رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ”عرف الثدی“ میں کہا ہے کہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت پڑھی ہیں اور کسی روایت سے یہ بھی ثابت نہیں کہ آپؐ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ (۵) اس حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز تہجد کی دس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور آخر میں ایک وتر پڑھا یوں یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ (۶) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ نے بھی تیرہ رکعت بھی پڑھیں ہیں۔ جس میں آٹھ نفل اور پانچ وتر پڑھتے تھے۔

(۲۹۹) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ ﷻ يَصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وٹروں میں تشہد کیلئے رُكْعَةً، يُؤْتِرُ مِنْ ذَلِكَ بِخَمْسٍ، لَا صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔ يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ إِلَّا فِي آخِرِهَا.

لغوی تشریح: ﴿لَا يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ﴾ کہ پانچ وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت کے بعد نہ بیٹھتے یعنی پانچوں رکعت متصل پڑھتے تھے درمیان میں تشہد نہیں پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے

احناف کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو صرف تین رکعات کے تعین پر ہی اصرار کرتے اور درمیان میں تشہد پڑھتے ہیں۔

(۳۰۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عَنْهَا قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ ﷺ نے رات کے ہر حصے میں وتر پڑھا ہے اور آپ ﷺ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، وَانْتَهَى وَتَرَهُ إِلَى کے وتر پڑھنے کی انتہا سحر تک تھی۔ (دونوں روایتوں کو السَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِمَا. بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السحر﴾ سحر سے مراد صبح کاذب ہے۔ یہ وہ سفیدی ہے جو مشرقی افق میں طلوع فجر سے پہلے سیدھے ستون کی مانند نظر آتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے وتر رات کے شروع اور وسط شب اور رات کے آخری حصہ میں پڑھے ہیں۔ ورتوں کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر طلوع فجر تک رہتا ہے جو لوگ نماز تہجد کے عادی ہوں انہیں وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنے چاہئیں اور جو سحری کے وقت اٹھ نہ سکتے ہوں وہ نماز عشاء کے بعد پڑھیں۔ کسی مجبوری اور عذر کی وجہ سے اگر وقت پر وتر نہ پڑھے جاسکیں تو فجر کی جماعت کھڑی ہونے تک انہیں پڑھ لے۔ ہاں! اگر سو جائے یا اسے یاد ہی نہ رہے تو جس وقت بیدار ہوا جس وقت یاد آئے پڑھ لے، اس کا یہی وقت ہے۔

(۳۰۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی بن عبد العاص رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا ”اے قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللهِ! فُلَانُ آدَمِي كِي طَرَحَ تَمَّ نَهْ هُوَ جَانَا كِهْ وَهْ قِيَامَ عَبْدَ اللهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَمَاَنَّ اللَّيْلُ كِرْتَا تَهَا پھر بعد میں اسے ترک کر دیا۔“ (بخاری بِقَوْمٍ مِنَ اللَّيْلِ. فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ. و مسلم) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں مندوب ہے اور عمل خیر پر مداومت اور بے شکلی پسندیدہ اور بہترین عمل ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب کسی مستحب و مندوب عمل کی عادت بنالے تو پھر اس میں غفلت، تساہل اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب کوئی عمل شروع فرما لیتے تو اس پر دوام کرتے خواہ عمل معمولی سا ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کی بری عادت کسی دوسرے کے سامنے بیان کرنی ہو تو اس کا نام پس پردہ رکھا جائے۔ حضور ﷺ نے لَا تَكُنْ فِیْ مِثْلِ فُلَانٍ فرمایا، اس شخص کا نام نہیں لیا۔ اس آدمی کا نام ظاہر نہ فرما کر پردہ پوشی فرمائی ہے۔

(۳۰۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَوْتَرُوا يَا أَهْلَ الْفُرَّانِ! فَإِنَّ اللَّهَ وَتَرٌ، يُحِبُّ الْوِتْرَ». (اسے پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے رواہ الحَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَزِيمَةَ۔ روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوترو﴾ یعنی وتر پڑھو۔ یہ امر واجب کیلئے نہیں بلکہ ترغیب کیلئے ہے۔ ﴿یا اهل القرآن﴾ سے مراد حفاظ قرآن ہیں اور یہ قریب ہے کہ وتر واجب نہیں، ورنہ محض اہل القرآن کو بالخصوص اسی کے پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ وتر سے مراد یہاں قیام اللیل ہے اور وتر بول کر اطلاق قیام اللیل پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں کے آخر میں پڑھے جاتے ہیں اور وتر باقی ساری نماز کو بھی وتر (طاق) بنا دیتے ہیں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے حفاظ قرآن کو ترغیب ہے کہ وہ قیام اللیل کا اہتمام کریں کیونکہ اس سے قرآن یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۳۰۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”اپنی رات کی آخری نماز کو وتر بناؤ۔“ (بخاری) «اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ اور مسلم) وَتَرًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث میں رات کی نماز کا آخری حصہ وتر بنانے کا امر واجب کیلئے نہیں بلکہ مندوب ہے۔ اگر کسی نے رات کے اول حصہ میں وتر پڑھا ہے پھر رات کے درمیان میں یا رات کے آخری حصہ میں جاگ اٹھا تو وہ جو چاہے پڑھے وتر کو نہ پڑھے یعنی جوڑا (شفع) بنانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اگر کوئی وتر کے ادا کرنے کے بعد دو رکعت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

(۳۰۴) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَوِيَهُ فرماتے سنا ہے کہ ”ایک رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: لَا وَتْرَانِ فِي رَاتٍ مِثْلَ رَاتٍ فِي رَاتٍ مِثْلَ رَاتٍ“ (اسے احمد نے اور تینوں لَيْلَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ تَرْمِذِي، نَسَائِي، ابْنُ مَاجَةَ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان جَبَّانَ۔ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک رات میں دو بار وتر نہیں پڑھنے چاہئے۔ بعض حضرات جو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر اول رات میں وتر پڑھے ہوں پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو تو

پہلے ایک رکعت پڑھ کر شفع بنا لے پھر نفل پڑھ کر آخر میں وتر پڑھ لے۔ یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ مزید تفصیل کیلئے امام مروزی رحمہ اللہ کی ”قیام اللیل“ ملاحظہ ہو۔

(۳۰۵) وَعَنْ أَبِي بَنْزِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُوتِرُ «بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» وَ«قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ» وَ«قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَزَادَ: وَلَا يُسَلِّمُ إِلَّا فِي آخِرِهِمْ.

وَلَا يُبَيِّنُ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ نَحْوُهُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، وَفِيهِ: كُلُّ سُورَةٍ فِي رَكْعَةٍ، وَفِي الْأَخِيرَةِ «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ» وَ«الْمُعَوِّذَتَيْنِ».

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے اور اس روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ تلاوت فرماتے تھے اور آخری رکعت میں قل هو اللہ احد اور معوذتین پڑھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿کل سورۃ﴾ ہر رکعت میں ایک سورۃ۔ یعنی ایک رکعت میں ”سبح اسم ربک الاعلیٰ“ اور دوسری میں ”قل یا ایہا الکفرون“ مکمل سورت پڑھے ﴿فی رکعۃ﴾ سے مراد پہلی اور دوسری رکعت میں ﴿المعوذتین﴾ تعویذ سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہے۔ معوذتین کا اضافہ پہلی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی صرف سورۃ اخلاص پڑھ لیتے اور کبھی معوذتین بھی شامل فرما لیتے۔

حاصل کلام: حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تین و تر ادا فرمایا کرتے تھے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے اور آخری رکعت میں قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین و تر دو تشدد سے پڑھتے تھے۔ اگر احناف نے ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال واضح نہیں ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابو منذر ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ نجار سے ہونے کی وجہ سے انصاری، نجاری خزرجی کہلائے۔ قراء کے سربراہ تھے اسی وجہ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کاتبین وحی میں سے تھے اور ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جمع قرآن کا شرف پایا۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں فتویٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں

شریک تھے۔ بدر اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۱۹ھ سے لے کر ۳۳ھ کے درمیان میں کوئی وقت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳۰۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نے فرمایا کہ ”وتر صبح ہونے سے پہلے پڑھ لیا کرو“ (مسلم)

اور ابن حبان میں ہے کہ ”جس کسی نے صبح تک وَلَا تَزِدْ حَبَّانَ: مَنْ أَذْرَكَ الصُّبْحَ وتر نہ پڑھے اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔“ وَلَمْ يُوتِرْ، فَلَا وَتِرَ لَهُ۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ وتر کا وقت صبح کے نمودار ہونے سے پہلے تک ہے۔ جب فجر طلوع ہوگئی تو ادا ہوگئی۔ وتر کا وقت نکل گیا ”لا وتر لہ“ کے معنی ہیں کہ اس کا وتر ادا نہیں ہوگا۔ رہا اس کی قضاء کا مسئلہ تو وہ جب اور جس وقت چاہے پڑھ سکتا ہے جس پر آئندہ آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔ وتر ہر وقت ادا کرنے کی بنا پر ہی آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ صبح اٹھ نہ سکیں انہیں چاہئے کہ عشاء کی نماز کے ساتھ وتر بھی پڑھ لیا کریں۔

(۳۰۷) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ: «مَنْ نَامَ عَنِ الْوُتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نے فرمایا ”جو سو جائے بغیر وتر پڑھے فَلْيُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَ“۔ رَوَاهُ: یا اسے یاد نہ رہے ہوں تو اسے چاہئے کہ صبح کے الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ۔ وقت پڑھ لے یا پھر جب اسے یاد آئے۔“ (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وتر کسی بھی صورت پڑھنے سے رہ جائیں تو انہیں ہر صورت پڑھنا چاہئے۔ اس سے بھی نماز وتر کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(۳۰۸) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ حَضْرَتِ جَابِرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ نے فرمایا ”جس کسی کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو کہ وہ رات کے آخری اوقات میں بیدار نہیں ہو سکا گا اسے چاہئے کہ رات کے پہلے حصہ میں ہی يَقُومَ آخِرَهُ فَلْيُوتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ، فَإِنْ وَتِرَ پڑھ لے اور جسے یہ توقع اور امید ہو کہ وہ بیدار صَلَاةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُودَةً، وَذَلِكَ ہو جائے گا تو اسے رات کے آخری حصہ میں وتر

ہوں۔

لعنوی تشریح: ﴿کان بصلی الضحی﴾ اس مقام پر کان استمرار کا معنی نہیں دے رہا کہ آپؐ نماز ضحیٰ ہمیشہ بلا تاخیر ادا فرماتے رہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ضحیٰ کے نوافل پڑھتے تو ان کی تعداد چار ہوتی جہاں تک نماز ضحیٰ کا تعلق ہے وہ تو نفل نماز ہے، مستحب ہے جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے بارے میں نبی ﷺ سے بارہ رکعتوں سے زیادہ کچھ بھی مروی نہیں ہے ﴿مغیبة﴾ اپنے سفر سے واپسی۔ ﴿سبحہ الضحی﴾ سین پر ضمہ اور ”با“ ساکن یعنی نماز ضحیٰ کے نوافل ﴿وانی لاسبحھا﴾ تسبیح سے ماخوذ ہے یعنی میں صلاۃ ضحیٰ پڑھتی ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل باوجودیکہ انہوں نے نبی ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا اس کا سبب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کے ارشاد گرامی سے اس نماز کی فضیلت معلوم ہو گئی ہوگی یا پھر انہیں یہ بات پہنچی ہوگی کہ آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے۔ روایت کی عدم موجودگی اس کو تو مستلزم نہیں ہے کہ آپؐ نے اس کو مطلقاً پڑھا نہیں۔ یوں یہ حدیث پہلی دونوں احادیث کے معارض نہیں ہے اور ان کے درمیان تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلی حدیث تو مطلقاً اثبات پر دلالت کرتی ہے (یعنی آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے) اور تیسری مطلقاً نفی پر دلالت کرتی ہے یعنی آپؐ نے یہ عمل کیا ہی نہیں اور دوسری حدیث سفر سے واپسی کی قید سے مشروط ہے یعنی سفر سے واپسی کے وقت پڑھی ہے۔ ان کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ تیسری حدیث میں سبب کی کوئی قید نہیں ہے اور پہلی حدیث سبب کے ساتھ مقید ہے اور وہ ہے سفر سے واپسی۔ جمع کی یہ صورت پہلی سے بہتر اور اولیٰ ہے۔ اس باب کی آخری حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

حاصل کلام: نماز اشراق، صلاۃ ضحیٰ اور صلاۃ اوائین تین الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کا تین الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے اس میں ایک ہی چیز بے شمار الفاظ سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ طبرانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی چچا زاد بن ام ہانی رضی اللہ عنہ کے گھر نماز پڑھی اور ام ہانی رضی اللہ عنہا کو بلا کر بتایا کہ یہ اشراق کی نماز ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس کا نام صلاۃ ضحیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نماز طلوع آفتاب سے لے کر دن کے چوتھائی حصہ تک پڑھی گئی ہے اور اوائین کی نماز کا وقت جب آفتاب کی تمازت سے زمین گرم ہو جائے کہ اونٹنی کا بچہ گرمی محسوس کرنے لگے۔ اونٹ کا بچہ معمولی حرارت کی پروا نہیں کرتا بلکہ ذرا تپش زیادہ ہو تو وہ گرمی محسوس کرتا ہے۔ گویا اس نماز کا وقت سورج کے کافی اوپر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس طرح بعض کے نزدیک تینوں نمازیں دراصل ایک ہی ہیں نام مختلف ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اشراق اور ضحیٰ ایک ہی نماز کے دو نام ہیں البتہ صلاۃ اوائین ان سے الگ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نماز ضحیٰ کی رکعت کتنی ہیں؟ تو اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

(۳۱۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «صَلَاةُ الْأَوَائِينَ حِينَ تَرْمَضُ جب اونٹنی کے بچے تپش و حرارت اور گرمی محسوس

الفَصَالُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ. کریں۔“ (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿الاولیین﴾ اواب کی جمع ہے۔ اس میں ”واو“ پر تشدید ہے معنی اس کے بکثرت رکوع کرنے والے ہیں اور منکرات و سینات کو چھوڑنے اور ترک کرنے والے ہیں۔ ﴿حین﴾ وقت کے معنی میں۔ یہ جب جملہ کی طرف مضاف ہو تو اکثر و بیشتر بنی برفح ہوتا ہے ﴿ترمض﴾ سمع یسمع باب سے یعنی گرمی اور تمازت کی وجہ سے جلن محسوس کرے اور یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سورج کی گرم شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں اور یہ وہی وقت ہے جب سورج کافی اونچا ہو اور نصف النہار کے قریب پہنچ چکا ہو ﴿الفصال﴾ ”فا“ کے نیچے کسرہ فصول کی جمع ہے۔ اونٹنی کے بچے کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گویا کنایہ مقصود ہے کہ صلاۃ اوایین کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب اونٹنی کے چھوٹے بچے دن کی حرارت و تمازت سے جلن اور تپش محسوس کریں اس وقت پڑھی جانے والی نماز کا نام صلاۃ اوایین اس لئے ہے کہ اس وقت طبیعت انسانی آرام و استراحت اور سکون کی جانب مائل ہوتی ہے مگر یہ نماز پڑھنے والافس کی مراد پوری کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى الضُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں محل تعمیر فرمائے رُكْمَةً، بَنَى اللَّهُ لَهُ قَصْرًا فِي الْجَنَّةِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَفْرَغَهُ. بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے غریب کہا ہے۔ اس سے نماز ضحیٰ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث اس کی فضیلت میں منقول ہیں مگر وہ بھی ضعیف ہیں۔

(۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قَالَ: دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِرَّةً فِي تَشْرِيفٍ لَائَةٍ اور نماز ضحیٰ کی آٹھ رُكْمَاتٍ بَنَيْنِي، فَصَلَّى الضُّحَى ثَمَانِي رُكْعَاتٍ ادا فرمائیں۔ (ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے حضورؐ کا حضرت عائشہؓ کے حجرے میں آٹھ رکعت نماز ضحیٰ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، ممکن ہے اس نماز سے مراد سفر سے واپسی پر پڑھی گئی نماز ہو۔ نماز ضحیٰ کا بڑا فائدہ مسلم کی روایت

میں منقول ہے کہ انسان کے ہر جوڑ پر ایک حق واجب ہے، انسان کے جسم میں تین سو ساتھ جوڑ ہوتے ہیں۔ اس نماز کی دو رکعت ادا کرنے سے وہ حقوق ادا ہو جاتے ہیں جو ان تمام جوڑوں پر واجب ہوتے ہیں۔

۱۰ - بَابُ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ وَالْإِمَامَةِ نماز باجماعت اور امامت کے مسائل

کامیان

(۳۱۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”باجماعت نماز پڑھنا تنہا نماز اللہ ﷻ قَالَ: صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ پڑھنے سے ستائیس گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔“ مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ سَبْعَ وَعَشْرِينَ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: «بِخَمْسٍ مَرَّةٍ ہے کہ ”پچیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے“ اور وَعَشْرِينَ جُزْءًا» وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ عَنْ بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت أَبِي سَعِيدٍ، وَقَالَ: «دَرَجَةٌ». ہے اس میں جزء کی جگہ درجہ کا لفظ ہے۔

لعنوی تشریح: ﴿باب صلاة.....الخ﴾ امامت کا عطف صلاة پر ہے۔ جماعت کے لفظ پر نہیں ہے۔ ﴿من صلاة الفذ﴾ ”فا“ پر فتح اور ذال پر تشدید۔ ”فذ“ کے معنی تنہا اور منفرد ”جزء“ ”معرہ پر نصب۔ درجہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر درجہ اور جزء سے مراد نماز ہے ﴿وكذا للبخاري﴾ یعنی بخاری کی روایت میں بھی پچیس گنا ہے ﴿وقال درجة﴾ جزء کی جگہ درجہ کا لفظ ہے۔ رہا یہ دونوں عددوں کا اختلاف تو اس بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں کے مابین کوئی منافات نہیں۔ یہاں عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ ستائیس میں پچیس شامل ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپؐ نے پچیس گنا ثواب کا ذکر کیا ہو بعد میں ستائیس گنا کا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرق مسجد کے قریب و بعید ہونے کی وجہ سے ہے اگر مسجد دور ہوگی تو اجر زیادہ اور قریب ہونے کی صورت میں کم اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے خشوع کی قلب و کثرت مراد ہے اگر نماز میں خشوع زیادہ ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر خشوع کم ہوگا تو اجر کم ملے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرق جماعت کی تعداد کی کثرت و قلت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پوری نماز میں شمولیت ہوگی تو زیادہ ثواب ملے گا اور اگر تھوڑی سی نماز میں شمولیت ہوگی تو اجر کم ملے گا۔ واللہ اعلم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھنا

واجب نہیں کیونکہ انفرادی اور اجتماعی میں مختلف اسباب کی وجہ سے درجات میں کمی و بیشی ہوتی ہے تو گویا منفرد کی بھی نماز ہو گئی خواہ مراتب اور درجات کم ہی ہوں۔ اگر جماعت نماز واجب ہوتی تو پھر منفرد کی نماز تو جائز نہ ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

(۳۱۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَمُرَ بِحَطَبٍ فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ أَمُرَ بِالصَّلَاةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ أَمُرَ رَجُلًا فَيُؤَمَّ النَّاسَ، ثُمَّ أَخَالِفَ إِلَى رَجُلٍ لَا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ يَوْمَهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ يَعْلَمُ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَرَفًا سَمِينًا، أَوْ مِرْمَاتَيْنِ حَسَنَتَيْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ». مَتَّقَ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اس ذات گرامی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کیلئے اذان کا حکم دوں پھر کسی کو نماز پڑھانے کیلئے کہوں پھر میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھروں میں موجود ہونے کی صورت میں ان کے گھروں کو ان پر آگ لگا کر جلا دوں۔ قسم اس ذات گرامی کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر یہ علم ہو جائے کہ اس کو گوشت سے پر موٹی ہڈی مل جائے گی یا دو پائے مل جائیں گے تو نماز عشاء میں لپک کر شامل ہو جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ہممت﴾ میں نے ارادہ کیا، قصد کیا ﴿بحطب﴾ ”حا“ اور ”طا“ پر فتح خشک لکڑی جو جلانے کے کام آسکے ﴿فیحطب﴾ لکڑیاں جمع کی جائیں۔ صیغہ مجہول ہے۔ منصوب اس لئے ہے کہ اس سے پہلے واقع فعل منصوب کا جواب ہے ﴿فیؤذن﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ اذان دی جائے ﴿فیوم الناس﴾ جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ یعنی لوگوں کا امام بن کر نماز باجماعت پڑھائے ﴿ثم اخالف الی رجال﴾ پھر میں ان کے پیچھے سے آؤں یا محض یہ معنی ہے کہ میں ان کی طرف چلا جاؤں۔ ﴿فاحرق﴾ تخریق سے ماخوذ ہے، یعنی میں آگ لگا کر جلا ڈالوں یہاں مضارع کے تمام صیغے منصوب واقع ہوئے ہیں سوائے صیغہ جمع مذکر کے۔ ﴿عرفا﴾ عین پر فتح ”را“ ساکن۔ وہ ہڈی جس پر کچھ گوشت باقی ہو اور اس کا زیادہ حصہ اخذ کر لیا گیا ہو اور اسمعی کا قول ہے کہ عرق گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ زیادہ عمدہ۔ اس جگہ پہلا ہی معنی مراد ہے کیونکہ لوگوں کی بدترین خصلت و عادت کو زیادہ شدید مبالغہ کے اظہار کیلئے ہے ﴿سمینا﴾ سمانہ سے ماخوذ ہے۔ لاغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ موٹا تازہ اس کے معنی

ہیں۔ کیونکہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے چبانے میں رغبت زیادہ ہوتی ہے ﴿مرماتین﴾ مرماتہ کا تشبیہ ہے۔ میم کے نیچے کسرہ ہے اور کبھی فتح سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بکری کا کھرا یا وہ گوشت جو دونوں کھروں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اس قسم کی سخت و شدید وعید تو صرف واجب کے ترک پر ہوتی ہے اور جس نے اس وعید کو زجر و توبخ پر محمول کیا ہے اور واجب تسلیم نہیں کیا ہے اس نے تاویل سے کام لیا ہے۔ اس کی حقیقت یہاں مراد نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض عین ہے۔ فرض کفایہ یا سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تارکین جماعت کیلئے اتنی سخت اور شدید وعید اور دھمکی نہ دی جاتی اگر یہ فرض عین نہ ہوتی۔ ظاہریہ، عطاء، اوزاعی، امام احمد، ابو ثور، ابن خزیمہ، ابن منذر اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرض کفایہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اگر جماعت کے ساتھ ادا کر لیں تو باقی لوگوں سے عدم ادائیگی کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ متقدمین شافعیہ اور بعض احناف اور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے البتہ صاحبین اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ فرض کفایہ تو اس لئے نہیں کہ جب کچھ لوگ جماعت میں شامل ہو گئے پھر شامل نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کفایہ تو چند لوگوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔

(۳۱۶) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَتَقْلُ الصَّلَاةَ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةَ الْعِشَاءِ وَصَلَاةَ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبَوًّا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ان کو گھٹنوں کے بل گھٹ کر آنا پڑتا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لَا تَوَهُمَا﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے یعنی ضرور آتے اتیان سے ماخوذ ہے ”ولو حبوا“ خواہ انہیں گھٹنوں پر گھٹ کر ہی آنا پڑے۔ جو ”حا“ پر فتح اور ”با“ ساکن ہے۔ بچے کا اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھٹنا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بچے کا اپنی سرین پر گھٹ کر آگے بڑھنا۔ حاصل کلام: ان دونوں نمازوں کو نہایت بو جھل اور بھاری کہا گیا ہے۔ عشاء تو اس لئے ثقیل ہے کہ اس وقت تھکے ماندے لوگ سو جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اکیلے ہی نماز ادا کر کے سو جاتے ہیں۔ جماعت کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے اور فجر اس لئے گراں ہوتی ہے کہ شیطان نیند کے مارے ہوئے لوگوں کو

ٹھنھے ہی نہیں دیتا۔

(۳۱۷) وَعَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ حَضْرَتُ ابُو هَرِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَے مروی ہے کہ ایک نابینا رَجُلٌ أَعْمَى فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! شَخْصِ نَبِی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: إِنَّهُ لَيْسَ لِي قَائِدٌ يَقُودُنِي إِلَى: اے رسول اللہ (ﷺ)! میرے پاس ایسا کوئی آدمی الْمَسْجِدِ، فَرَحَّصَنِي لَهُ، فَلَمَّا وَلَّى نہیں جو مجھے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ آپ نے دَعَاہُ فَقَالَ: «هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ» سے رخصت عنایت فرما دی (کہ وہ گھر پر ہی نماز بِالصَّلَاةِ؟) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: پڑھ لیا کرے) مگر جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے «فَاجِبٌ». رَوَاهُ مُنْذِلِمٌ. اسے واپس بلا کر فرمایا کہ ”تم اذان سنتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں، تو آپ نے فرمایا ”تو پھر اذان کا جواب دے (یعنی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ)“ (مسلم)

لغوی تشریح: ”رجل اعمی“ نابینا آدمی سے یہاں مراد عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ غالباً اس ارشاد کے بعد مسجد میں اتنی باقاعدگی سے حاضری دی کہ بالآخر مسجد کے منصب اذان پر مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ﴿قائد﴾ وہ آدمی جو نابینا کا ہاتھ تھام کر جہاں وہ جانا چاہے وہاں اسے لے جائے ﴿ولی﴾ تولیت سے ماخوذ ہے۔ واپس ہوا۔ واپس جانے کیلئے مڑا اور اپنا رخ پھیرا۔ ﴿النداء﴾ اذان ﴿فاجب﴾ اجابہ سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اذان کا جواب دے۔ اس سے مراد نماز باجماعت ادا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اذان کی آواز سننے کے بعد معذور آدمی کو بھی مسجد میں آنا چاہئے۔ معذور کی نماز گھر پر پڑھنے سے ادا تو ہو جائے گی مگر جماعت کا ثواب تو نہیں ملے گا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان کی آواز نہ سنا قابل قبول عذر ہے۔ سننے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ بارش، سخت آندھی، باد صحر، شدید ہوک، قضاے حاجت، بیماری اور دشمن کا خوف وغیرہ ایسے عذرات ہیں جنہیں جماعت میں عدم شمولیت کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے جماعت میں شمولیت کو فرض عین کہنے والوں نے فرضیت عین پر استدلال کیا ہے اور سنت مؤکدہ کہنے والوں نے اس حدیث کو تاکید مزید پر محمول کیا ہے۔ دونوں کیلئے اپنے اپنے نظریہ کی رو سے گنجائش موجود ہے۔

(۳۱۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ حَضْرَتُ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُمَا سَے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص اذان سنے اور پھر نماز باجماعت میں شامل نہ ہو اس کی کوئی نماز نہیں، الا یہ کہ کوئی فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ“. رَوَاهُ ابْنُ عُذْرِ مَانِعٍ ہو۔“ (اسے ابن ماجہ، دار قطنی، ابن حبان، حاکم

مَاجَهُ وَالذَّارِقُطَيْبُ وَابْنُ جَبَّانَ وَالْحَاجِمُ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، لَكِنْ رَجَعَ بَعْضُهُمْ وَقَفَهُ. ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے) حاصل کلام: اس حدیث سے بھی نماز باجماعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ابو داؤد میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا وہ عذر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”خوف اور بیماری“ نیز اس میں لا صلاۃ کی بجائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرتا مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ بادو باراں، باد صرصر اور خوف وغیرہ کے ساتھ یہ عذر بھی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے کچا پیاز، لسن، مولیٰ اور گندنا وغیرہ تازہ ہی کھائے ہوں تو وہ مسجد میں نہ آئے کیونکہ ان کے استعمال سے منہ میں ایسی ناخوشگوار بساند پیدا ہو جاتی ہے جو ملائکہ اور نمازیوں کیلئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ اسی طرح تمباکو نوشی بھی کم از کم نماز کے اوقات میں تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز کریں، تاکہ خدا کی مخلوق کو اذیت دینے کا موجب نہ بنیں۔

(۳۱۹) وَعَنْ يَزِيدَ بْنِ الْأَسْوَدِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، إِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ لَمْ يُصَلِّيَا، فَدَعَا بِهِمَا، فَجِئَا بِهِمَا، تَرَعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فَقَالَ لَهُمَا: «مَا مَنَعَكُمَا أَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا؟» قَالَا: قَدْ صَلَّيْنَا فِي رِحَالِنَا، قَالَ: «فَلَا تَفْعَلَا، إِذَا صَلَّيْتُمَا فِي رِحَالِكُمَا ثُمَّ أَدْرَكْتُمَا الْإِمَامَ وَلَمْ يُصَلِّ فَصَلِّيَا مَعَهُ، فَإِنَّهَا لَكُمْ نَافِلَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالثَّلَاثَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جَبَّانَ.

حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو دو ایسے آدمیوں پر نظر پڑی جنہوں نے نماز (آپؐ کے ساتھ) نہیں پڑھی۔ آپؐ نے دونوں کو اپنے پاس بلوایا۔ دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر کئے گئے تو (خوف کے مارے) ان کے شانے کانپ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا ”تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟“ دونوں نے عرض کیا: ہم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا ”ایسا تم کیا کرو۔ اگر تم اپنے گھر پر نماز پڑھ چکے ہو پھر تم امام کو پالو اور امام نے ابھی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کے ساتھ تم نماز پڑھو، یہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ بھی اسی کے ہیں۔۔ اس کے علاوہ تینوں (ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا هو﴾ ہو سے یہاں مراد نبی ﷺ ہیں ﴿برجلین﴾ ان سے مراد دو آدمی ہیں جو لوگوں کے آخر میں بیٹھے ہوئے تھے ﴿فجئنی﴾ اس میں ”قا“ تعقیب کے لئے اور ”جئنی“ فعل ماضی ہے، صیغہ مجہول ہے مجببہ سے۔ معنی ہے ان دونوں کو لایا گیا ﴿ترعد﴾ صیغہ مجہول۔ معنی ہیں مضطرب ہونا، کانپنا، خوف اور ڈر کی وجہ سے لرزہ براندام ہونا ﴿فرائصهما﴾ جمع فریصہ، اس گوشت کو کہتے ہیں جو پہلو اور بازو کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے لرزہ براندام ہونے اور کانپنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت و ہیبت ہے، حالانکہ آپ کی طبیعت میں تواضع، نرمی اور شفقت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ﴿رحالنا﴾ رحل کی جمع ہے ”راء“ پر فتح اور ”حاء“ ساکن ہے۔ معنی جائے سکونت گھر کے ہیں۔ ﴿فلا تفعلنا﴾ ایسا نہ کرنا یا ایسا تمہیں نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی ابھی جو جماعت میں حاضر ہونے کے باوجود تم نے ترک جماعت کا عمل کیا ہے (یہ نہ ہونا چاہئے) ﴿فانہا لکما نافلة﴾ اس سے وہ نماز مراد ہے جو انہوں نے امام کے ساتھ ادا کی تھی۔ اس لئے کہ فرض نماز تو پہلی نماز کی صورت میں ادا ہو گئی، اب فرض نماز تو کوئی باقی رہی نہیں جو ادا کی جاتی لہذا دوسری نماز جو امام کے ساتھ ادا کی تھی وہ نفل نماز قرار پائے گی۔ ابو داؤد اور دارقطنی میں ہے کہ امام کے ساتھ جو نماز پڑھی وہ فرض ہوگی اور جو پہلے اکیلے پڑھی وہ نفل ہوگی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور یزید بن اسود کی اس صحیح حدیث کے خلاف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص پہلے نماز پڑھ چکا ہو اور پھر جماعت کے ساتھ شامل ہونے کا موقع بھی میسر آجائے تو اسے جماعت کے ساتھ شامل ہونا چاہئے خواہ کوئی نماز ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف ظہر اور عشاء دو نمازوں میں کر سکتا ہے باقی میں نہیں، لیکن جب دوبارہ نماز پڑھنے کی دلیل یہی حدیث ہے تو پھر صبح کی نماز دوبارہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ اس لئے امام شافعی کا موقف ہی درست ہے۔

راوی حدیث: ﴿یزید بن اسود رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو جابر سوائی عامری ہے۔ ان کے قبیلے کے قریش سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں فروکش ہوئے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ ان سے ان کے لڑکے جابر رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

(۳۲۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلَا تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلَا تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ» وَإِذَا قَالَ: «سَمِعَ

اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُولُوا: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ» وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَلَا تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ، وَإِذَا صَلَّى قَائِمًا فَصَلُّوا قِيَامًا، وَإِذَا صَلَّى قَاعِدًا فَصَلُّوا قُعُودًا أَجْمَعِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا لَفْظُهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

تک کہ امام رکوع نہ کرے اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور اس سے پہلے سجدہ نہ کرو تاوقتیکہ وہ سجدہ کرے اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے

تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور اس کی اصل صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿لبوتم﴾ تاکہ اس کی اتباع و پیروی اور اقتدا کی جائے ﴿حتیٰ یرکع﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع میں جھک جائے، یہ معنی نہیں کہ رکوع پورا کرے (پھر تم رکوع کرو) ﴿واذا قال سمع اللہ الخ﴾ بعض علمائے احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی صرف حمد و ثناء کرے لیکن یہ حدیث اس بارے میں واضح نہیں ہے، بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد بھی کہتے تھے۔ اسی طرح مقتدی کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنا بھی درست ہے کیونکہ یہ وظیفہ انتقال ہے۔ اس حدیث میں دراصل امام اور مقتدی کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی اقتدا کس طرح کرے۔ راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی مقتدی کیلئے تسبیح و تحمید پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ الحاوی میں مطبوع ہے۔ ﴿فصلوا قعوداً﴾ تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کی مرض کے دوران نماز سے منسوخ ہو چکا ہے، اس لئے کہ آپؐ نے اس وقت امام کی حیثیت سے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی تھی اور باقی سب نمازیوں نے کھڑے ہو کر، لیکن امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے، منسوخ نہیں۔ جب امام کے عذر کے دور ہونے کی توقع نہ ہو تو اس وقت مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہئے بشرطیکہ قبلہ کا امام مستقل ہو اور نماز کی ابتدا بیٹھ کر کرتا ہو۔ ورنہ مقتدیوں کیلئے قیام ہی متعین ہے۔ مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر دراصل وجوب کیلئے ہے۔ اگر حکم کو اس بارے میں کھڑے ہونے پر محمول کریں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کے آخری عمل سے یہ منسوخ ہے اور رہا اس کا مندوب ہونے پر محمول کرنا اور مذکورہ شرائط کی قید لگانا تو پھر حدیث سے ایسی کوئی دلیل نہیں کہ نبی ﷺ نے جب اس کا حکم ارشاد فرمایا اس وقت خود ان شرائط کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد ”واذا صلی قاعدا فصلوا قعوداً اجمعین“ مطلق حکم کا مقتضی ہے اور شرائط مذکورہ کی بھی کوئی قید نہیں۔ لہذا اس حکم کے منسوخ ہونے اور مقتدیوں کیلئے قیام کی

تین میں ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ حکم منسوخ ہو گیا اور مقتدیوں کیلئے قیام کرنا جائز ہے۔
 حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کی پیروی و اتباع کرنی چاہئے۔ کسی چیز میں امام سے آگے نہ بڑھے۔ تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک امام کے پیچھے پیچھے رہنے کی کوشش کرے۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ سجدہ میں سر مبارک رکھ لیتے تو ہم سجدہ کیلئے جھکتے تھے۔ البتہ امام جب سمع اللہ لمن حمد کہے تو مقتدی ربنا لک الحمد کہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی یہی رائے ہے اور احناف کا یہی مسلک ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے شاگردان رشیدان صاحبین اور اہل حدیث اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مقتدی بھی سمع اللہ کہہ کر ربنا لک الحمد الخ تک کہیں۔

(۳۲۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوسَعِيدٍ خَدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى فِي أَصْحَابِهِ تَأْخُرًا، فَقَالَ دِيكَا تَوَفَرَا "آگے آجاؤ اور میری پیروی کرو اور «تَقَدَّمُوا، فَاتَّمُوا بِي، وَلْيَأْتُمْ بِكُمْ تَهَارِيءُ» (مسلم) مَنْ بَعْدَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿تأخرا﴾ پیچھے رہ جانا، دور رہ جانا۔ یعنی وہ آپؐ کے قریب نہیں پیچھے دور ہو کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ ﴿فاتموا بی﴾ میری اقتدا کرو یہ اتمام سے امر کا صیغہ ہے۔ اقتداء پیروی اور اتباع کے معنی میں۔ "ولیاتم" اس میں لام امر کا ہے۔ یہ گرائمر کے اعتبار سے ساکن بھی ہو سکتا ہے اور مکسور بھی ﴿من بعدکم﴾ تمہارے پیچھے والے۔ یعنی تم پہلی صف والے امام کے افعال، حرکات و سکنات اور احکام نماز کو پہلے نبی ﷺ سے حاصل کر لو پھر یہی افعال و احکام اور آداب و صفات نماز تم سے بعد والے یعنی پچھلی صف میں شریک نمازی سیکھ لیں اور اسی طرح ان سے پچھلی صف میں شامل لوگ اپنے سے پہلی میں شریک نمازیوں سے ان آداب و صفات کی تعلیم حاصل کر لیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نماز باجماعت میں پہلی صف کا درجہ اور مرتبہ دوسری صفوں سے زیادہ ہے اور افضل ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صف والوں کو امام کی اقتداء کرنی چاہئے۔ اس ضرورت کیلئے امام کو دیکھنا جائز ہے اور دوسری صف والوں کو پہلی صف کے مقتدیوں کی اسی طرح اقتداء کرنی چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نمازی براہ راست امام کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ اس کی آواز سن سکتا ہو تو وہ دوسرے مقتدی کی پیروی کرے۔ اس سے اشارتا یہ بھی مسئلہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس براہ راست کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے دوسرے صاحب علم سے معلوم کر لینا چاہئے۔

(۳۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اخْتَجَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَابِتِ بْنِ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَوَايَتِ كَرْتِے ہيں کہ اللہ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اخْتَجَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَابِتِ بْنِ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَوَايَتِ كَرْتِے ہيں کہ

اللہ ﷻ حُجْرَةً مُخَصَّفَةً، فَصَلَّى سے ایک چھوٹا (خیمہ نما) حجرہ بنایا اور اس میں نماز
 فیہا، فَتَتَبَعَ إِلَيْهِ رِجَالٌ، وَجَاءُوا پڑھنے لگے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ آئے اور
 يُصَلُّونَ بِصَلَاتِهِ، الْحَدِيثُ. وَفِيهِ: آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گئے۔ اس حدیث
 «أَفْضَلُ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ، إِلَّا فِي سَبْعٍ» میں یہ بھی ہے کہ مرد کی اپنے گھر میں نماز افضل
 الْمَكْتُوبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ہے (سوائے فرض نماز کے)۔ (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿احتجر﴾ حجرہ کی طرح کا ایک خیمہ سا بنایا ﴿مخصفہ﴾ تخصیف سے اسم
 مفعول ہے۔ چٹائی سے بنایا ہوا۔ ﴿فتتبع الیہ رجال﴾ لوگ تلاش کی جستجو اور کاوش کر کے اس جگہ
 پہنچ گئے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز کی جماعت کرنا مشروع
 ہے۔

حاصل کلام: یہ ماہ رمضان کا موقع تھا کہ آپ نے اپنے لئے مسجد میں الگ سے ایک مختصر سی مخصوص
 جگہ بنائی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدیوں اور نمازیوں کیلئے ایسا کرنا باعث ضرر اور تکلیف نہ ہو تو
 مسجد میں مخصوص جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ مکمل روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو
 صحابہ کرام کو علم ہوا تو انہوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ آنحضرت ﷺ ایک رات دیر
 سے اس حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا ”میں نے تمہارا حال دیکھ لیا ہے اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض
 نماز کے علاوہ مردوں کی نماز گھر میں افضل ہے۔“

(۳۲۳) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى مُعَاذُ
 بِأَصْحَابِهِ الْعِشَاءَ، فَطَوَّلَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَتُرِيدُ أَنْ تَكُونَ يَا
 مُعَاذُ قَتَانًا؟ إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَافْرَأْ بِالسَّمْسِ وَضَحَاهَا» وَ«سَبِّحْ اسْمَ
 رَبِّكَ الْأَعْلَى» وَ«أَقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ» (اعلیٰ) واقراء باسم واللیل اذا يغشى (سورہ
 «وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَى» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ علق و سورہ لیل) پڑھنی چاہئیں۔“ (بخاری و مسلم
 دونوں نے اسے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم
 کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فطول﴾ (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے ”فا“ برائے تعقیب ہے۔ یعنی قراء
 ت لمبی کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورہ بقرہ پہلی رکعت میں اور سورہ نساء

دوسری رکعت میں پڑھی۔ ﴿اتسبید﴾ حمزہ اس میں سوالیہ ہے (استفہام کیلئے ہے) اور استفہام بھی انکاری ﴿فساناً﴾ فا پر فتح اور ”ت“ پر تشدید یعنی تو عذاب اور آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہے ﴿اممت﴾ پہلی مہم پر فتح اور دوسری مہم ساکن۔ باب نصر بنصر معنی یہ ہوئے کہ جب لوگوں کی امامت کر رہے ہو۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام کو قرأت اتنی لمبی اور طویل نہیں کرنی چاہئے کہ نمازی تنگ آجائیں اور جماعت سے گریز کریں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرأت اتنی کم ہو کہ مقصد قرأت ہی فوت ہو جائے بلکہ ادائیگی ارکان اور تلاوت کلام مجید میں اعتدال اور توازن ہونا چاہئے اور مسنون طریقے سے نماز پڑھانی چائے۔ طویل قرأت بھی جائز ہے، جبکہ نمازی متمحل ہوں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نماز کا واقعہ بخاری نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور انہوں نے قراءت معمول سے زیادہ لمبی کر دی۔ ایک راہ چلتا مسافر جس کے پاس دو اونٹنیاں بھی تھیں وہ اپنی اونٹنیاں باہر چھوڑ کر نماز میں شامل ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ قراءت بہت طویل ہے تو اس نے نماز توڑ کر الگ بغیر جماعت کے نماز پڑھی اور اپنی راہ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کہا کہ یہ منافق ہے۔ وہ شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ حضور اکرم ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے نصیحت فرمائی۔ قنہ میں مبتلا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے، کمزور و ناتواں، ضرورت مند، تھکے ماندے وغیرہ تو ان سب کا لحاظ ملحوظ خاطر رکھنا امام کیلئے ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ آکٹا کر نماز باجماعت سے گریز کرنے لگیں۔ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرض نماز پہلے نبی کریم ﷺ کی امامت میں پڑھ کر پھر جاکر محلہ کی مسجد میں نمازیوں کو فرض نماز پڑھاتے اور خود نفل ادا کرتے تھے۔ عبدالرزاق، شافعی اور طحاوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ (دوسری) نماز نفل ہوتی تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ امام اور مقتدی کی نیت اگر مختلف ہو تب بھی دونوں کی نماز صحیح ہوگی۔ مثلاً امام کی نیت نفل پڑھنے کی ہے اور مقتدی کی فرض کی یا امام نماز ظہر اور مقتدی نماز عصر کی نیت کرے یا اس کے برعکس تو دونوں صورتوں میں دونوں کی نماز جائز ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارت نکلتا ہے کہ مقتدی اگر امام کا کوئی فعل ناپسند سمجھتا ہے اور نماز توڑ کر الگ اپنی نماز ادا کر لیتا ہے (اسی جگہ) تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوتی تو حضور ﷺ اسے ضرور تنبیہ فرماتے کہ آئندہ ایسا مت کرنا اور نماز بھی دوبارہ پڑھو۔ ایسا چونکہ نہیں فرمایا اس لئے یہ جائز ہے۔

(۳۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی اس نماز کے ضمن میں نَعَالَى عَنْهَا، فِي قِصَّةِ صَلَاةِ رَسُولِ فرماتی ہیں جو انہوں نے لوگوں کو اس حالت میں اللہ ﷻ بِالنَّاسِ وَهُوَ مَرِيضٌ، پڑھائی کہ آپ بیمار تھے کہ آپ تشریف لائے اور

قَالَتْ: فَجَاءَ حَتَّى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ حضرت ابو بکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ پس آپؓ اُبی بکرؓ، فَكَانَ يُصَلِّي بِالنَّاسِ لوگوں کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت جَالِسًا، وَأَبُو بَكْرٍ قَائِمًا، يَفْتَدِي أَبُو ابو بکرؓ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نبی ﷺ کی بَكْرٍ بِصَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ، وَيَفْتَدِي اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابو بکرؓ کی پیروی (میں نماز النَّاسِ بِصَلَاةِ أَبِي بَكْرٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. پڑھ رہے تھے) (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وہو مریض﴾ یہاں ”واؤ“ حالیہ ہے۔ ایسی حالت میں تشریف لائے جبکہ آپؓ بیمار تھے اور یہ مرض الموت کا واقعہ ہے اور غالب گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آخری نماز ہے جو آپؓ نے باجماعت لوگوں کو پڑھائی۔ اس کے بعد مرض کی شدت کی وجہ سے گھر سے باہر تشریف نہیں لاسکے اور یہ نماز ظہر تھی۔ نبی ﷺ کا ابو بکرؓ کی بائیں طرف بیٹھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ امام تھے کیونکہ امام کے محل و مقام پر کھڑے تھے اور یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتدا میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے موقع پر نماز پڑھانے کے بارے میں ہے۔ واقعہ کی مختصر صورت یہ تھی کہ آپؓ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ اس اثناء میں آپؓ ہی کے ارشاد کے بموجب حضرت ابو بکرؓ لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ ایک دن آپؓ کو قدرے آفاقہ ہوا تو آنجناب ﷺ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابو بکرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپؓ حضرت ابو بکرؓ کے بائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھانا شروع کی۔ آپؓ امام تھے اس لئے بائیں طرف بیٹھے اور ابو بکرؓ مقتدی تھے اس لئے دائیں جانب رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزوری زیادہ ہو گئی تھی اس لئے تکبیروں کیلئے آواز بلند نہیں نکلتی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کبر کا کام دیتے تھے اور آپؓ کی تکبیروں کو بلند آواز ہے لوگوں کو پہنچاتے تھے تو وہ ارکان نماز ادا کرتے تھے۔ اس حدیث سے شواہد نے استدلال کیا ہے کہ راتب اور افضل امام کے آنے پر دوسرے امام کو اپنی جگہ دے دینی چاہئے۔ مگر ابن عبدالبر نے اسے آنحضرت ﷺ کا ہی خاصہ قرار دیا ہے۔

(۳۲۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمُ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَّةَ، فَإِذَا صَلَّى وَخَدَهُ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے تو اسے قراءت میں تخفیف کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ مقتدیوں میں بچے، بوڑھے، کمزور اور حاجت مند لوگ ہوتے ہیں ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے پڑھے۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب فرائض امامت ادا کر رہا ہو تو اس وقت نماز

میں لمبی لمبی قراءت سے احتیاط کرنی چاہئے اس لئے کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ سب کی ضروریات و حاجات پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ البتہ جب ایک آدمی اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے اپنے اشغال، ضروریات اور حالات کا اچھی طرح علم ہوتا ہے تو ایسے آدمی کو فرصت اور قوت کے اوقات میں جتنی چاہے لمبی قراءت کرے اسے اختیار ہے مگر بیماری اور ضرورت کے وقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کسی صورت میں بھی درست اور جائز نہیں۔ شریعت نے نفس کا بھی حق رکھا ہے۔

(۳۲۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے قَالَ: قَالَ أَبِي: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ حَقًّا، قَالَ: «فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤْذَنُوا أَحَدُكُمْ، وَلْيُؤْمِّتْكُمْ أَحَدُكُمْ قُرْآنًا»، قَالَ: ایا شخص کرائے جو قرآن حمید کا زیادہ عالم ہو۔ ”عمرو فَنَظَرُوا، فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْآنًا مَنِّي، فَقَدَّمُونِي، وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعٍ سِنِينَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ اس وقت میری عمر چھ سات برس کی تھی۔ (بخاری، والنسائی)

(ابوداؤد اور نسائی)

لغوی تشریح: ﴿قال ابی: جئتکم من عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقا﴾ یہ صاحب فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے آنے والے وفد میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے فتح (فتح مکہ) کا اسی طرح انتظار کر رہے تھے جس طرح باقی ماندہ عرب منتظر تھا کہ اس معرکہ آرائی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پس جب فتح مکہ کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا (مکہ فتح ہو گیا) اور اہل عرب کو خوب معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں مبنی بر صداقت اور سراسر حق ہے تو یہ لوگ پے درپے اسلام لانے کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ﴿فلم یکن احد اکثر قرآنا منی﴾ ان میں مجھ سے زیادہ ایک بھی قرآن کا عالم نہیں تھا۔ اس کا سبب اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہمارے پاس سے لوگ گزرتے تھے اور ہمیں یہ اطلاع دیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا: اس طرح فرمایا۔ میں چونکہ ابھی بچہ تھا ان کی زبان سے سن کر قرآن مجید کا کافی حصہ ازبر کر چکا تھا اس لئے میرے قافلہ والوں نے مجھے اپنے لئے بطور امام منتخب کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نابالغ فرض نمازوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ جب فرض نماز کی امامت درست اور صحیح ہے تو نوافل کی جماعت بلااولیٰ کرا سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث نے امام کیلئے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو قرآن مجید زیادہ جانتا ہو، امامت کے منصب کیلئے اسی کا انتخاب کیا جائے۔ جیسا کہ عمرو بن لُحیہؓ کو اس کی قوم کے لوگوں نے منتخب کیا۔ اس حدیث سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ امامت کا منصب اذان کے منصب سے افضل ہے اس لئے کہ مؤذن کیلئے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی صرف حسن صوت اور بلند آواز والا ہونا چاہئے۔ چھ سات سالہ بچے کو امام مقرر کرنا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اسے دوسروں کے مقابلہ میں قرآن زیادہ یاد تھا۔ حسن بصریؒ، امام شافعیؒ، ابن راہویہؒ اور ابوالحدیث اس کے قائل ہیں کہ نابالغ لڑکے کی امامت میں بڑے بوڑھے لوگوں کی نماز درست ہے مگر امام مالکؒ اور امام ثوریؒ وغیرہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے دو قول منقول ہیں دونوں میں مشہور قول یہ ہے کہ بچہ (نابالغ) کی امامت میں نفل نماز درست ہے اور فرض نماز جائز نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام نہ تو حضور ﷺ کے فرمان کے تحت مقرر کیا گیا اور نہ ہی آپؐ سے پوچھ کر اس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ اس کا تقرر و انتخاب اگر درست نہ ہوتا تو نبی ﷺ بذریعہ وحی لازماً اسے آئندہ کیلئے روک دیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق اسلام کے بڑے اہم رکن نماز سے ہے اس لئے اگر یہ درست نہ ہوتا تو اسے ضرور ممنوع قرار دے دیا جاتا یا پھر نفلی اور فرضی امامت کی وضاحت کر دی جاتی کہ نفل میں اس کی گنجائش ہے اور فرض میں نہیں۔ ایسا بھی کہیں نہیں لہذا قرین صواب یہی ہے کہ ضرورت کے وقت ایسا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ﴾ سلمہ کے لام کے نیچے کسرہ ہے۔ جرم قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے جری کہلائے۔ ابو یزید یا ابو بريد کنیت تھی۔ اپنے والد کی معیت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ان کی عمر چھ سات برس تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ عمرو بن سلمہ اور قبیلہ بنو سلمہ کے علاوہ باقی تمام جگہ سلمہ کے لام پر فتح ہے اور ان دونوں پر لام کے نیچے کسرہ ہے۔

(۳۲۷) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَوْمَ الْقَوْمِ أَفْرُؤُهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةَ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْمًا - وَفِي رِوَايَةٍ «سِنًا» - وَلَا يَوْمَئِذٍ

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لوگوں کا امام ایسا آدمی ہو جسے قرآن حید کا علم زیادہ ہو۔ اگر اس وصف میں لوگ مساوی ہوں پھر وہ امام بنے جسے سنت نبوی ﷺ کا علم زیادہ ہو اور اگر سنت کے علم میں بھی لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے ہجرت پہلے کی۔ اگر اس وصف میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے پہلے اسلام قبول کیا ہو اور ایک روایت

الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ، وَلَا يَقْعُدُ مِّنْ سَلَامٍ (اسلام) کی بجائے سنا (عمر) کا لفظ بھی فی بَيْتِهِ عَلَى تَكْرِمَتِهِ، إِلَّا بِإِذْنِهِ۔ ہے یعنی اگر مذکورہ بالا اوصاف میں کبھی برابر ہوں تو پھر ان میں جس کی عمر زیادہ ہو اسے امام بنایا جائے۔
رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرہ اقتدار میں امامت نہ کرائے اور نہ گھر میں اس کی مخصوص نشست (بستر) پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اَقْرَبُوهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ﴾ اس جملہ کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ایسا آدمی امام بنے جسے قرآن کا زیادہ حصہ حفظ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو زیادہ جاننے والا یعنی احکام شریعت سے زیادہ واقف ہو لیکن ﴿فَانْكَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمَهُمْ بِالْاِسْنَةِ﴾ سے پہلے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿سَلَامٌ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ اسلام کے معنی ﴿وَفِي رِوَايَةٍ سَنَا﴾ ایک دوسری روایت میں سلام کی جگہ لفظ ”سنا“ بھی منقول ہے ﴿وَلَا يَوْمَنَ﴾ امامت سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے اور نون اس جگہ نون تاکید ہے (یعنی نون ثقیلہ) ﴿الرَّجُلُ الرَّجُلَ﴾ پہلا الرجل فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿فِي سُلْطَانِهِ﴾ اس کے دائرہ اقتدار میں، ہ کی ضمیر اس میں دوسرے آدمی کی طرف راجع ہے اور اسی طرح ﴿فِي بَيْتِهِ﴾ اور ﴿فِي تَكْرِمَتِهِ﴾ کے قول میں بھی ہ کی ضمیر دوسرے شخص کی طرف جاتی ہے ﴿التَّكْرِمَةُ﴾ ”تاکریم“ پر فتح، کاف ساکن اور ”را“ پر کسرہ۔ ایسے بستر وغیرہ اور نکلنے جو صاحب خانہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ﴿اِلَّا بِاِذْنِهِ﴾ بظاہر یہ اشتیاء دونوں صورتوں کیلئے ہے، امامت اور بستر مخصوص پر بیٹھنا اجازت کے ساتھ مشروط ہے اگر اجازت مل جائے تو دونوں جائز ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے امامت ایسے شخص کے سپرد کی جانی چاہئے جو قرآن کو زیادہ یاد رکھتا ہو، سنت سے باخبر ہو، دین کی خاطر ترک وطن کی سعادت، قبول اسلام میں اولیت رکھتا ہو اور عمر رسیدہ ہو کیونکہ زیادہ امید ہے کہ جس کی عمر دراز ہوگی اس کے اعمال حسنة بھی زیادہ ہوں گے۔

(۳۲۸) وَلَا يَنْبَغُ مَا جَاءَ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَاجَةٍ مِّنْ حَضْرَتِ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ؛ «وَلَا كَوْنِي عَوْرَتِ كَيْسِ مَرْدٍ كَيْسِ امَامٍ نَهْ بَنِي وَر نَهْ كَوْنِي تَوَمَّنْ امْرَاةً رَجُلًا، وَلَا اَعْرَابِيٍّ بَدَوِيٍّ دِيهَاتِي كَيْسِ مَاجِرِ كَيْسِ امَامٍ كَرَأَيْ وَر نَهْ كَوْنِي مَهَاجِرًا، وَلَا فَاجِرٌ مُؤْمِنًا»، وَاسْنَادُهُ فَاجِرٌ كَيْسِ مَوْمِنٍ كَامَامٍ بَنِي۔“ اس روایت کی سند (واہ) ضعیف ہے۔

لغوی تشریح: اس روایت میں دیہاتی و بدوی کا مہاجر کی امامت کی ممانعت کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ بدوی لوگ ابتداء اسلام میں مہاجرین کے مقابلہ میں قرآن کی تعلیم اور علم دین سے کم واقف تھے

﴿واسنادہ واہ﴾ واہ کا معنی ضیعت و کمزور ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن محمد عدوی ایسا ہے جسے وکیع نے وضع حدیث کے الزام سے متمم کیا ہے اور عبد اللہ بن محمد کے شیخ استاد علی بن زید بھی ضعیف ہیں یہ روایت ایک اور سند سے بھی منقول ہے مگر ان میں ایک راوی عبد الملک بن حبیب ایسا ہے جسے احادیث کی چوری کرنے اور سندوں کو خلط ملط کرنے کے الزام سے متمم کیا گیا ہے۔

حاصل کلام: یہ روایت نہایت ہی کمزور سند سے منقول ہے، اس لئے اس سے مسائل کا استنباط کرنا درست نہیں۔

(۳۲۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: ارشاد گرامی ہے ”اپنی صفوں کو مضبوطی سے ملاؤ اور رُصُوا صُفُوفَكُمْ، وَقَارِبُوا بَيْنَهَا، ان کے درمیان فاصلہ کم رکھو اور اپنی گردنوں کو وَحَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ“۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ایک محاذ پر رکھو (برابر برابر رکھو) “ (اسے ابو داؤد وَالْتَسَانِي، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿رُصُوا﴾ ”را“ پر ضمہ اور صادر تشدید ”رص الجدار او البناء“ سے امر ہے یعنی دیوار یا عمارت کی ایک اینٹ کو دوسری کے ساتھ ملا کر یا جوڑ کر اس طرح مضبوط اور پختہ کیا جائے کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ اس سے ”رص الصف“ ہے جس کا مطلب ہے کہ نمازی اپنی صفوں کو ایک دوسرے سے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے کو ملا کر درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑ کر ایسی مضبوطی سے بنائیں کہ چنی ہوئی مضبوطی اور پختہ دیوار معلوم ہوں ﴿وقاربوا بينهما﴾ بایں طور کہ دو صفوں کے درمیان ضرورت سے زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں ﴿وحاذوا بالأعناق﴾ گردنوں کو ایک دوسرے کے بالتقابل رکھیں۔ بایں طور پر کہ سب نمازیوں کی گردنیں ایک ہی صف میں سیدھی معلوم ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نمازی کی گردن امام کی طرف نکلی ہوئی معلوم ہو اور کسی کی پیچھے نکلی ہوئی۔

حاصل کلام: اسلام میں صف بندی اور شیرازہ بندی کی بڑی تاکید اور اہمیت ہے۔ اس کی تربیت و ٹریننگ اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن، نماز میں صف بندی کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ جماد میں بنیان مرصوص کی جتنی ضرورت و اہمیت ہے۔ اس کے بیان کرنے کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں، اشارہ ہی کافی ہے۔ صف بندی میں اگر رخ پڑ جائے یا صفوں میں خلل واقع ہو جائے تو باہمی ربط و ضبط اور محبت میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ اسلام دلوں کو جوڑنے اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور اسلامی برادری میں مساوات کے ذریعہ ایک ہی صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ شیطانی دخل اندازی سے اسے

بچانا اور محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں روایت ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخ موڑ کر فرمایا کہ ”اپنی صفوں کو سیدھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کجی و ٹیڑھ اور مخالفت ڈال دے گا۔“ راوی کا بیان ہے کہ میں نے نمازیوں کو دیکھا کہ جماعت میں اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے اور اپنا قدم ساتھ والے کے قدم سے ملایا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا ”قسم ہے مجھے اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان بھیڑ کے پچہ کی صورت میں گھس جاتا ہے“ یعنی وہ نمازیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خشوع و خضوع سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ توجہ الی اللہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستگی کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں الغرض نماز باجماعت کی صورت میں صف بندی کی بہت تاکید ہے۔ مل کر کھڑا ہونا چاہئے اور درمیان میں قطعاً جگہ نہیں چھوڑنی چاہئے۔

(۳۳۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أُولُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أُولُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں کی بہترین اور سب سے زیادہ خیر و بھلائی والی صف، ان کی پہلی صف ہے اور بدترین اور بڑی صف ان کی آخری صف ہے اور خواتین کی بہترین اور خیر و بھلائی ان کی آخری صف ہے اور بدترین اور بری صف ان کی پہلی صف ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اولہا﴾ پہلی صف سے مراد وہ صف ہے جو امام کے متصل ہوتی ہے۔ ﴿وشرہا﴾ آخری صف ہے جس میں خیر و بھلائی اور اجر و ثواب کم ہو وہ صف ہے جو سب سے آخر میں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو اس صف میں شامل ہو گا وہ گناہ گار ہو گا۔ آخری صف کو شر الصوف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ پہلی صف میں شریک نمازی سے اس کا معاملہ برعکس ہوتا ہے اور خواتین کی آخری صف کو بہترین اور خیر و بھلائی والی صف قرار دیا گیا ہے برعکس مردوں کی صفوں کے کیونکہ خواتین کا آخری صف میں ہونا مردوں سے دور رہنے کا موجب ہے نیز ان کے دیکھنے اور ان کی گفتگو سننے سے دور رہتی ہیں۔

حاصل کلام: جماعت میں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں تفاوت اپنے اندر بھلائی اور بہتری کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلی صف میں شریک نمازی عموماً وہی ہوں گے جو مسجد میں پہلے آئے ہوں۔ مسجد میں پہلے آنا بھی باعث ثواب ہے نیز پہلی صف میں شامل لوگ صاحب علم، بزرگ اور دینی فہم زیادہ رکھنے والے ہوں گے۔ امام کے دوسرے نمازیوں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تلاوت قرآن، تکبیرات سنتے ہیں۔ خواتین سے دور رہنے کی وجہ سے خلل انداز ہونے والے وسوسوں اور برے خیالات سے بچے رہتے ہیں۔ مردوں کی سب سے پچھلی صف میں شریک نمازی ان سے

محروم رہتے ہیں۔ اس لئے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ برائی اور بھلائی دونوں نسبتی معاملات ہیں۔ خواتین کی سب سے آخری صف اس لئے بہتر ہے کہ ایک عورتیں دیر سے مسجد میں آئیں گی۔ مردوں سے دور ہوں گی کیونکہ مرد و زن کا اختلاط اچھے نتائج و ثمرات برآمد نہیں کرتا۔ یہ حکم ایسی صورت واقعہ کیلئے ہے جہاں مردوں اور عورتوں کی صفیں آگے پیچھے ہوں ورنہ اگر عورتیں الگ جگہ میں ہوں تو پھر ان کی بھی پہلی صف بہتر شمار ہوگی یا یہ صورت ہو کہ عورتوں کی جماعت الگ سے ہو اور ان کی امامت (پہلی صف کے درمیان میں کھڑے ہو کر) عورت ہی کر رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی خواتین کی پہلی صف بہترین اجر و ثواب کی مستحق ہے اور آخری کم ثواب کی۔

(۳۳۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ اِيك رَاتِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَاسَاحَةِ نَمَازِ اِدَا كِ مِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقُمْتُ اَبْ كَ بَاسِیْ جَانِبِ كُھْرَا هُوْ كَیَا۔ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنِ یَسَارِهِ، فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَیْچَیْ سَیْ مِیْرَا سِرْ كُھْرَا اُوْر مَجْھَیْ اُپنی دَاسِیْ جَانِبِ بِرَاسِیْ مِیْنِ وَّرَاسِیْ، فَجَعَلَنِیْ عَنْ كُھْرَا كَرَلِیَا۔ (بخاری و مسلم)

یَمِیْنِهِ، مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھنے والے دو ہی شخص ہوں تو مقتدی کو امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اور اگر غلطی و نادانی سے مقتدی بائیں طرف کھڑا ہو جائے تو امام اسے اپنے دائیں طرف کھینچ کر (یا اشارہ سے) کر لے۔ اتنے سے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ فعل بھی نماز ہی کیلئے کیا گیا ہے۔ نماز سے باہر کے کسی کام کیلئے نہیں۔ مقتدی کو بھی فوراً تعیل کر کے بائیں سے دائیں جانب آجانا چاہئے۔ تبدیلی مکان و جگہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی جو تبدیلی نماز کی اصلاح و درستگی کیلئے کی گئی ہو۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے۔ گویا دو کی تعداد جماعت کی تعریف میں آجاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بھی جائز ہے۔

(۳۳۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَمَازَ پڑھائی مِیْنِ اُوْر مِیْتِیْمِ دُونُوْنِ نَیْچَیْ كَ اُپْ كَ اُپْچَیْ نَمَازَ پڑھی اُوْر اِم سَلِیْمِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نَیْچَیْ (تنہا) نَمَازِ اِدَا كِ۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت جائز ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اگر اکیلی ہو تو وہ اکیلی ہی صف میں کھڑی ہوگی۔ مردوں یا بچوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی۔ مرد پہلے بعد میں بچوں کی صف اور آخر میں عورتوں کی صف ہونی چاہئے۔ البتہ ایک آدمی ہو تو بچے کو

ساتھ کھڑا کر کے ایک ہی صف بنانی چاہئے۔ خیر و برکت کے حصول کے نقطہ نظر سے گھر میں کسی نیک شخصیت کی امامت میں نماز نفل پڑھنی جائز ہے۔ ام سلیم راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی خدمت گاری کیلئے پیش کیا تھا۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ عورت اپنے تحت جگر کے ساتھ بھی نماز ادا کرنے کیلئے ایک صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

(۳۳۳) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ أَنَّهُ أَنْتَهَى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ، فَرَكَعَ قَبْلَ أَنْ يَصِلَ إِلَى الصَّفِّ، ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ وَذَكَرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ - ﷺ -: «زَادَكَ اللَّهُ حِرْصًا، وَلَا تَعُدْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ (بخاری)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے نے بتایا کہ وہ نبی ﷺ کے پاس عین اس وقت پہنچے جبکہ آپ رکوع فرما رہے تھے۔ پس انہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تیری حرص و طمع میں اضافہ فرمائے آئندہ ایسا مت کرنا“

ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رکوع کیا صف میں شامل ہونے سے پہلے پھر حالت رکوع ہی میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔

لغوی تشریح: ﴿ولا تعد﴾ بظاہر یہ ”عود“ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے منفرد کی نماز صف کے پیچھے پڑھنا جائز ہے کیونکہ ابوبکرہ نے اپنی نماز کا آغاز صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر نبی ﷺ نے ان کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد لا تعد اس فعل کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے اور رہا یہ معاملہ کہ آپ نے اسے نماز کے لوٹانے اور دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تو وہ اس لئے نہیں دیا کہ اس وقت وہ اس کی حکمت نہیں جانتا تھا اور کسی چیز کا علم نہ ہونا عذر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر بایں صورت نماز صحیح ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تنہا آدمی صف کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس قسم کے معمولی سے فعل کو تو درگزر اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ دوڑ کر کوشش سے پہلی صف میں داخل ہونے کی نیت پہلی مرتبہ کی ہو اور جب فعل ہمیشہ اور مسلسل ہو تو پھر مستقل حکم کا تقاضا کرتا ہے جو صحت پر مبنی ہو یا فساد پر اور جس کی ابتدا اور آغاز درست اور صحیح ہو کوئی ضروری اور لازمی نہیں کہ اس کو باقی رکھنا بھی صحیح ہو۔ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی جیسا کہ آئندہ حضرت وابصہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت پالی، کیونکہ نبی ﷺ نے اسے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ مگر یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اس مسئلہ سے بخوبی آگاہ ہوں کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت

نہیں ہوتی اور یوں انہوں نے رکعت پوری کر لی ہو تو اس صورت میں نماز کو دہرانے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

(۳۳۴) وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبُدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا يُصَلِّي خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الصَّلَاةَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ.

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ایسے آدمی پر پڑی جو صف کے پیچھے تنہا کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اسے نماز کو دوبارہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلَهُ عَنْ طَلْقٍ: لَا صَلَاةَ لِمُنْفَرِدٍ خَلْفَ الصَّفِّ. وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ فِي حَدِيثِ وَابِصَةَ: أَلَا دَخَلَتْ مَعَهُمْ أَوْ اجْتَرَزَتْ رَجُلًا؟

اور اس طرح طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی اور طبرانی نے وابصہ کی حدیث میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ”تو ان کے ساتھ ہی داخل کیوں نہ ہو گیا یا پھر تو کسی نمازی کو پہلی صف میں سے پیچھے کھینچ لیتا۔“

لغوی تشریح: ”الادخلت“ حمزہ استفہام کا ہے ساتھ ہی معنی نفی کا دے رہا ہے یا پھر حمزہ پر فتح ہے اور لام پر تشدید ہے۔ اس صورت میں اسے حرف تخصیص قرار دیا گیا ہے۔ ابھارنے اور برا لگینے کرنے والا حرف ﴿اجترزت رجلاً﴾ اگلی صف میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ دونوں احادیث صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دیتی ہیں۔

حاصل کلام: اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ صف کے پیچھے منفرد (اکیلے) آدمی کی نماز درست ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر اہل علم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ دلیل اس کی یہی حدیث ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے ایسے آدمی کو دوبارہ نماز پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نماز ہو جاتی ہے۔ اس آدمی کو تو آپ نے بطور تنبیہ نماز دوبارہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس بارے میں صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگلی صف کو مکمل اور پورا کیا جائے اگر پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو اکیلے ہی پڑھ لو کیونکہ درمیان میں سے آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں پہلی صف میں خلا پیدا ہو جائے گا جسے پر کرنے کیلئے نمازیوں کو حرکت کرنا پڑے گی اور ایک کنارے سے آدمی کو کھینچ کر لائے گا تو نماز کی حالت میں اتنا چلنا بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ ائمہ رحمۃ اللہ علیہم میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ طبرانی وغیرہ

میں جو پہلی صف سے آدمی کھینچنے کا حکم ہے وہ سداً ضعیف ہے۔

راوی حدیث: ﴿وابعد بن معبد رضی اللہ عنہ﴾ معبد میں ”میم“ کے نیچے کسرہ ”عین“ ساکن اور ”با“ پر فتح۔ ان کی کنیت ابو قرصافہ ہے۔ انصار کے قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تھے۔ قرصافہ میں قاف کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن۔ ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ کوفہ فروکش ہوئے۔ بعد ازاں حیرہ کی طرف چلے گئے۔ ۹۰ھ میں رقبہ میں وفات پائی۔

(۳۳۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: كَبَّرَ آدَمُ فِي الْمَلَأَةِ إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ فَأَمْسُوا إِلَى الْمَلَأَةِ، وَعَلَيْكُمْ السَّكِينَةُ وَالْوَقَارُ، كَرَأَوْ، جَلْدِي أَوْ عَجَلْتِ مَتَّ كَرَو۔ جتنی نماز جماعت وَلَا تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، کے ساتھ پا لو اتنی پڑھ لو اور باقی جو رہ جائے اسے وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا، مَتَّقْ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ (بعد میں) پورا کر لو۔ بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے لِلْبَخَارِيِّ۔

لغوی تشریح: ﴿السَّكِينَةُ﴾ یعنی حرکات میں سکون ہو اور عجب حرکات سے اجتناب ہو ﴿وَالْوَقَارُ﴾ وقار کا معنی سکینت کے قریب قریب ہے۔ وقار انسان کی ہیئت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے دائیں بائیں التفات کئے بغیر نگاہیں بچاتے ہوئے دھیمی آواز سے گفتگو کرنے اور چال ڈھال میں شریفانہ انداز اختیار کرنے کو وقار کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے نمازی جب مسجد میں نماز باجماعت کیلئے آئے تو بڑے آرام و سکون، وقار و عزت کے ساتھ آئے۔ دوڑتا ہوا نہ آئے۔ چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے۔ بولنے کی ضرورت ہو تو دھیمی اور پست آواز سے بولے۔ یوں اطمینان سے آنے کے بعد امام کو جس حالت میں پائے نماز میں شریک ہو جائے باقی نماز کو بعد میں کھڑا ہو کر پورا کر لے۔ ایسی صورت میں مقتدی نے جو نماز امام کے ساتھ پڑھی وہ اس نماز کی پہلی رکعتیں شمار ہوں گی یا بچھلی۔ اس میں ائمہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مقتدی کی بچھلی رکعتیں شمار ہوں گی، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی یہ پہلی شمار ہوں گی۔ یہی بات حدیث کے الفاظ ”فاتموا“ کے موافق ہے۔ نیز یہ بھی مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی یہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں۔ محتاط ترین اور قرین صواب بات یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوگی۔ کیونکہ رکوع میں شامل ہونے کی صورت میں سورۃ فاتحہ اور قیام کی ادائیگی نہیں ہو پاتی، یہ دونوں فرض ہیں۔ دونوں کے فقدان سے نماز کیسے ہوگی؟

(۳۳۶) وَعَنْ أَبِي بَنْدٍ كَعْبٍ حَضَرَ ابْنُ بَنٍ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷺ لَمْ يَأْتِ بِنِصْبٍ مَرُورٍ هُوَ كَمَا رَسُلُ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةُ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكَى مِنْ صَلَاتِهِ وَخَدَهُ، پاكيزہ اور اجر و ثواب کا موجب ہے اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا (پہلی صورت سے بھی) صَلَاتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكَى مِنْ صَلَاتِهِ مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَانَ أَكْثَرَ زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اسی طرح جتنے افراد فَهُوَ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ»۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن

حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازکی﴾ اطہر کے معنی ہیں نہایت پاکیزہ اور بہت ہی اجر و ثواب کا موجب۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی کم از کم تعداد دو ہے۔ ایک امام اور دو سر مقتدی (اور زیادہ کی کوئی حد نہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ نماز اللہ کے نزدیک محبوب ہوگی اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

(۳۳۷) وَعَنْ أُمِّ وَرَقَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَأْتِيَ أَهْلَ دَارِهَا۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ۔ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اسے اپنے گھر والوں کی امامت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت فرائض امامت انجام دے سکتی ہے مگر کن کی؟ اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ گھر کے افراد میں تو مرد بھی ہوتے ہوں گے۔ لہذا اس سے تو عورت کا مرد کی امام بننا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اولاً تو اس حدیث کا راوی عبدالرحمن بن غلام مجہول ہے۔ ثانیاً بعض روایات میں ”نساء اہل دارہا“ کی صراحت ہے کہ گھر کی عورتوں کو نماز پڑھائے۔ مردوں پر فرض نماز کیلئے مسجد میں حاضری ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس لئے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ مرد حضور اکرم ﷺ کی اقتداء کو چھوڑ کر عورت کی اقتداء و امامت میں نماز پڑھتے ہوں۔ مردوں اور عورتوں کی صفوں میں فاصلہ والی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ مردوں کا عورتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ اور یمیم اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب آپؐ نے جماعت کرائی تو ام سلیم اپنے بچوں کے ساتھ بھی کھڑی نہیں ہوئی۔ جب اپنے لخت جگر کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تو امامت کیسے کرائے گی۔ عورت جماعت کی امامت کے وقت مرد امام کی طرح الگ صف میں تنہا کھڑی نہیں ہوگی بلکہ بقول امام شوکانی رحمہ اللہ عورتوں کے ساتھ ہی پہلی صف میں وسط صف میں کھڑی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسی طرح نماز پڑھاتی تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ام ورقہ رضی اللہ عنہا﴾ بنت نوفل یا بنت عبد اللہ بن حارث۔ انصار میں سے تھیں۔ انہوں نے سارا قرآن سینے میں جمع کر رکھا تھا۔ غزوہ بدر میں شریک ہونے کی آپؐ سے اجازت طلب کی مگر آپؐ نے ان کو اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو اپنے گھر ہی شہادت کا مرتبہ ملنے والا تھا۔ آپؐ اس سے ملاقات کیلئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کو شہید کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ اس کے دو غلام (غلام اور لونڈی) تھے جن کو انہوں نے مدبر کر رکھا تھا (ان کی موت کے بعد از خود آزاد ہو جائیں گے) مگر ان دونوں نے مل کر رات کے وقت ان کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر مار دیا اور خود راتوں رات فرار ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گرفتار کر دیا اور دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلے مصلوب ہیں۔ یہ خاتون تھیں جو حضور ﷺ کی اجازت سے اہل محلہ کی امامت کراتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو قرآن مجید اذہر تھا۔

(۳۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَخْلَفَ ابْنَ امِّ مَكْتُومٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كِرَاتِي تَحْتَهُ جَبَلًا وَهِيَ نَابِيَا تَحْتَهُ (اس روایت کو احمد، اعمیٰ، رواہ أحمد وأبو داود، وفتح لابن جبان عن عائشة۔) حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے نقل کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو اپنا نائب مقرر کرنا جائز ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نابینا کی امامت درست اور جائز ہے۔ تیسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا دوسروں کی بہ نسبت علم شریعت کا زیادہ عالم ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ افضل کی موجودگی میں دوسرا بھی نائب مقرر کیا جاسکتا ہے۔ یہ نابینا صحابی عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں غالباً تیرہ مرتبہ اپنا نائب مقرر فرمایا اور غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامی امور وغیرہ کیلئے اپنا نائب مقرر فرمایا اور عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں نماز کی امامت کیلئے مقرر فرمایا۔

(۳۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ ابْنَ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلُّوا عَلَى مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَصَلُّوا خَلْفَ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ» (اس کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔) (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿صلوا علی من... الخ﴾ جس آدمی نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیا خواہ وہ نیک ہو یا بد اس کی نماز جنازہ پڑھو اور اسی طرح ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھو جو جس نے کلمہ شہادت کہا۔ حدیث

سند کے اعتبار سے اگرچہ کمزور اور ضعیف ہے مگر محققین کے نزدیک اس پر عمل کرنا قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ اصول اور روایات اس کی صحت کی تائید کرتی ہیں کہ جس شخص کی نماز صحیح ہے، اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ ہاں یہ مناسب ہے کہ فاجر آدمی کو امامت کیلئے آگے نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مکروہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فرائض کی پروا نہ کرنے والے کلمہ گو آدمی کی نماز جنازہ درست ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے تو قائل ہیں مگر راہزن اور باغی کی نماز جنازہ کے قائل نہیں۔ بہر حال علماء اور بزرگ لوگوں کو فاسق و فاجر اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ”جاؤ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔“

(۳۴۰) وَعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَنَى أَحَدُكُمْ پڑھنے کیلئے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی الصَّلَاةَ، وَالْإِمَامُ عَلَى حَالِهِ، میں امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔“ (ترمذی نے اسے قَلْبِيَصْنَعُ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ»۔ رَوَاهُ ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ بعد میں شامل ہونے والا نمازی جس حالت میں امام کو پائے اسی میں شامل ہو جائے۔ امام اگر رکوع میں ہے تو اسے بھی رکوع میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور امام کو سجدہ کی حالت میں پائے تو اس کو سجدہ میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور اگر امام بیٹھا ہو تو مسبوق کو بھی اسی حالت میں بیٹھ جانا چاہئے۔ ترمذی کی یہ حدیث گو سند ضعیف ہے مگر دوسری صحیح احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

۱۱ - بَابُ صَلَاةِ الْمَسَافِرِ

وَالْمَرِيضِ

(۳۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا فُرِضَتْ الصَّلَاةُ رَكْعَتَانِ، فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ، وَأُتِمَّتْ صَلَاةُ الْحَضَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ابتدا میں دو رکعات فرض کی گئی تھیں (سفر و حضر میں) جتنی نماز فرض کی گئی وہ دو رکعت تھی۔ اسے (سفر کی نماز کو) باقی رکھا اور حضر (مقیم) کیلئے نماز مکمل کر دی گئی۔ (چار رکعتیں کر دی گئیں) (بخاری و مسلم)

وَلِلْبَحَارِيِّ: ثُمَّ هَاجَرَ، فَقَرِصَتْ
أَزْبَعًا، وَأَقِرَّتْ صَلَاةَ السَّفَرِ عَلَى
الْأَوَّلِ.

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ نے
ہجرت کی تو چار رکعت فرض کر دی گئیں اور سفر کی
نماز پہلی حالت پر برقرار رکھی گئی۔

وَرَادَ أَحْمَدُ: إِلَّا الْمَغْرِبَ، فَإِنَّهَا وَتُرُ النَّهَارَ، إِلَّا الصُّبْحَ، فَإِنَّهَا تَطَوَّلُ فِيهَا الْقِرَاءَةُ. احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے ”سوائے نماز مغرب کے کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور بجز صبح کی نماز کے کیونکہ اس نماز میں قرأت لمبی کی جاتی ہے۔

نفلوی تشریح: ﴿اول ما فرضت الصلاة﴾ حضور و سفرو دونوں میں رکعتیں دو، دو رکعتیں مغرب کی نماز کے علاوہ۔ گرائمر کے اعتبار سے اول مبتداء ہے اور رکعتان اس کی خبر ہے اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے، یعنی منصوب ہے اور اس کا منصوب ہونا اس لئے درست اور صحیح ہے کہ یہ قائم مقام خبر کا حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فاقرت﴾ اقرار سے ماخوذ ہے، صیغہ مجہول، معنی ہے کہ ان کو دو رکعت کی حالت پر برقرار رکھا گیا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔ ﴿واتممت﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ یعنی مکمل کر دی گئی۔ ﴿صلاة الحضر﴾ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور وہ چار پوری ہو گئیں۔ الحضر میں ”حاضر“ اور ”ضاد“ دونوں پر فتح ہے۔ سفر کے مقابلہ میں حضر کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سفر میں قصر کرنا فرض ہے اور اسے پورا پڑھنا جائز نہیں بعینہ جس طرح حضر میں چار رکعت پر اضافہ جائز نہیں۔ مدار استدلال لفظ ”فرضت“ اور ”اقرت“ ہے یعنی فرض کی گئی، برقرار رکھی گئی کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دو رکعتیں فرض ہیں رخصت نہیں اور فرائض میں نہ کمی و بیشی کرنا جائز ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ ”فرضت“ کا لفظ ”قدرت“ کے معنی کا احتمال رکھتا ہے، اس صورت میں اس میں کوئی دلیل نہیں بنتی بلکہ یہ تو تعبیر کے انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے جو محض حضور و سفر کے فرق کے بیان کرنے کیلئے آیا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس میں کوئی اشارہ رخصت یا عزیمت کی طرف پایا جاتا ہو، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راویہ ہیں انہوں نے سفر میں قصر نماز بھی پڑھی ہے اور پوری بھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور سفر کی نماز دو، دو رکعت فرض تھی، بعد میں سفر کی نماز کو علی حالہ رکھا گیا البتہ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں نماز قصر کا جو بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز ہے واجب نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے جبکہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور اسے رخصت پر محمول کرتے ہیں اور یہی قول رائج ہے۔ دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بسند حسن مروی ہے کہ دوران سفر میں نے پوری نماز پڑھی۔ آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے میری تحسین کی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اتباع میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر متاخرین نے اس حدیث کو ضعیف

قرار دیا ہے جو صحیح ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

(۳۴۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقْصُرُ فِي السَّفَرِ وَيَتِمُّ، وَيَصُومُ وَيُفْطِرُ. رکھتے بھی تھے اور افطار بھی کر لیتے تھے۔ (دارقطنی) رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرَوَاهُ يَفَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ مَعْلُومٌ، اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر حدیث معلول ہے اور وَالْمَحْفُوظُ عَنْ عَائِشَةَ مِنْ فَعْلِهَا، وَقَالَ: إِنَّهُ لَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذاتی فعل کی صورت میں مَحْفُوظ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ يَشُقُّ عَلَيْهِ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ.

”روزہ مجھ پر گراں نہیں۔“ (بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿يقصر﴾ قصر فرماتے۔ یعنی کبھی چار رکعتوں والی نماز، دو رکعتیں ہی ادا فرماتے۔ قصر، يقصر۔ باب نصر ينصر کے وزن پر ہے۔ ﴿ويتم﴾ پوری نماز ادا فرماتے۔ یعنی چار رکعتیں پوری ادا فرماتے۔ ﴿ويصوم﴾ سفر میں بھی کبھی روزہ رکھتے اور ﴿يفطر﴾ کبھی افطار فرما لیتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا مسافر کیلئے دونوں طرح رخصت ہے اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سفر میں قصر و افطار پر عمل کرے چاہے نہ کرے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے البتہ فرمایا ہے کہ یہ معلول ہے۔ غالباً علت یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کے معارض ہے کہ آپ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ علت صحیح نہیں دونوں میں تطبیق ممکن ہے کہ کبھی اتمام کرتے اور اکثر و بیشتر قصر کرتے۔ ویسے بھی طے شدہ اصول ہے کہ مثبت ثانی پر مقدم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۴۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخْصَةٌ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کو یہ اسی طرح پسند ہے کہ جن کاموں میں اس نے رخصت عنایت فرمائی ہے، ان میں رخصت پر عمل کیا جائے، جس طرح اسے یہ ناپسند ہے کہ معصیت والے کاموں کو کیا جائے۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ ”جیسا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کے تاکید احکام (فرائض) کو ادا کیا جائے“

لغوی تشریح: ﴿ان توتی﴾ گرائمر میں یہ مجہول واقع ہوا ہے اور ﴿رخصہ﴾ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ”را“ پر ضمہ اور ”خا“ پر فتح رخصہ کی جمع ہے، یعنی جن امور میں رخصت کی گنجائش دی گئی ہے ان میں رخصت پر عمل کیا جائے۔ ﴿عزائمہ﴾ کی جمع ہے اور یہ رخصت کے بالقابل ہے۔ رخصت کا مفہوم یہ ہے کہ شارع نے بعض واجبات کی ادائیگی میں شدت اور تکلیف کی وجہ سے یا کسی عذر کی بنا پر چھوڑنے کی اجازت دے دی ہے اور بعض محرمات کو ضرورتاً مباح قرار دے دیا ہے اور عزیمت، رخصت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ عملایہ اگرچہ تعداد میں مکمل چار رکعتیں پڑھنے سے کم ہے مگر افضل یہی دو رکعتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنا اللہ کے ہاں اسی طرح محبوب ہے جیسے عزیمت پر عمل کرنا محبوب اور پسندیدہ ہے۔

(۳۴۴) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ مَسِيرَةً ثَلَاثَةَ أَمْيَالٍ أَوْ تَشْرِيفَ لَمَّا جَاءَتْهُ تِلْكَ الدُّوْرَةُ (نماز قصر) ادا فرماتے ثَلَاثَةَ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ تَحْفَظُ (مسلم)

مُسْنَدُ

لغوی تشریح: ﴿امیال او فراسخ﴾ اس حدیث کے سند کے ایک راوی شعبہ نے ”او“ بیان کر کے اپنے شک کا اظہار کیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف احوال بیان کرنا مقصود ہے۔ ”امیال“ میل کی جمع ہے۔ میل کی مقدار کیا ہے، کتنی ہے اس بارے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چھ ہزار ہاتھ جتنی مسافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چار ہزار ہاتھ اور ایک ہاتھ کی لمبائی ان دونوں اقوال میں۔ چوبیس انگشت ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ تین ہزار ہاتھ کے برابر اور ہاتھ سے مراد ہے بتیس انگشت۔ دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ تقریباً ایک ہی مقدار بنتی ہے۔ فقط تعبیر کا فرق ہے۔ رہا ”فراخ“ تو یہ فرسخ کی جمع ہے۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اور یہ لفظ فارسی زبان کے فرسخ سے معرب ہے اور تین فرسخ ساڑھے چوبیس کلومیٹر کے مساوی ہوتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک میل چھ ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے تو پھر تین فرسخ کا فاصلہ پونے سترہ کلومیٹر فاصلہ کے مساوی بنتا ہے۔ یہ فاصلہ کا تعین اندازاً ہے یقینی اور حتمی نہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نو میل کی مسافت سے سفر پر نکلنے کا عزم کیا ہو اس کیلئے قصر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ وہ مسافت جس میں نماز قصر پڑھی جائے کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ مسافت چار برد ہے (اڑتالیس میل) اس کی دلیل آئندہ آئے گی۔ رہی یہ حدیث تو اس کے مطابق کسی فقہیہ کا قول ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کوئی

فقہمہ اس طرف جاتا تو اس کیلئے بڑی قوی وجہ موجود تھی۔ ہمارے زمانے کے علماء اہلحدیث کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ نو میل کی مسافت پر قصر کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں وارد الفاظ ”میل“ ”فرخ“ کی تعریف تو اوپر ہو چکی ہے کہ نماز قصر کیلئے کتنی مسافت ہونی چاہئے۔ اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ قصر نماز کیلئے کوئی مسافت محدود و متعین نہیں ہے۔ مطلق سفر سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جب کوئی کسی مسافت کو سفر خیال کرے وہاں قصر نماز پڑھے۔ بلاشبہ قرآن مجید میں قصر کیلئے مطلقاً سفر کا ذکر ہے، جیسے سفر میں تیمم کے لئے سفر کی کوئی تعین نہیں مگر اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین میل کا سفر بھی شرعی سفر شمار ہوتا ہے لیکن راوی حدیث امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ تین میل یا تین فرسخ کے قائل تھے۔ جس سے علماء نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ یہاں تین فرسخ مراد لئے جائیں اور تین فرسخ سے نو میل مسافت بنتی ہے لہذا نو میل مسافت پر نماز قصر ادا کی جاسکتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ تین میل تک مسافت کو نماز قصر کے لئے جائز قرار دیا ہے بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک میل پر بھی جائز ہے۔ مگر ان کی پشت پر مضبوط عقلی و نقلی ثبوت نہیں ہے اور بعض حضرات نے ۳۶ میل اور بعض نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل کی مسافت مقرر کی ہے۔ بہر حال یہ سب قیاسات پر مبنی ہیں کسی کی تائید میں صحیح حدیث موجود نہیں۔ رہی چار برد والی روایت کہ چار برد (اڑتالیس میل) سے کم مسافت پر قصر جائز نہیں، سو یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے نیز اس کے ایک راوی عبد الوہاب بن مجاہد بن جبیر کی روایت کو ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے بلکہ ثوری نے تو اس کو کذاب کہا ہے، اس لئے یہ استدلال کے لائق نہیں۔

(۳۴۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلَى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّي رُعَتَيْنِ رُعَتَيْنِ، حَتَّى رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکل کر مدینہ سے مکہ تک کا سفر کیا، آپ مدینہ واپسی تک دو دو رکعتیں ہی ادا فرماتے رہے۔ (بخاری و مسلم۔ البتہ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی اپنے گھر سے سفر کی نیت سے نکل پڑے تو وہ مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے۔ حدود شرعیہ یعنی موجودہ اصطلاح میں میونسپلٹی کی حدود سے نکلنے کے بعد خواہ ایک میل کا سفر طے کیا ہو نماز قصر ادا کرنا شروع کر سکتا ہے اور واپسی تک دو گانہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

(۳۶۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ عَشْرَ يَوْمًا يَقْصُرُ وَفِي

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ۱۹ روز قیام فرمایا آپ قصر ہی فرماتے رہے اور ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں ۱۹ روز قیام

لَفِطٌ: «بِمَكَّةَ، تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا». فرمایا۔ (بخاری) اور ابو داؤد کی روایت میں ۷ روز ہے
 رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ: «سَبْعَ عَشْرَةَ». وَفِي أُخْرَى: «خَمْسَ عَشْرَةَ»۔
 وَلَهُ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ: کہ آپ کی مدت قیام اٹھارہ دن تھی اور اسی میں
 «ثَمَانِي عَشْرَةَ». وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ: أَقَامَ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپ نے تبوک میں
 بِتَبُوكَ عَشْرِينَ يَوْمًا يَقْضُرُ الصَّلَاةَ. بیس دن قیام فرمایا اور نماز قصرا کرتے رہے، اس
 رَوَاتُهُ نَفَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ اخْتَلَفَ فِي روایت کے راوی ثقہ ہیں، مگر اس کے موصول
 وَضَلِيهِ ہونے میں اختلاف ہے۔

حاصل کلام: مکہ میں مدت قیام کے بارے میں جو مختلف روایات منقول ہیں کہ آپ ایک روایت کی رو
 سے وہاں ۱۹ روز یا ۱۸ روز اور ایک روایت کی رو سے ۷ روز یا پندرہ روز قیام پذیر رہے۔ ان میں سے ہر
 مدت قیام کے حق میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ مدت قیام میں اختلاف فتح
 مکہ کے موقع کا ہے۔ حجة الوداع کے موقع کا نہیں ہے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ وہ تو صرف
 دس روز تھا۔ ان روایات میں جمع و تطبیق کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ روز والی روایت
 دوسری روایات کے مقابلہ میں صحیح ترین اور قوی ترین ہے۔ اس کی تائید اہل مغازی کا وہ بیان ہے کہ نبی
 ﷺ مکہ میں بروز منگل صبح داخل ہوئے وہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور حنین کی جانب بروز ہفتہ چھ
 شوال روانہ ہوئے۔ پس ان ایام کی تعداد، دخول اور خروج کے ایام سمیت ۱۹ روز بنتے ہیں اور ۱۸ روز والی
 روایت تو اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس احتمال کے باوجود کہ راوی کے ذہن میں
 راتوں کی تعداد ہو، دنوں کی تعداد نہ ہو کیونکہ آپ مکہ میں داخل تو دن کو ہوئے تھے اور یہاں سے نکلے
 رات کو تھے۔ یوں ۱۹ دن کی تعداد پوری ہوگئی اور راتوں کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی
 فرق اور منافاة باقی نہ رہا اور اس تاویل کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ شب والی روایت میں لفظ
 لیل (شب) موجود ہے اور سترہ یوم والی روایت کی صورت میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ راوی نے مکہ میں
 دخول اور خروج کے دونوں دن شمار نہیں کئے لہذا دو یوم انیس میں سے نکال دیں تو باقی سترہ ہی رہ جاتے
 ہیں اور رہی پندرہ یوم والی روایت تو وہ روایت شاذ ہے اور ثقہ راویوں کی روایت کردہ روایات کے
 مخالف ہے، لہذا اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ راوی نے سترہ یوم والی روایت کو
 اصل قرار دے کر مکہ میں آپ کے داخل اور خارج ہونے کا دن نکال دیا ہو اس طرح سترہ میں ہے دو
 نکال دیئے جائیں تو باقی پندرہ دن رہ جاتے ہیں۔ ان روایات سے ہر نماز کی مدت کے تعین کا استدلال کرنا
 ہی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سفر تو آپ کا غزوہ اور لڑائی کا سفر تھا۔ محارب کو ہر لمحہ ایسے مواقع پیش
 آسکتے ہیں کہ اسے آگے بھی بڑھنا پڑے اور پیچھے بھی ہٹنا اور واپس ہونا پڑے۔ یہ صورت حال بذات خود

نبی ﷺ کو بھی پیش آئی کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپؐ کو ایک چھوٹا سادستہ مجاہدین کا عزمی کے انہدام کیلئے روانہ کرنا پڑا اور اس دستہ کی قیادت اور امارت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی۔ پھر معاً بعد دو سراسر دستہ سواح بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس لشکر کی قیادت و امارت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔ پھر تیسرا دستہ مئاة بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس کی امارت پر سعد بن زید کو مقرر فرمایا اور پھر چوتھا دستہ جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا اس کی قیادت بھی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ قبائل ثقیف و ہوازن کے اجتماع کی اطلاع ملی تو آپؐ نے خود آگے بڑھ کر ان کا سامنا کیا کہ وادی حنین میں ان سے ٹھبھڑ ہوگئی۔ یہاں پر پھر وہ معرکہ آرائی ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا جو مشہور و معروف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاہد و سپاہی اگر قیام کا ارادہ کرے خواہ فتح یابی و کامرانی کے بعد ہی ہو اس کی نیت معتبر تسلیم نہیں کی جائے گی۔ بلکہ اس کی تو کیفیت اس مسافر کی سی ہوگی جو اس تذبذب و تردد میں مبتلا ہو کہ آج واپسی ہوتی ہے یا کل۔ پس ایسا متردد و متذبذب مسافر ہمیشہ قصر نماز ہی ادا کرتا رہے گا خواہ یہ کیفیت سالوں اور مہینوں پر محیط ہو۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ نبی ﷺ کا فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر قصر نماز ادا فرمانا، قصر نماز کی مدت متعین پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اس بارے میں رائج مسلک وہی ہے جسے ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے کہ جو آدمی داخل اور خارج ہونے کے دونوں ایام کو چھوڑ کر صرف چار روز قیام کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہئے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ نبی ﷺ نے حجة الوداع کے موقع پر مکہ اور گرد و نواح میں دس دن گزارے تھے تو آپؐ ان ایام میں قصر نماز ادا فرماتے رہے۔ آپؐ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح داخل ہوئے اور مکہ سے آٹھ ذی الحجہ کے شروع دن سے نکلے تھے۔ اس دوران آپؐ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے کہ مناسک کی تکمیل فرمائی۔ اس اعتبار سے آپؐ کے قیام کی مدت صرف تین دن بنتی ہے داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دو دن اس سے خارج ہیں۔ آپؐ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے اس مدت سے زیادہ قیام فرمایا ہو اور آپؐ نے قصر نماز ادا کی ہو، یا اس سے کم مدت قیام فرمایا ہو اور قصر نماز ادا نہ فرمائی ہو۔ مناسک حج کی تکمیل کے بعد حضور ﷺ کا مہاجرین کو مکہ میں تین دن سے زائد قیام کرنے سے منع فرمانا بھی ان کی دلیل ہے کہ مسافر اگر چار دن کا ارادہ کرے گا تو مقیم سمجھا جائے گا نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یسود کو حجاز سے جلا وطن کیا پھر ان میں جو تاجر کی حیثیت سے حجاز میں آنا چاہے اسے بھی تین دن قیام کی اجازت دی تھی۔ مصنف نے اسے اپنی کتاب التلخیص الجبر میں نقل کیا ہے اور ابو زرعة نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ۱۹، ۱۸، ۱۷ اور ۱۵ روز قصر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی تطبیق اور روایات کے مابین جمع کی صورت تو اوپر مذکور ہے۔ اس لیے مختلف مکاتب فکر کے ہاں مدت قیام بھی مختلف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں تین دن۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ۱۵ دن۔ مگر جب مسافر حالت تردد میں مبتلا ہو جائے اور واپسی کا حتمی فیصلہ نہ کر پائے تو ایسی صورت

میں بھی اختلاف آراء پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنے اصحاب سمیت اور ایک قول کی رو سے امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایسا تردد و متذبذب مسافر تادم زیست یا واپسی تک قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آذر بایجان میں چھ ماہ تک قصر نماز پڑھی اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نیشاپور سال یا دو سال حالت تردد میں رہنا پڑا تو قصر ہی کرتے رہے۔ اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رامرمز میں نو ماہ تک رکنا پڑا تو وہ قصر ہی کرتے رہے۔ ان واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ تردد اور تذبذب کی حالت میں قصر کی مدت مقرر نہیں ہے، بلکہ جب تک ضرورت کا تقاضا ہو اتنی مدت تک قصر جائز ہے۔

(۳۴۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيغَ الشَّمْسُ، أَخَّرَ الظُّهْرَ إِلَى وَقْتِ الْعَصْرِ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، فَإِنْ زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب زوال آفتاب سے پہلے سفر کا آغاز فرماتے تو ظہر کی نماز کو عصر کی نماز تک مؤخر کر لیتے تھے۔ پھر سواری سے نیچے تشریف لاتے اور ظہر و عصر دونوں نمازوں کو اکٹھی ادا فرماتے اور جب آفتاب آغاز سفر سے پہلے زوال پذیر ہو جاتا تو پھر نماز ظہر ادا فرما کر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةِ الْحَاكِمِ فِي الْأَرْبَعِينَ بِالإِسْنَادِ الصَّحِيحِ: صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ ثُمَّ رَكِبَ.

اور حاکم کی اربعین میں سند صحیح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر کی نمازیں پڑھیں پھر سواری پر سوار ہوئے۔

وَلِأَبِي نُعَيْمٍ فِي مُسْتَخْرَجٍ كَانَ إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ قَرَأَتِ الشَّمْسُ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

اور ابو نعیم کی ”مستخرج“ میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہوتے اور آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو آپ ظہر قَرَأَتِ الشَّمْسُ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

لغوی تشریح: ﴿ارتحل﴾ سفر میں آرام اور استراحت کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کرنا۔ ﴿تزیغ الشمس﴾ آفتاب کا نصف النہار سے مغرب کی جانب زوال پذیر ہونا ”صلی الظہر ثم رکب“ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز ظہر ادا فرماتے تھے، عصر کی نماز کو اس کے ساتھ نہیں ملاتے تھے لیکن حاکم اور ابو نعیم کی روایت میں صاف صاف ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں اکٹھے پڑھا۔ حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے سفر میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جمع تقدیم ہو یا تاخیر دونوں طرح ثابت ہے۔ احناف جمع حقیقی کے قائل نہیں جمع صوری کے قائل ہیں۔ مگر ترمذی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمع

صوری نہیں بلکہ جمع حقیقی تھی۔ چنانچہ اس کا مفہوم ہے کہ جب آفتاب زوال پذیر ہونے سے پہلے آپ سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز فرماتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور مستخرج ابو نعیم کی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے مصنف مرحوم نے ذکر کیا ہے۔

(۳۴۸) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے تو آپ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھتے اور مغرب و عشاء اکٹھی پڑھتے تھے۔ (مسلم)

(۳۴۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقْصُرُوا الصَّلَاةَ فِي أَقَلِّ مِنْ أَرْبَعَةِ بُرُودٍ، مِنْ مَكَّةَ إِلَى عُسْفَانَ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ، كَذَا أَخْرَجَهُ ابْنُ حُرَيْثٍ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر نہ کرو چار برد مکہ سے عسفان تک فاصلہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿برد﴾ ”باء“ اور ”راء“ دونوں پر ضم ہے۔ برید کی جمع ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ لہذا چار برد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ ﴿عسفان﴾ عین پر ضم بیوزن عثمان ہے۔ بڑا قصبہ ہے مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ جس آدمی نے استدلال کیا کہ چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر جائز نہیں اس نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے۔ مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی عبد الوہاب بن مجاہد متروک الحدیث ہے اور امام ثوری رحمہ اللہ نے تو اسے کذاب تک کہا ہے اور ازدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کا اپنے باپ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ لہذا یہ حدیث منقطع اور ضعیف ہے اور ناقابل استدلال ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما خود مکہ اور طائف کے مابین جتنے فاصلہ پر قصر کرتے تھے۔ نیز مکہ اور عسفان اور مکہ اور جدہ کے مابین جتنے فاصلہ پر بھی قصر کرتے تھے اسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطامیں نقل کیا ہے مگر اس میں موقوف روایت سے فاصلہ کی تعیین نہیں ہوئی۔

(۳۵۰) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خَيْرُ أُمَّتِي الَّذِينَ إِذَا أَسَاءُوا سَفَرُوا قَصَرُوا وَوَإِذَا سَأَرُوا قَصَرُوا قَصَرُوا وَوَإِذَا سَفَرُوا قَصَرُوا قَصَرُوا» (اے طبرانی نے ضعیف سند کے بإسناد ضعیف، وَهُوَ فِي مَرَاثِلِ سَعِيدِ بْنِ مُحَمَّدٍ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ مُخْتَصَرًا).

مختصر بیان کیا ہے)

راوی حدیث: (سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ) کبار تابعین کے سردار تھے۔ علم کے اعتبار سے ان سب سے وسیع علم رکھتے تھے۔ انہوں نے فقہ، حدیث، زہد، عبادت اور تقویٰ و ورع کے بارے میں بہت کچھ جمع کیا ہوا تھا۔ یعنی جمع العلوم شخصیت تھے۔ ان کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد ہوئی تھی اور ۹۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ (مسیب) اس میں ”یاء“ پر تشدید اور فتح اور تشدید اور کسرہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

(۳۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ. حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَتْ بِي بَوَاسِيرٌ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ الصَّلَاةِ، فَقَالَ: «صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

(بخاری)

لغوی تشریح: ﴿بواسیر﴾ یہ بہت برا مرض ہے۔ مقعد کے امراض سے تعلق رکھتا ہے۔ مقعد کی رگوں کا پھیل جانا اس کا سبب ہے اور با اوقات خون اس میں سے بہتا ہے۔ بواسیر جمع ہے اس کا واحد باسور ہے۔

حاصل کلام: بیٹھنے کی صورت بعض کے نزدیک چار زانو ہے اور بعض کے نزدیک تشدد کی سی صورت۔ دراصل بات یہ ہے کہ مریض جس طرح آسانی سے بیٹھ سکتا ہے اسی طرح بیٹھے اسے ہر طرح اجازت ہے۔ چت لیٹ کر پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کسی حالت اور کسی پہلو بھی ممکن نہ ہو تو پھر جو صورت اختیار کر سکتا ہو کر لے۔

(۳۵۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَادَ النَّبِيُّ ﷺ اِيک مريض کی عیادت فرمائی تو دیکھا کہ وہ تکیہ پر مَرِيضًا، فَرَاهُ يُصَلِّي عَلَى وِسَادَةٍ نماز پڑھ رہا ہے آپ نے وہ تکیہ دور پھینک دیا اور فَرَمَى بِهَا، وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى زمین پر نماز پڑھ اگر تمہارے بس میں ہے الْأَرْضُ إِنْ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَأَوَّمْ ورنہ سر کے اشارہ سے پڑھ لے۔ ہاں اپنے سجدوں اِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ اَخْفَضَ مِنْ کیلئے رکوع کی بہ نسبت ذرا نیچے جھکو۔“ (بیہقی نے رُكُوعِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ اسے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اس کے موقوف ہونے وَفَّقَهُ. کو صحیح قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿عاد﴾ عیادت سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے کسی مریض سے ملاقات کرنے یا دریافت احوال کو ﴿وسادۃ﴾ تکیہ جو سونے والا اپنے سر کے نیچے رکھتا ہے۔ یہی حدیث اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

(۳۵۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ کو متربعا (چار زانو) ہو کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ يُصَلِّي مُتَرَبِّعًا. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے) الْحَاكِمُ.

لعنوی تشریح: ﴿متربعا﴾ تربیع سے ماخوذ ہے ہے۔ بیٹھنے کی ایک قسم ہے وہ اس طرح کہ اپنا دایاں پاؤں اپنی بائیں ران کے نیچے اور اپنا بایاں پاؤں اپنی دائیں ران کے نیچے بٹھا کر مقعد پر بیٹھنا۔ حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ چار زانو بیٹھ کر بھی نماز جائز ہے۔

نماز جمعہ کا بیان

۱۲ - بَابُ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ

(۳۵۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (دونوں) سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے سنا ہے کہ ”لوگ نماز جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ لازماً غافل اللہ عَلَى قُلُوبِهِمْ، ثُمَّ لِيَكُونَنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لعنوی تشریح: ﴿باب صلاة الجمعة﴾ جمعہ کے جیم اور میم پر ضمہ اور میم پر فتح اور جزم بھی جائز

ہے۔ ﴿اعواد﴾ عود کی جمع جس کے معنی لکڑی ہیں، یہاں مراد منبر کی لکڑی سے ساختہ سیڑھیاں یا یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ اس منبر پر تشریف فرما تھے جو عود سے بنا ہوا تھا۔ یہ منبر ۷ھ یا ۸ھ میں انصاری خاتون کے غلام میمون نامی نے تیار کیا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ پھر بعد میں مروان نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں پہلے منبر کے نچلے حصہ میں چھ سیڑھیاں مزید بنا دیں۔ یہ منبر ۶۵۴ھ تک باقی رہا اور مسجد نبوی جب ۶۵۴ھ میں آگ لگنے سے جل گئی تو یہ منبر رسول ﷺ بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آکر خاکستر ہو گیا۔ (ابن السلام) ﴿عن ودعهم﴾ ”واؤ“ پر فتح اور ”دال“ ساکن، مصدر ہے اور فاعل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿الجمعات﴾ اس کا مفعول ہے یعنی ان لوگوں کا جمعہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ﴿اولیٰ ختمن اللہ﴾ اللہ تعالیٰ لازماً مرگادے گا۔ ﴿علیٰ قلوبہم﴾ ان کے دلوں پر بایں طور کہ دلوں پر زنگ چڑھا دے گا تو یہ لوگ جمعہ کے لطف اور اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے دلوں میں سختی اور سنگ دلی پیدا فرما دے گا۔ ﴿ثم لیكونن﴾ پہلے نون پر ضمہ اور دوسرے پر تشدید۔ جمع کا صیغہ ہے۔ نون ثقیلہ برائے تاکید یعنی ”پھر وہ لازماً ہو جائیں گے۔“

حاصل کلام: جمعہ کے لغوی معنی ایک جگہ جمع ہونے کے ہیں جسے دور جاہلیت میں ”عروبہ“ کہتے تھے۔ اسلام نے اس کا نام جمعہ رکھا کہ مسلمان ایک مخصوص دن میں مخصوص اوقات میں عبادت الہی کیلئے مجتمع ہوں اور مل کر سب اکٹھے عبادت کریں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر بھی ہوں اور اجتماعی فیصلے بھی کئے جاسکیں۔

اس حدیث سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، اسے بغیر کسی عذر شرعی کے ترک کرنے پر دلوں پر مہر لگ جاتی ہیں اور آدمی دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے آخر کار منافقین و غافلین کے زمرہ میں شامل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا نماز جمعہ کو معمولی سمجھ کر اس بارے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرنا رسوائی اور خذلان کا موجب ہے اور توفیق الہی سے محروم رہنے کا باعث ہے۔

(۳۵۵) وَعَنْ سَلْمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ حَضْرَتِ سَلْمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا رَسُولِ اللَّهِ ﷺ کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے۔ جمعہ نَصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْجُمُعَةَ، سے فارغ ہو کر جب ہم اپنے گھروں کو جاتے تو اس ثَمَّ نَنْصَرِفُ وَلَيْسَ لِلْحَيِطَانِ ظِلٌّ وقت دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم سایہ میں نَسْتَظِلُّ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. بیٹھ کر آرام کر لیتے (یا سایہ میں چل کر گھر پہنچ جاتے) وَفِي لَفْظٍ لِّمُسْلِمٍ: كُنَّا نَجْمَعُ مَعَهُ. (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں) إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ نَرْجِعُ، نَتَّبِعُ اور مسلم میں ہے کہ آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا الفیاء۔ کرتے جب زوال ہو جاتا پھر واپس ہوتے۔

لغوی تشریح: ﴿حیطان﴾ حائط کی جمع، دیوار کے معنی ہیں۔ ﴿ظل نستظل بہ﴾ دیواروں کا اپنا

اصلی سایہ اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس میں قدرے آرام کر سکتے۔ اس سے اصل سایہ کی نفی مراد نہیں ہے۔ اس حدیث سے قبل از زوال آفتاب نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں جمعہ کو جلدی ادا کرنے کی دلیل ضرور ہے کہ جو نبی زوال آفتاب ہو جمعہ کی نماز ادا کر لی جائے۔ ﴿کنا نجمع﴾ تجمیع سے ماخوذ ہے ہم نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ ﴿ننتبع﴾ جستجو کر کے تلاش کرتے تھے۔ ﴿الفیئی﴾ سایہ، ایسا اس لئے ہم کرتے تھے کہ زوال کے آغاز ہی پر جلد ہم نماز ادا کر لیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ بہت جلد ادا کی جاتی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے بہر حال نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وقت بھی نماز ظہر کا وقت ہی ہے۔ علماء اسلام کی اکثریت اسی طرف ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے بھی ہو جاتا ہے۔ نیز امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خطبہ جمعہ تو زوال سے پہلے جائز ہے مگر نماز درست نہیں وہ زوال آفتاب کے بعد ہی ہے۔ اس دور میں جمعہ کی نماز ظہر کی نماز سے بھی زیادہ دیر سے پڑھتے ہیں جو سراسر حضور ﷺ کے عمل کے مخالف ہے۔ خطباء و ائمہ مساجد کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سلمہ بن اکوع رحمہ اللہ﴾ ابو مسلم ان کی کنیت ہے۔ سلمہ بن عمرو بن اکوع اور اکوع کا نام شان بن عبد اللہ اسلمی مدنی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں نہایت بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے تیز رفتار تھے کہ دوڑنے میں گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بہت سخی، فاضل اور بھلائی کا پتلا تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۳۵۶) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ حَضَرْتُ سَلَّ بْنَ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلَا نَتَغَدَّى إِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ. (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم مُتَقَّى عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ) حضرت سہل بن سعد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ (جمعہ) رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلَا نَتَغَدَّى إِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ. کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم مُتَقَّى عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ) کے ہیں اور ایک روایت میں ہے ”یہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا۔“

لغوی تشریح: ﴿نقیل﴾ قیلولہ سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ قیلولہ دوپہر کے وقت ذرا ستانے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ نیند نہ آئے ﴿نتغدی﴾ غداء سے ماخوذ۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نصف النہار سے قبل نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ مگر اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ ”قیلولہ“ اور ”غداء“ کا اطلاق زوال کے بعد پر مجاز کیا گیا ہے اور مدینہ و مکہ میں لوگ قیلولہ اور دوپہر کا کھانا نماز ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری سے ثابت ہوتا ہے۔ ﴿وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ﴾ (۵۸/۲۴) یعنی جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیا کرتے تھے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں نماز جمعہ جلدی ادا کی جاتی تھی۔ صحابہ کرامؓ نماز جمعہ کے بعد گھر واپس جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے پھر دوپہر کا آرام (قیلولہ) کرتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سہل بن سعد رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو العباس ہے۔ خزرجی ساعدی انصاری ہیں۔ ان کا اسم گرامی حزن تھا۔ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے سہل رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ برا نام ہو تو اسے بدل دینا چاہئے۔ جب آپؐ کی وفات ہوئی اس وقت سہل پندرہ برس کے تھے۔ ۹ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہی صحابی تھے۔ ان سے تقریباً ایک سو احادیث مروی ہیں۔

(۳۵۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ كَهْرُءَ هُوَ كَرِ ارْشَادَ فَرَمَايَا كَرْتَي تَحَيَّ كَه شَام سَيَخْطُبُ قَائِمًا، فَجَاءَتْ عِيْرٌ مِّنْ اِيْكَ تَجَارَتِيْ قَافِلَهٗ اَكْيَا۔ سَب لُوك اِس قَافِلَهٗ كِي الشَّامِ، فَانْفَتَلَ النَّاسُ اِلَيْهَا، حَتَّى طَرَفَ چھٹ گئے سَرَف بارَه اَدِيْ خُطْبَه سَنَنِي كَيْلَيَّ بَاقِي لَمْ يَبْقَ اِلَّا اِنَّا عَشَرَ رَجُلًا۔ رَوَاهُ رَه گئے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عبر﴾ عین کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ ساکن۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹ۔ مراد اس جگہ تجارتی قافلہ ہے۔ ﴿فانفتل﴾ جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگ گئے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ مسنون یہی ہے اور خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا۔ نماز کے بعد نہیں۔ نیز ثابت ہوا کہ بارہ افراد بھی ہوں تو جمعہ درست ہے۔ شوافع نے جو چالیس کی تعداد کو ضروری قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں۔

(۳۵۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَذْرَكَ رَحْمَةً مِّنْ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا فَلْيُضِفْ اِلَيْهَا أُخْرَى، وَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُهُ»۔ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهٗ وَالْذَاقَطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَاسْتَاذُهُ صَحِيْحٌ، لَكِنْ قَوَى أَبُو حَاتِمٍ اِزْسَالَهُ۔ اس کی سند صحیح ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو قوی قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿فلیضف﴾ اضافہ سے ماخوذ ہے۔ لام اس میں امر کا ہے۔ مطلب ہے کہ اسے ساتھ ملا لے ﴿اخری﴾ دوسری رکعت۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمعہ کی ایک رکعت پالینے والا دوسری رکعت ساتھ ملا کر دوسری رکعت پوری مکمل کر لے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک رکعت ہی پاسکے گا اس کا خطبہ جمعہ تو فوت ہوگا۔ مگر جمعہ اس کا صحیح ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں کی یہی رائے ہے۔ خطبہ جمعہ میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ مصنف رحمہ اللہ نے گویا اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے مگر التخصیص میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن (من ادرک الركعة فقد ادرک الصلاة) کی صحت میں تو کسی کو کلام نہیں۔ جس کے عموم میں جمعہ بھی شامل ہے۔

(۳۵۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُومُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا، ثُمَّ يَجْلِسُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا، فَمَنْ أَنْبَأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِسًا فَقَدْ كَذَبَ. كَرَّ خُطْبَةُ ارشاد فرماتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔
(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿انباء﴾ (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ جو تمہیں خبر دے، اطلاع دے۔
حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ جمعہ کے دو خطبے ہیں۔ دونوں کے درمیان بیٹھنا منسوخ ہے اور آپؐ دونوں خطبے کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ شرعی عذر کے بغیر ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی اگر منسوخ سمجھ کر کی جائے تو بدعت ہوگی۔ ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ سب کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ بعض احادیث سے آپؐ کا منبر چڑھ کر مقتدیوں کے رخ ہو کر السلام علیکم فرمانا بھی ثابت ہے۔

(۳۶۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ أَحْمَرَتْ عَيْنَاهُ، وَعَلَا صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتَّى كَأَنَّهُ مُنْذِرٌ جَنِيحٌ يَقُولُ: «صَبَحَكُمْ وَمَسَاكُمْ»، وَيَقُولُ: «أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ، فَرَمَاتے ”حمد و صلاۃ کے بعد۔ بہترین بات اللہ کی

وَحَيْرَ الْهَدْيِ هَذِي مُحَمَّدٌ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ کاموں میں بدترین کام نئے کام ہیں (بدعت کے کام) اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: كَانَتْ خُطْبَةُ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: يَحْمَدُ اللَّهَ، وَيُبْنِي عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِنْزِلِ ذَلِكَ، وَقَدْ عَلَا صَوْتُهُ.

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے جمعہ کے روز نبی ﷺ کا خطبہ (یوں) ہوتا تھا کہ اللہ کی حمد اور اللہ کی ثناء بیان کرتے پھر اس کے بعد (خطبہ) فرماتے تو آپ کی آواز بلند ہوتی۔

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ».

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے ”جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دے یا جسے راہ ہدایت پر گامزن فرما دے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ جسے وہ گمراہ کر دے پھر اسے راہ ہدایت دکھانے اور چلانے والا کوئی نہیں۔“ اور نسائی میں ہے ”وکل ضلالۃ فی النار“

ہر گمراہی انجام کار آگ میں داخلہ کا موجب ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کانہ منذر﴾ یعنی اس شخص کی طرح جو اپنی قوم کو لشکر عظیم سے ڈراتا ہے جو غارت گری کرنے والا ہے۔ ﴿یقول﴾ وہ ڈرانے اور متنبہ کرنے والا اس قوم سے مخاطب ہے ﴿صبحکم﴾ باب تفعیل سے یعنی دشمن صبح سویرے تم پر یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ ﴿مساکم﴾ یہ بھی باب تفعیل سے ہے یعنی دشمن شام کے وقت تم پر حملہ آور ہو۔ دونوں کا مفہوم ہے کہ بالکل قریب ہے کہ دشمن تم پر نازل ہو جائے۔ ﴿الہدی﴾ ”ہاء“ پر فتح اور دال ساکن۔ راستہ اور طریق کے معنی۔ ﴿محدثاتہا﴾ ﴿فی نئی چیزیں بدعتیں۔ جن کا نہ ثبوت کلام الہی میں ہو اور نہ سنت نبویؐ میں۔﴾ یشنی علیہ اثنی یشنی باب افعال سے ثاء سے ماخوذ ہے ”یاء“ پر ضمہ اور نون پر کسرہ۔ تعریف اچھے اوصاف و اعمال پر ﴿ثم یقول علی الرذالک﴾ یعنی اس کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے ”اثر“ حمزہ پر فتح بھی ہے اور کسرہ بھی آسکتا ہے۔ ﴿من یهد اللہ﴾ یہ جملہ آپ حمد کے بعد اور شہادت سے پہلے ادا فرماتے ﴿وکل ضلالۃ﴾ کو ﴿کل بدعۃ ضلالۃ﴾ کے بعد کہتے۔ اس حدیث سے یہ تقسیم ثابت نہیں ہوتی کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سینہ اور دوسری بدعت حسنہ۔ بلکہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہی ہے خواہ حسنہ ہو۔ سطحی عقل و خرد کے مالک حضرات کے نزدیک۔ اس کی بنیاد دراصل اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو شارح بنانا ہے اور یہ تو کھلی گمراہی و بدراہی ہے اور جو حسنہ (نیکی و بھلائی) ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بدعت ہو اور جو بدعت ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ حسنہ (نیکی و بھلائی) ہو۔

حاصل کلام: یہ وہ خطبہ مسنونہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ثابت ہے۔ خطبہ کے دوران خطیب پر مختلف واردات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کسی وقت چہرے پر ایسے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں اس سے سامعین کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خطبہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثناء ہونی چاہئے۔ خطبہ مختصر مگر جامع ہو۔ خطبہ میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سامعین اس سے متاثر بھی ہوں اور محفوظ بھی، لیکن تکلف سے اجتناب کرنا چاہئے۔ خطبہ کو طول دینے سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مختصر، مگر جامع خطبہ سامعین کی سمع خراشی کا موجب نہیں بنتا بلکہ اسے یاد رکھنا سہل اور آسان ہوتا ہے اور اپنا بہترین اثر چھوڑتا ہے۔

(۳۶۱) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ حَضْرَتِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ كُوبِيَهٗ فَرَمَاتِي سَنَاهُ كُوبِيَهٗ ”آدمی کی نماز لمبی رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ طُولَ اور خطبہ مختصر اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔“ (مسلم) صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقَصَرَ خُطْبَتَهُ مِثْنَةً مِنْ فِقْهِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿قصر﴾ قاف کے نیچے کسرہ اور ”صاد“ پر فتح ہے۔ مختصر کے معنی میں ﴿مِثْنَةً﴾ میم پر فتح اور حمزہ کے نیچے کسرہ اور نون پر فتح اور تشدید۔ معنی علامت، نشانی۔ یہ انسان کے فقیہہ و دانا ہونے کی علامت و نشانی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خطیب کی عقلمندی کی علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی نماز لمبی اور خطبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مختصر بات یاد رکھنی، ذہن نشین کرنی آسان ہوتی ہے۔ آنجناب ﷺ کے خطبات جمعہ عام طور پر مختصر مگر جامع ہوتے تھے جنہیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا، بآسانی نوک زبان ہو جاتے تھے۔ مگر صد افسوس کہ اس دور میں ہمارے خطباء کی عموماً گنگا اٹلی چلتی ہے یعنی خطبہ لمبا اور نماز مختصر، خلاف سنت اس طریقہ کی بہر نوع اصلاح ضروری ہے۔

(۳۶۲) وَعَنْ أُمِّ هِشَامِ بِنْتِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا أَخَذْتُ هَقَّ الْقُرْآنِ الْمَجِيدِ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، يَفْرَأُهَا كُلُّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں سامعین کو قرآن مجید سنانا اور سمجھانا چاہئے۔ اس حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ نے عموماً سورۃ ق خطبہ جمعہ میں تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ

حضرت ام حشام رضی اللہ عنہا نے سن سن کر ساری سورہ زبانی یاد کر لی۔ اس سورہ میں چونکہ موت، قیامت، جنت، دوزخ اور پند و نصائح کا ذکر ہے اس لئے عموماً آپ اس کی تلاوت کرتے، تاکہ آخرت یاد آئے اور فکر و عمل کی طرف طبیعت مائل رہے۔ خطبہ میں لایعنی قصے، بے مقصد باتیں شعرو شاعری حتی کہ شریکۂ اشعار مزاج شریعت کے منافی ہے۔ جس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ام حشام رضی اللہ عنہا﴾ حارث بن نعمان کی بیٹی، عمرہ بنت عبدالرحمن کی ماں جالی بن۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق کی وجہ سے انصاریہ نجاریہ کہلائیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خاتون بیعت الرضوان میں شریک تھیں۔

(۳۶۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: اس وقت بات کی جب امام منبر پر کھڑا خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے کتابیں اٹھائی ہوئی ہیں اور اس کا بھی جمعہ نہیں جس نے اسے کہا کہ خاموش رہ (اسے احمد نے ایسی سند سے روایت کیا جس کے متعلق (اباس بہ) کہا گیا ہے) أَنْصِتْ، لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ لَا بَأْسَ بِهِ.

اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے جو صحیحین میں منقول ہے ”جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ رہ اور امام اس وقت خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو تو نے بھی لغو بات کی یا اپنا جمعہ لغو کر دیا۔

لغوی تشریح: ﴿اسفار﴾ سفر کی جمع ہے۔ سفر کے سین کے نیچے کمرہ۔ سفر کے معنی کتاب اور صحیفہ کے ہیں اور اسفار کتابوں کے معنی میں ﴿انصت﴾ انصات سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے، معنی ہے خاموش رہ۔ ﴿لیست له جمعة﴾ یعنی اسے جمعہ کی فضیلت نہیں ملے گی بلکہ اس سے محروم رہے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس کی نماز جمعہ تو ادا ہو جائے گی مگر وہ جمعہ کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ (سبل) جو آدمی دوسرے کو دوران خطبہ بات کرنے سے منع کرتا ہے، اس کا حال یہ ہے تو جو گفتگو کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اس کی حرمان فیسی کے کیا کہنے اور اس دھمکی و وعید کا کتنا مستحق ہے۔ ایسے شخص کو گدھے سے تشبیہ دی گئی جو کتابوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ صرف بوجھ تلے دبا ہوا ہے ورنہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جو اپنا قیمتی وقت، کاروبار، گھر چھوڑ کر نماز جمعہ کیلئے دور سے چل کر آتا ہے مگر اپنی نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے

دوران خطبہ گفتگو کا ارتکاب کر کے ثواب اور اجر سے محروم رہ جاتا ہے اور جمعہ کا ثواب اسے نہیں ملتا۔ ﴿وہو یفسر﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی متن والی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات میں لفظ لغو کی وضاحت کرتی ہے کہ لغو کا کیا معنی ہے۔ ﴿لغوت﴾ یعنی تو نے لغو کام کیا اور بے فائدہ کام کا ارتکاب کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ نمازیوں کو پورے سکون و اطمینان سے پورے انہماک اور توجہ سے بغور سننا چاہئے۔ کسی قسم کی ناروا حرکت نہیں کرنی چاہئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی بولنے اور گفتگو کرنے کی حماقت بھی کرتا ہے تو اسے بھی منع نہیں کرنا چاہئے۔ پورا دھیان خطبہ کے مضامین کی طرف ہو۔

(۳۶۴) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ، فَقَالَ: «صَلَّيْتُ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَمُ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جمعہ کے روز ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ نبی ﷺ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے آنے والے سے دریافت فرمایا نماز پڑھی ہے؟ وہ بولا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قم فصل﴾ تم اور صل دونوں امر کے صیغے جس آدمی نے پہلے دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو اسے دوران خطبہ بھی دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ مستحب ہیں اور یہ حدیث اس کے استحباب پر دلیل ہے۔ یہ دونوں رکعتیں یا جمعہ سے پہلے کی ہیں یا پھر تحیۃ المسجد کی۔ اگر یہ تحیۃ المسجد کی شمار ہوں تو پھر یہ دلیل ہے اس بات کی کہ تحیۃ المسجد کسی کے پہلے بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ آپؐ کا اس آدمی کو فرمانا کہ کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص مسجد میں آکر بیٹھ گیا تھا اور نماز نہیں پڑھی تھی۔

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی دو رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے اور اس میں استماع خطبہ کے عام حکم کی تخصیص ہے۔ دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت بات چیت کر سکتا ہے بلکہ نئے آنے والے کو دو رکعت نماز پڑھنے کی تلقین بھی کر سکتا ہے۔ احناف ان دو رکعتوں کے قائل نہیں۔ یہ حدیث ان کی تردید کرتی ہے۔

(۳۶۵) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الْجُمُعَةِ سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عموماً جمعہ کی نماز میں سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقین پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم)

کالانعام کا یہ تصور کہ عید اور جمعہ اکٹھے ایک ہی دن آجائیں تو برسرِ اقتدار حکومت کا زوال ہوتا ہے تو یہ سراسر وہم پر مبنی ہے۔ آپؐ نے تو اسے دو عیدوں کا دن قرار دیا ہے مگر بے خبری میں عوام اس سے بدشگونی لیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

(۳۶۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "جَبَّ تَمَّ مِثْلُ سَبْعَةِ أَشْهُارٍ" (مسلم)

فَلْيَصِلْ بَعْدَهَا أَرْبَعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ بلکہ اکثر علماء رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے بعد آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گھر پر جمعہ کے بعد دو اور مسجد میں چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یوں ہی کرتے تھے۔ احناف جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کے قائل ہیں مگر کسی بھی صحیح مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

(۳۶۸) وَعَنْ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذَلِكَ: أَنْ لَا نُؤْصِلَ صَلَاةً بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سائب بن یزید رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رحمہ اللہ نے فرمایا جب تم نماز جمعہ پڑھو تو پھر دوسری کوئی نماز اس کے ساتھ نہ ملاؤ تاوقتیکہ تم سے کوئی بات کر لے یا وہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح حکم دیا تھا کہ ہم نماز جمعہ کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں تاوقتیکہ ہم کوئی بات نہ کر لیں یا وہاں سے نکل جائیں۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: "فلا تصلها" "وصل" سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ نہ ملا اس کے ساتھ فرض جمعہ کے ساتھ۔ "تخرج" نکل جا۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مسجد سے باہر نکل جا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں فرض نماز ادا کی ہے اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد اسی جگہ فوراً کھڑے ہو کر سنتیں نہیں پڑھنی چاہئے۔ یہ حکم صرف جمعہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر نماز کے نفل اور فرض میں فرق بذریعہ انتقال جگہ یا گفتگو کر لینی چاہئے۔ تاکہ نفل کا فرض پر اشتباہ نہ ہو۔ نبی ﷺ نوافل و سنن بالعموم گھر پر ادا فرمایا کرتے تھے اور بہتر بھی یہی ہے۔ نوافل و فرائض ایک ہی جگہ نہ پڑھنے کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا نامہ اعمال میں درج ہو جائے اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے۔

راوی حدیث: ﴿سائب بن یزید رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت مشہور قول کے مطابق ابو یزید کنندی ہے۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ ۸۰ھ میں فوت ہوئے۔

(۳۶۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ اغْتَسَلَ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ الْإِمَامُ مِنْ خُطْبَتِهِ، فَارْغَ هُوَ پھر امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى، وَفُضِّلَ ثَلَاثَةٌ دِيَّے جائیں گے بلکہ مزید تین دن کے اور بھی۔»

(مسلم)

لغوی تشریح: ”ما قدر له“ تقدیر سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی نماز پڑھے جتنی اللہ اسے توفیق دے اور اس کے مقدر میں ہو۔ ”انصت“ فعل ماضی۔ خاموش رہا۔ جمہور کے نزدیک صغائر گناہوں کی بخشش مراد ہے کیونکہ کبار توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز جمعہ کی بڑی ترغیب ہے۔ جو شخص غسل کر کے آئے خطیب کے آنے سے پہلے ذکر و عبادت میں مصروف رہے۔ امام خطبہ شروع کرے تو خاموشی سے خطبہ سنے اور نماز جمعہ پڑھے تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

(۳۷۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «فِيهِ سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي يَسْأَلُ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئًا، إِلَّا أَغْطَاهُ إِيَّاهُ». وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رَوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيفَةٌ».

یہ حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز جمعہ کا ذکر فرمایا کہ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے جو بندہ مسلم اس گھڑی میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عنایت فرماتا ہے اور آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا کہ وہ وقت بہت تھوڑا سا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی مروی روایت میں ہے کہ وہ وقت خفیف سا ہوتا ہے

لغوی تشریح: ”یقللہا“ تھلیل سے ماخوذ ہے۔ قلت وقت کی جانب اشارہ فرما رہے تھے ”خفیفہ“ کے معنی بھی قلیل، تھوڑا سا۔ وہ گھڑی بہت ہی مختصر سی ہے جس میں دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز ایک مخصوص وقت ایسا ہے جس میں بندے کی ہر دعا (بجز قطع رحمی اور گناہ) شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تعین بیان نہیں فرمائی۔ اس گھڑی کو بھی شب قدر کی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا تا کہ لوگ اس کو تلاش کرنے میں اپنا زیادہ سے زیادہ قیمتی وقت صرف کریں۔ اس طرح ان کا شوق جستجو بڑھے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ ہو۔

(۳۷۱) وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلَاةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ أَنَّهُ مِنْ قَوْلِ أَبِي بُرْدَةَ.

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتام جماعت تک کے دوران میں ہے۔“ (مسلم) اور دارقطنی نے تو اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابو بردہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

وَفِي حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ وَعَنْ ابْنِ مَاجَةَ، وَجَابِرٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: أَنَّهَا مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ.

اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے اور جابر رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور نسائی نے روایت نقل کی ہے کہ وہ گھڑی نماز عصر سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصہ میں ہے۔

وَقَدْ اخْتَلَفَ فِيهَا عَلَى أَكْثَرِ مَنْ أَرَبَعِينَ قَوْلًا أَمَلَيْتُهَا فِي شَرْحِ الْبُخَارِيِّ.

اس میں مختلف علماء کے چالیس اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کو فتح الباری شرح بخاری میں لکھ دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ہی﴾ اس سے مراد جمعہ کے روز ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ ﴿املینہا﴾ یہ سارے اقوال میں نے وہاں تحریر کر دیئے ہیں ”الماء“ دراصل اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی لکھوائے اور دوسرا اسے لکھے۔ اس گھڑی کے بارے میں دو اقوال زیادہ مشہور ہیں (۱) عصر سے لے کے غروب آفتاب تک کے وقت میں (۲) آغاز خطبہ سے اختتام نماز کے دوران وہ گھڑی ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے قابل ترجیح کونسا قول ہے؟ بعض نے ان کے مابین بایں طور پر جمع و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ گھڑی ان دو وقتوں میں باری باری منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جمع و تطبیق کی صورت میں یہ تطبیق سب سے اچھی ہے۔ لیکن جمع و تطبیق کی اس صورت میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان اوقات میں تو نماز پڑھنا ممنوع ہے اور گزشتہ حدیث میں ﴿وہو قائم یصلی﴾ کے الفاظ ہیں کہ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا ہو تو گویا اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا انتظار کرنے

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ هَرَجَهُ مَوْمِنُ مَرْدُونَ وَأُورَتُونَ كَيْلِيَّ بِخَشْشِ
كَانَ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ كِي دَعَا فَرَمَا كَرْتِي تَحِي۔ (اسے ہزار نے كزور سند سے
فِي كُلِّ جُمُعَةٍ رَوَاهُ الْبَزَّازُ بِإِسْنَادٍ لَيْسَ رَوَايَتِ كِيَا هِي)

حاصل كلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطیب کو جمعہ میں اپنے لئے اور دوسرے مسلمان
مردوں اور عورتوں کیلئے دعاء مغفرت کرنا مسنون و مشروع ہے۔ اس کی سند میں یوسف بن خالد بستی
ضعیف ہے جسے بعض نے کذاب بھی کہا ہے۔

(۳۷۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قرآن حمید کی چند آیات خطبہ جمعہ میں تلاوت فرما کر
كَانَ فِي الْحُطْبَةِ يَقْرَأُ آيَاتٍ مِّنَ لُوقُونَ كُو نصیحت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد اور اس کی اصل
الْقُرْآنِ، يُذَكِّرُ النَّاسَ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، مسلم میں ہے)
وَأَضْلَهُ فِي مُسْلِمٍ۔

حاصل كلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھنی مسنون ہیں۔ خطیب
کو ان آیات کے ذریعہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب، اخلاق و کردار کی درستگی کی طرف توجہ
دلانی چاہئے۔ جتنی اصلاح آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کسی ذریعہ سے
نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں موضوع احادیث، من گھڑت قصوں کہانیوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۳۷۵) وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا کہ ”جمعہ کو باجماعت ادا
ﷺ قَالَ: «الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى کرنا ہر مسلم پر واجب ہے مگر چار قسم کے لوگ اس
كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ، إِلَّا أَرْبَعَةً: سے مستثنیٰ ہیں۔ غلام، عورت، بچہ اور مریض۔“
مَمْلُوكٌ، وَامْرَأَةٌ وَصَبِيٌّ وَمَرِيضٌ رواہ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے
أَبُو دَاوُدَ وَقَالَ: لَمْ يَسْمَعْ طَارِقٌ مِّنْ کہ طارق براہ راست نبی ﷺ سے سماع نہیں کرتا۔ طارق
النَّبِيِّ ﷺ، وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ مِّنْ رَّوَايَةِ طَارِقٍ كِي یی روایت حاکم نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے ذکر کی ہے)
الْمَذْكُورِ عَنْ أَبِي مُوسَى۔

حاصل كلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام، عورت، بچہ اور مریض پر جمعہ فرض نہیں۔ اگر پڑھ
لیں تو پھر ان کو ظہر نہیں پڑھنا پڑے گی۔ ورنہ نماز ظہر ادا کریں گے۔

راوی حدیث: (طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ) یہ کوفہ کے باشندے تھے۔ قبیلہ بجیلہ سے تعلق تھا اس لئے کوئی
اور بجلی کہلائے۔ نبی ﷺ کی زیارت ہوئی مگر آپ سے کچھ سنا نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے دور

ایک قول یہ ہے کہ جنگ یمامہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔

۱۳ - بَابُ صَلَاةِ الْخَوْفِ - نماز خوف کا بیان

(۳۷۹) عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَاتٍ رَحِمَهُ اللَّهُ، عَمَّنْ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلَاةَ الْخَوْفِ: أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ، وَطَائِفَةٌ وَجَّاهَ الْعَدُوَّ، فَصَلَّى بِالَّذِينَ مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوا، فَصَفُّوا وَجَّاهَ الْعَدُوَّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْأُخْرَى، فَصَلَّى بِهِمُ الرُّكْعَةَ الَّتِي بَقِيَتْ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَوَقَعَ فِي الْمَعْرِفَةِ لِابْنِ مَنْدَه: عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَاتٍ، عَنْ أَبِيهِ.

حضرت صالح بن خوات رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص سے روایت کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔ اس شخص نے بیان کیا کہ ایک گروہ نے آپ کے ساتھ نماز کیلئے صف بندی کی اور ایک دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ کیلئے اس کے روبرو صف بند ہو گیا۔ آپ نے ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ صف باندھ کر کھڑے تھے ایک رکعت پڑھائی اور آپ سیدھے کھڑے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر باقی نماز مکمل کر لی اور چلے گئے۔ جا کر دشمن کے سامنے صف بند ہو گئے۔ پھر دوسرا گروہ آیا۔ آپ نے اسے باقی اپنی ایک رکعت پڑھائی اور بیٹھے رہے انہوں نے اس دوران میں اپنے طور پر نماز مکمل کر لی پھر آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ (بخاری و مسلم۔ مگر متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابن مندہ کی ”المعرفة“ میں ہے کہ صالح بن خوات اپنے والد سے بیان کرتے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿باب صلاة الخوف﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خوف کی حالت میں نماز پڑھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کفار کے لشکر کے بالمقابل ہو۔ ہنوز باہمی جنگ و جدال شروع نہ ہوئی ہو۔ نیزے پھینکنے اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئی ہو۔ رہی یہ صورت کہ فریقین میں مڈبھیڑ ہو چکی ہو، بدو قوں کے منہ کھل گئے ہوں، توپوں کے دھانے گولوں کی آگ اپنے دھانوں سے اگل رہے ہوں۔ ٹینک گولے برسا رہے ہوں۔ جنگی طیاروں کے ذریعہ بم گرائے جا رہے ہوں۔ تو ایسے وقت میں مخصوص طریقہ

سے نماز ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ اس وقت تو جس طرح ٹولیوں کی صورت میں یا تن تنہا جس طرح ممکن ہو کھڑے ہو کر، چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ﴿عمن صلی الخ﴾ جس نے آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس سے کون شخص مراد ہے۔ مسلم کی روایت میں تو سہل بن ابی حشمہؓ کا نام آیا ہے اور یہ بھی قول ہے کہ راوی کا باپ خواتؓ ہی مراد ہے جیسا کہ مصنف نے ابن مندہ کے حوالہ سے حدیث کے آخر میں نقل کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس وقت سہل ابھی بچہ ہی تھا۔ غزوات میں شریک ہونے کے قابل ہی نہیں تھا۔ ﴿ذات الرقاع﴾ ”راء“ کے نیچے کسرہ اور قاف مخفف۔ ﴿نجد﴾ میں غطفان کے علاقہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ غزوہ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس کو ذات الرقاع کہنے کی وجہ ایک قول کے مطابق یہ تھی کہ مسلمان مجاہدین کے پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے۔ انہوں نے جوتوں کی جگہ پاؤں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ ﴿وجاہ العدو﴾ ”واو“ کے نیچے کسرہ۔ دشمن کے روبرو، بالقابل۔ دشمن کے سامنے۔ واتموا ولا تفسہم اپنے طور پر نماز پوری کی یعنی دوسری رکعت پوری کر کے سلام پھیرا۔

حاصل کلام: صلاۃ خوف کئی طریقہ سے پڑھی گئی ہے جیسا موقع محل ہوتا تھا اس کی مناسبت سے نماز ادا کی گئی۔ مذکورہ بالا حدیث میں وہی صورت ذکر ہوئی ہے جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے یعنی امام نے ہر ایک گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور ایک ایک رکعت انہوں نے اپنے طور پر پڑھی۔ پہلے گروہ نے تو خود سلام پھیرا مگر دوسرے گروہ نے نبی ﷺ کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور جمہور کے نزدیک خوف کی صورت میں سفرو حضر دونوں میں نماز خوف پڑھنا جائز ہے۔ امام مالکؒ صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط لگاتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ”اذا ضربتم فی الارض.....الایہ“ میں دو شرطیں ہیں۔ ایک سفر اور دوسری خوف دشمن۔ مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نماز خوف اور نماز قصر دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔ سفر میں قصر کیلئے خوف دشمن کی شرط نہیں اور صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط نہیں۔ دونوں نمازوں کے ساتھ کوئی شرط لگانا بے معنی ہے۔

راوی حدیث: ﴿صالح بن خوات﴾ خوات بن جبر بن نعمان انصاری مدنی۔ ”خا“ پر فتح اور واو پر فتح اور تشدید۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ بہت سے صحابہ کرامؓ سے حدیث سنی ہے۔ یہ حدیث انہوں نے یا تو حضرت سہل بن ابی حشمہؓ صحابیؓ سے سنی ہے یا پھر اپنے والد سے۔ جس طرح اسی حدیث کے آخر سے واضح ہو رہا ہے۔

﴿خواتؓ﴾ جلیل القدر صحابی ہیں۔ پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے غزوہ احد ہے اور ایک قول کے مطابق غزوہ بدر میں بھی شریک تھے۔ ۴۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۱ یا ۷۲ سال کی تھی۔

(۳۸۰) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نجد کی

تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَبْلَ نَجْدِ فَوَازِينَا دُشْمَنَ كَالْكَلِّ مُقَابِلَ صَفِّ بَسْتَةٍ تَحْتَهُ كَمَا رَسُلَ اللَّهُ الْعَدُوَّ، فَصَافَفْنَاهُمْ، فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَصَافَفْنَا طَائِفَةً مَعَهُ، وَأَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى الْعَدُوِّ، وَرَكَعَ بِمَنْ مَعَهُ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ انْصَرَفُوا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِي لَمْ تُصَلِّ، فَجَاءُوا، فَكَرَعَ بِهِمْ رَكْعَةً، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ، فَكَرَعَ لِنَفْسِهِ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

طرف نبی ﷺ کی معیت میں کسی غزوہ میں گیا۔ ہم دشمن کے بالکل مقابل صف بستہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور ہمیں نماز پڑھائی۔ ایک جماعت نماز ادا کرنے آپ کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور ایک جماعت دشمن کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ جو جماعت آپ کے ساتھ نماز میں شریک تھی اس نے آپ کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کئے اور اس گروہ کی جگہ واپس چلی گئی جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس جماعت کے افراد آئے آپ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی دو سجدوں کے ساتھ۔ پھر آپ نے سلام پھیر دیا مگر دونوں گروہوں نے اٹھ کر الگ الگ اپنی رکعت پوری کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿قَبْلَ﴾ قاف کے کسرہ اور فتح دونوں سے۔ طرف، جت کے معنی میں۔ ﴿نَجْدِ﴾ بلاؤ عرب کی سطح مرتفع جو حجاز کے مشرق میں واقع ہے۔ ﴿فَوَازِينَا﴾ مقابلہ پر آئے۔ بالقابل ﴿فَصَافَفْنَا﴾ صف بندی کی ہم نے۔ ہم دو صفوں میں کھڑے ہوئے اور یہ موقع نماز عصر کا تھا ﴿ثُمَّ انْصَرَفُوا﴾..... الخ ﴿پہلی رکعت مکمل کر کے واپس چلے گئے۔ ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی تھی اور سلام بھی نہیں پھیرا تھا اور اس وقت نبی ﷺ سیدھے کھڑے رہے﴾ ﴿فَجَاءُوا﴾ اس گروہ کے لوگ آئے جو پہرہ دے رہے تھے دشمن کے سامنے یا حفاظت کر رہے تھے ﴿ثُمَّ سَلَّمَ﴾ پھر نبی ﷺ نے تنہا سلام پھیرا۔ ﴿فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ﴾..... الخ ﴿ہر گروہ الگ الگ اٹھا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بقیہ رکعت ایک دوسرے کے بعد پوری کی اور ابوداؤد میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ نے پہلے پوری دونوں رکعتوں کو ملا کر اکٹھے پڑھ لیا۔ پھر پہلے گروہ کی جگہ پر چلا گیا اور پہلا واپس آیا اور اس نے ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیرا اس طرح اس کی بھی نماز کی دو رکعتیں پوری ہو گئیں۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ کے بقول نماز خوف کے سلسلہ میں چھ یا سات صحیح احادیث بھی ثابت ہیں۔ ان میں سے جس کے مطابق پڑھی جائے جائز ہے۔ کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ حالات کے مطابق جس طور

پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ اس نماز کے مسنون و مشروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اور صاحب زاد المعاد نے بھی اس نماز کی چھ یہی کیفیتیں بیان کی ہیں اور جن حضرات نے اس سے زیادہ کی ذکر کی ہیں۔ انہوں نے جہاں کہیں بیان واقعہ میں اختلاف دیکھا اسے الگ شمار کر لیا۔ حقیقت میں وہ الگ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

(۳۸۱) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ صَلَاةَ الْخَوْفِ، فَصَفَّفْنَا صَفَيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَالْعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ، وَكَبَّرْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَكَعَ، وَرَكَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَرَفَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ، وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ الْعَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ قَامَ الصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز خوف میں حاضر تھا۔ ہم نے دو صفیں بنائیں ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑی ہوئی جبکہ دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور ہم سب نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپؐ نے رکوع کیا اور ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپؐ نے رکوع سے سر اوپر اٹھایا اور ہم سب نے بھی اپنے سر اٹھائے پھر آپؐ سجدے میں گر گئے اور آپؐ کے ساتھ والی صف بھی اور دوسری صف دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑی رہی۔ جب آپؐ نے سجدہ پورا کر لیا تو وہ صف جو آپؐ کے قریب تھی کھڑی ہو گئی۔ پھر راوی نے ساری حدیث بیان کی۔

وَفِي رَوَايَةٍ؛ ثُمَّ سَجَدَ، وَسَجَدَ مَعَهُ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، فَلَمَّا قَامُوا سَجَدَ الصَّفُّ الثَّانِي، ثُمَّ تَأَخَّرَ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، وَتَقَدَّمَ الصَّفُّ الثَّانِي، وَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ، وَسَلَّمْنَا جَمِيعًا.

ایک روایت میں ہے کہ پھر آپؐ نے سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ پہلی صف نے بھی سجدہ کیا اور جب یہ سب کھڑے ہو گئے تو دوسری صف سجدے میں چلی گئی اور پھر پہلی صف پیچھے ہٹ گئی اور دوسری صف آگے آگئی اور پہلے کی طرح ہی ذکر کیا اور آخر پر نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور ہم سب نے بھی سلام پھیر دیا۔ (مسلم)

اور ابو داؤد نے ابو عیاش زرقی سے اس طرح روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ ”وہ عصفان مقام پر (ادا کی گئی) تھی۔“

وَلِلنَّسَائِيِّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ جَابِرٍ،
أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِطَائِفَةٍ مِنْ
أَصْحَابِهِ رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ
صَلَّى بِآخَرِينَ أَيْضًا رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ
سَلَّمَ. وَمِثْلُهُ لِأَبْنِ دَاوُدَ عَنْ أَبِي
بَكْرَةَ.

اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا پھر ایک دوسرے گروہ کو اسی طرح دو رکعات پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

نفعی تشریح: ﴿صف خلف رسول اللہ ﷺ﴾ یعنی اس صف کے پیچھے ایک دوسری صف مراد ہے۔ ﴿ثم انحدر﴾ پھر جھکے سجدہ کرنے کیلئے۔ ﴿والصف الذی یلیہ﴾ پھر وہ صف سجدہ کیلئے جھکی جو آپ کے قریب تھی اور پہلی تھی ﴿فی نحرا العدو﴾ دشمن کے مقابل میں کھڑی ہو گئی۔ ہر چیز کا اول حصہ اس کا نحر کہلاتا ہے یہ دشمن، جہنہ قبیلہ کے افراد تھے ﴿فلما قضی السجود﴾ جب سجدہ پورا کر لیا اور صحیح طور پر ادا کر لیا ﴿فذکر﴾ راوی حدیث نے ذکر کیا۔ ﴿الحدیث﴾ ذکر کا مفعول ہے یعنی ساری حدیث بیان کی اور اس میں ہے کہ دوسری صف سجدے میں گر گئی۔ ﴿بعسفان﴾ عسفان بروزن عثمان۔ غزوہ عسفان ۶ھ میں عمرہ حدیبیہ کے موقع پر واقع ہوا اس میں لڑائی کی نبوت نہیں آئی۔ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکیں۔ چنانچہ انہوں نے خالد بن ولیدؓ کو دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ مکہ کے راستہ میں حائل ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نماز ظہر میں دیکھا تو سوچا کہ اب مسلمان اس وقت بے خبری کے عالم میں ہیں۔ کاش! ہم ان پر حملہ آور ہوئے تو کامیاب ہو کر ان کو قتل کر سکتے ہیں پھر نماز عصر میں بھی ہجوم برقرار رہا تو اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا حکم نازل فرمایا اور یوں خالد بن ولید کو حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر صلح ہوئی۔ جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ پس عسفان وہ پہلا غزوہ ہے جہاں نماز خوف پڑھی گئی اور پہلی نماز جو اس جگہ نماز خوف کی صورت میں ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جس کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ ﴿من وجہ آخر﴾ دوسری سند سے ﴿صلی بطائفہ﴾ یعنی ایک جماعت نے فرض ادا کئے اور دوسری نے نفل۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفترض کے پیچھے منقل کی نماز جائز ہے اور یہ نماز مذکورہ نماز کے علاوہ دوسری نماز ہے۔ یہ نماز تو عسفان کے موقع پر پڑھی گئی اور یہ بطن نخلہ میں۔ نماز خوف کی صورتیں احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ خوف کے موقع پر ان انواع میں سے جس نوعیت کی نماز پڑھے، جائز ہوگی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز خوف کی ایک اور صورت ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نماز خوف اقوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو، دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس

طرح آنجناب ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں۔ تو گویا آپؐ نے دو تو فرض پڑھے اور دو نفل ہوں گے۔ کیونکہ دو مرتبہ دو، دو فرض تو نہیں ہوتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی فرض پڑھ سکتے ہیں۔ احناف نے اس مقام پر انصاف سے کام نہیں لیا بجائے اس کے قیاس کو چھوڑ کر حدیث صحیح کا اتباع کرتے بلکہ طحاوی ایسے صاحب علم و فضل نے تو اتنا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو عیاش زرقی﴾ ان کا نام زید بن ثابت ہے انصاری زرقی مشہور ہیں۔ زرقی کے ”زا“ پر ضمہ اور ”را“ پر فتح ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ ۴۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(۳۸۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ حَذِيفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى صَلَاةَ الْخَوْفِ بِهَوْلَاءِ رَكْعَةٍ، رَكَعَتِ۔ انہوں نے نماز کو پورا نہیں کیا۔ (اسے احمد، وَهَوْلَاءِ رَكْعَةٍ، وَلَمْ يَقْضُوا۔ رَوَاهُ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، صحیح قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ نے ابن عباس کے حوالہ سے وَمِثْلُهُ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا۔ بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے)

حاصل کلام: یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز خوف کم از کم ایک رکعت ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ اس نظریے کا قائل ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری رحمہ اللہ، ضحاک رحمہ اللہ، ابن راہویہ رحمہ اللہ، عطاء رحمہ اللہ، طاؤس رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ، حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شدت خوف کے وقت اشاروں سے صرف ایک رکعت پڑھی جائے گی۔ ان کے نظریے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے مسلم اور ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر حضرت چار رکعتیں اور اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔ مگر جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کہتے ہیں تعداد رکعات میں خوف کی کوئی تاثیر نہیں۔

ان حضرات نے پہلی احادیث کی بہت دور کی تاویلات کی ہیں مگر الفاظ حدیث ان کی تردید کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں جس حدیث میں ایک رکعت کا ذکر ہے اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں رکعتیں امام کے ساتھ پوری نہیں کیں، بلکہ ایک رکعت اکیلے اکیلے پڑھی اور دو پوری کر لیں۔

(۳۸۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”نماز خوف ایک رکعت ہی ہے صَلَاةُ الْخَوْفِ رَكْعَةٌ عَلَى أَيْ جِسْ طَرَحٌ بَهِی ادا ہو جائے۔“ (اسے بزار نے ضعیف

وَجْهِ كَانْ». رَوَاهُ الْبَزَّازُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بعض حضرات امام اور مقتدی دونوں کیلئے ایک ہی رکعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ سفیان اسی کے قائل ہیں۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمن الیسانی راوی سخت ضعیف ہے۔ اس حدیث میں ”جس طرح بھی ادا ہو جائے گی“ سے مراد ہے قبلہ رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ سوار ہو یا پیدل۔

(۳۸۴) وَعَنْهُ مَرْفُوعاً: لَيْسَ فِي صَلَاةِ الْخَوْفِ سَهْوٌ. أَخْرَجَهُ الدَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ نماز خوف میں سجدہ سہو نہیں۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باسناد ضعیف﴾ ضعیف سند کے ساتھ کیونکہ یہ روایت عبد الحمید بن السری سے مروی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ امیر الیماہی نے ذکر کیا ہے کہ علماء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ (اللبیل)

۱۴ - بَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ۔ نماز عیدین کا بیان

(۳۸۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْفِطْرُ يَوْمٌ يُفْطِرُ النَّاسُ، وَالْأَصْحَى يَوْمٌ يُصْحَى النَّاسُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

ہیں۔“ (ترمذی)

نفلوی تشریح: ﴿باب صلاة العیدین﴾ عیدین سے مراد عید قربان اور عید فطر ہے۔ عید عربوں کے ہاں اظہار مسرت کیلئے ہر موسمی اجتماع کو کہتے ہیں۔ عید اسے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سال کے بعد واپس لوٹ کر آتی ہے اور بار بار آتی رہتی ہے یا پھر یہ معنی ہیں کہ اس کے واپس آنے کی وجہ سے مسرت و سرور لوٹ آتا ہے۔ دراصل عید، عود سے ماخوذ ہے۔ عید کے عین کے نیچے کسرہ اور ”یا“ ساکن ہے واؤ کو ”یا“ میں تبدیل کر دیا گیا ”یا“ کے ساکن ہونے کی وجہ سے اس کے ماقبل کسرہ واقع ہے (تو ایسی ”یا“ کو ”واؤ“ میں بدل دیتے ہیں) عید کی جمع اعیاد ہے ”یا“ کے ساتھ یہ اس لئے کہ اعواد جس کا معنی خشک لکڑیاں ہوتا ہے کے اور اعیاد کے درمیان فرق واقع ہو جائے (اور لوگوں کے ذہن نشین بھی رہے) عید الفطر کا آغاز ۲ھ میں ہوا اور عید الاضحیٰ جیسا کہ ایک قول ہے کہ اس کی ابتدا بھی ۲ھ میں ہوئی۔ ترمذی اور مسند احمد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا۔ قربانی کرتے رہے۔ یہ حدیث تو اس کی مقتضی ہے کہ قربانی کا آغاز ہجرت کے پہلے سال سے ہی ہوا ہے لیکن

اس کا بھی احتمال ہے کہ لفظ عشر بطور غلبہ بولا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ﴿یَفْطِرُ النَّاسَ﴾ افطار سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے یہاں عید الفطر کو بطور عید بتانا مقصود ہے۔ ﴿یَضْحٰی النَّاسَ﴾ یضحیٰ تضحیۃ سے ماخوذ ہے اور یہ دراصل قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں اور پھر یوم النہی (قربانی کا دن) کو عید بتانے کیلئے بغیر کسی شرط کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ وہ دن ہوں گے جن میں لوگ یہ دونوں عیدیں منائیں گے۔ بالفاظ دیگر معنی یہ ہوئے کہ اگر لوگ چاند دیکھنے میں غلطی یا خطا کر جائیں تو پھر رمضان اور ذوالقعدہ دونوں کی تعداد تیس دن مکمل کر لیں۔ پھر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کیلئے باہر نکلیں اور مناسک حج بھی انہی تین دنوں کے حساب سے ادا کریں۔ اس کے بعد اگر ان کے سامنے یہ واضح اور ثابت ہو جائے کہ انہوں نے چاند دیکھنے میں غلطی کی اور خطا کھائی ہے اور مہینہ اگرچہ ۲۹ روز کا پورا ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں ہے بلکہ وہ صحیح ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ ہو چکا۔ یہ تو محض اللہ سبحانہ تعالیٰ کی جناب سے اپنے بندوں کیلئے تخفیف اور نرمی ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اگر کسی شخص واحد نے اپنے طور پر عید کا چاند دیکھ لیا تو قاضی صرف اس ایک کی شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا لہذا تنہا یہ آدمی اپنی رویت کے یقینی ہونے کی بنیاد پر کوئی عمل نہیں کرے گا نہ وہ روزہ رکھے گا اور نہ افطار کرے گا اور نہ قربانی کرے گا۔ بلکہ ان تمام امور میں وہ عام لوگوں کے ساتھ ہی رہے گا یا پھر غالب اکثریت کے ساتھ رہے گا۔ مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں جس پر اسے ذاتی طور پر یقین ہو اس کے مطابق وہ اس بارے میں فیصلہ کرے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اہل اسلام کی صرف دو ہی عیدیں ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری یا چوتھی کسی عید کا تصور اور نشان اسلام میں کہیں دور دور تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے جو اور عیدیں منانا شروع کر رکھی ہیں ان کی شریعت اسلامیہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیدیں اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادات میں اجتماعیت کا تصور ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر کوئی عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا۔ بلکہ اسے عید الفطر اور عید الاضحیٰ ادا کرنے میں لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت کرنی چاہئے اور اگر اسے یقین کامل ہو جائے تو پھر بھی عیدین کی نماز عام لوگوں کے ساتھ ہی ادا کرے گا البتہ روزہ افطار کر سکتا ہے۔

(۳۸۶) وَعَنْ أَبِي عُمَيْرٍ بْنِ أَنَسٍ، حضرت ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک چچا صحابیؓ عَنْ عُمُوْمَةٍ لَهُ مِنَ الصَّحَابَةِ، أَنَّ سے روایت کیا ہے کہ چند سوار آپؐ کی خدمت رَجَبًا جَاءُوا، فَشَهِدُوا أَنَّهُمْ رَأَوْا میں آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے الْهَلَالَ بِالْأَمْسِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ کل شام چاند دیکھا تھا۔ آپؐ نے حکم دے دیا کہ أَنْ يُفْطِرُوا، وَإِذَا أَصْبَحُوا أَنْ يَغْدُوا ”روزہ افطار کر دو اور کل صبح نماز عید کیلئے عید گاہ إِلَى مُصَلَّاهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا میں آجاؤ۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے یہ الفاظ

لَفْظُهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ. ابو داؤد کے ہیں اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿عمومۃ﴾ عم کی جمع ہے۔ جس کے معنی بچا کے ہیں ﴿من الصحابة﴾ صحابہ میں سے۔ یہ عمومۃ کی صفت واقع ہو رہا ہے یعنی یہ بچا صحابی تھے۔ یہ حدیث متصل ہے اس کی سند میں کسی قسم کا ضعف نہیں۔ صحابی کا نام نہ لینا نقصان دہ نہیں۔ ﴿رکبا﴾ ”را“ پر فتح اور کاف ساکن، راکب کی جمع ہے سواروں کی جماعت ﴿یغدوا﴾ ”یا“ پر فتح، صبح چلیں دن کے اول حصہ میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ۲۹ رمضان کو ایسی جگہ چاند نظر آجائے جہاں کا مطلع مختلف نہ ہو تو دوسرے روز صبح قبل اعتبار ذرائع سے اطلاع ملنے پر روزہ اسی وقت افطار کر دیا جائے گا۔ اگر قبل از زوال خبر ملی تو اسی روز نماز عید بھی ادا کر لی جائے ورنہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عید عید گاہ میں پڑھنی چاہئے اور اجتماعی طور پر پڑھنی چاہئے۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ چاند کی رویت کا اعلان سرکاری طور پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اعلان جانی پہچانی شخصیت کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ فی زمانہ شہادتوں کے بعد ریڈیو، ٹی۔ وی سے اعلان کیا جاسکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عبد اللہ بن مالک الانصاری تھا۔ انس کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صغار تابعین میں شمار ہوتا ہے، لفظ تھے۔ چوتھے درجے کے راوی ہیں، اپنے باپ کے بعد کافی دیر زندہ رہے۔

(۳۸۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَغْدُو يَوْمَ الْفِطْرِ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يَأْكُلُهُنَّ وَتَرَاتٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَفِي رِوَايَةٍ مُعَلَّقَةٍ - وَوَصَلَهَا أَحْمَدُ -: رَوَايَتٌ فِيهَا يَأْكُلُ الْفِطْرَ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يَأْكُلُهُنَّ وَتَرَاتٍ. (۱) نماز عید کیلئے باہر جانا مسنون ہے۔ (۲) عید الفطر کیلئے جانے سے پہلے کھجوریں طاق صورت میں کھانی مسنون ہیں۔ (۳) کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں یہ تو تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی میٹھی چیز طاق صورت میں استعمال کر لینی چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) نماز عید کیلئے باہر جانا مسنون ہے۔ (۲) عید الفطر کیلئے جانے سے پہلے کھجوریں طاق صورت میں کھانی مسنون ہیں۔ (۳) کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں یہ تو تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی میٹھی چیز طاق صورت میں استعمال کر لینی چاہئے۔

کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی حریص و لالچی نہ بنے اور اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور طاق ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلتے، تاکہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(۳۸۸) وَعَنْ ابْنِ بَرِيْدَةَ، عَنْ حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتَّى يَطْعَمَ، وَلَا يَطْعَمُ يَوْمَ الْأَضْحَى حَتَّى يَصَلِّيَ. قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرمالیتے کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ولا يطعم يوم الاضحى حتى يصلي﴾ آپ عید الاضحیٰ کو نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بیہقی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے۔ البتہ کھجوروں، چھوڑوں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پر سناگہ ہے۔

(۳۸۹) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَنَا أَنْ نُخْرِجَ الْعَوَاتِقَ وَالْحَيْضَ فِي الْعِيدَيْنِ، يَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ، وَتَعْتَرِلَ الْحَيْضُ الْمُصَلَّى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تاکہ وہ بھی مسلمانوں کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں۔ البتہ حائضہ عورتیں عید گاہ کے کنارے پر رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں صرف دعا میں شرکت کریں) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿امرنا﴾ صیغہ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والے کا علم ہو سکے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور بخاری کی ایک روایت تو صاف طور پر امرنا نبینا کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ﴿ان نخرج﴾ اخراج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں لے کر عید گاہ کی طرف نکلیں۔ ﴿العواتق﴾ نوجوان بالغ لڑکیاں۔ جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عاتق کی جمع ہے اور نخرج کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿والحيض﴾ ”حا“ پر ضمہ اور ”یا“ پر فتح اور تشدید، حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنہیں ایام حیض آرہے ہوں۔

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الْعِيدَ بِلَا أَذَانٍ ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے وَلَا إِقَامَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے) البخاری.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز عید بغیر اذان و اقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کیلئے اذان و اقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کی قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مننون ہے۔

(۳۹۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَصَلِّي قَبْلَ الْعِيدِ شَيْئًا، فَإِذَا رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ. انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ جب واپس گھر تشریف لے آتے تو دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عید گاہ میں نہیں البتہ گھر میں دو رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ (۳۹۴) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عید الفطر اور عید قربان کیلئے عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس کا آپ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کی طرف کھڑے ہوتے لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپ سے ثابت نہیں۔ (۲) خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہئے۔ (۳) خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہئے۔ (۴) خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کرنا چاہئے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ (۵) سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہئے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہئے۔ (۶) نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عید گاہ میں پڑھنی مننون ہے۔ آج کل بلاعذر مسجدوں میں پڑھنے کا عام رواج ہو گیا ہے جو بہر حال ختم ہونا چاہئے۔ (۷) حضور ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عید گاہ میں منبر رکھوا دیا اور اس پر خطبہ دیا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے ابن حبان کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عید ضرور ارشاد

فرمایا ہے۔ جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔

(۳۹۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ: «التَّكْبِيرُ فِي الْفِطْرِ سَبْعٌ فِي عید الفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں الْأُولَى، وَخَمْسٌ فِي الْآخِرَى، اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراء وَالْقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلَيْتَهُمَا»۔ أَخْرَجَهُ أَبُو ت تکبیرات کے بعد ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت داؤد، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْبُخَارِيِّ تَصْحِيحًا۔ کیا ہے اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿سبع فی الاولی﴾ پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعاء افتتاح خواہ تکبیرات سے پہلے پڑھے یا بعد میں دونوں طرح جائز ہے۔ ﴿وخمیس فی الاخرۃ﴾ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں اور قیام کی تکبیران کے علاوہ اس طرح چھ تکبیریں ہوں گی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے کہ عن ابیہ عن جدہ سے اگر عمرو کا باپ شعیب اور عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے، امام دارقطنی وغیرہ نے تردید کی ہے کہ شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت ہے اور یہاں ”جدہ“ سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ جمہور ائمہ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام علی بن مدینی رحمہ اللہ، امام اسحاق رحمہ اللہ، امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، امام دارقطنی رحمہ اللہ، امام دارمی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہاء اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی۔ معلوم نہیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہاں نقل کیا ہے۔ مگر مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے وضاحت کر دی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی ”اعل الکبیر“ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے ”نصب الرایہ“ ص ۲۱۷، ج ۲ میں بھی اسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ کی روایات سے بھی ہوئی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہ و تابعین اور فقہاء مدینہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ شارح ترمذی رحمہ اللہ علامہ عبدالرحمن مبارک پوری کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ ”القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید“ قابل دید ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بعض

دیگر فقہاء کوفہ چھ تکبیروں کے قائل ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع جانے سے پہلے۔ مگر اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت ثابت نہیں۔ جمہور صحابہؓ و تابعین کا عمل ہی رائج اور دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیدین کی زائد تکبیروں میں بھی رفع الیدین مسنون ہے۔

(۳۹۶) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ حَضْرَتِ ابُو وَاقِدٍ لَيْثٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ مَرِيَّ بْنَ مَرْثَدَةَ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْأَضْحَى وَالْفِطْرِ اقْتَرَبَتِ السَّلَامَةُ تَلَاوَتِ فَرَمَاتِهِ تَحْتَهُ. (مسلم)

حاصل کلام: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(۳۹۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْأَضْحَى وَالْفِطْرِ اقْتَرَبَتِ السَّلَامَةُ تَلَاوَتِ فَرَمَاتِهِ تَحْتَهُ. (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿خالف الطريق﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ عید گاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ۔ نبی ﷺ کی اقتداء میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہئے تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(۳۹۸) وَعَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْأَضْحَى وَالْفِطْرِ اقْتَرَبَتِ السَّلَامَةُ تَلَاوَتِ فَرَمَاتِهِ تَحْتَهُ. (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ولهم﴾ ان کیلئے سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ ﴿یومان﴾ دو دن، عید کے فرحت اور مسرت کیلئے۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کرتے تھے وہ یوم نیروز اور یوم مہرجان۔ یہ دونوں کلمے فارسی

سے معرب کئے گئے ہیں۔ دراصل پہلا نو روز یعنی نیا اور جدید دن۔ اصل ہیئت کے نزدیک یہ شش سال کا پہلا دن ہوتا۔ اور پہلا دن وہ ہے جس روز سورج برج حمل میں منتقل ہوتا ہے اور دوسرے کلمے کی اصل مہرگان ہے یعنی گاف کے ساتھ۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کا اس نام کے ساتھ نام موسوم کر دیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں، نہ ان میں گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں اور یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ ہنوز بھی عید کے دن ہیں۔ بعض عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقلی کی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام ان دنوں کی عید منانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا، اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے۔ البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

(۳۹۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عید گاہ کی جانب پیدل تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السَّنَةِ أَنْ يَخْرُجَ چل کر جانا سنت ہے۔ (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور إِلَى الْعِيدِ مَا شِئَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنٌ. حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عید گاہ میں پیدل چل کر جانا مسنون ہے۔ جتنے قدم انھیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی۔ اگر عید گاہ دور ہو تو سواری پر جانا بھی ناجائز نہیں۔

(۴۰۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک موقع پر عید تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي کے روز مسلمانوں کو بارش نے آیا تو نبی ﷺ نے يَوْمَ عِيدٍ، فَصَلَّى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ انہیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ (اسے ابو داؤد نے کمزور صَلَاةَ الْعِيدِ فِي الْمَسْجِدِ.. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ سند سے روایت کیا ہے)

بِإِسْنَادٍ لَيْدٍ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جاسکتی ہے۔ آپ عموماً نماز عید باہر عید گاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ مسئلہ کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبد اللہ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عید گاہ میں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وسیع و فراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عید گاہ میں ادا فرمائی ہے

ہاں ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے عذر پیش آگیا تو آپؐ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ اس لئے عید گاہ میں پڑھنا افضل ہے۔ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نے حتیٰ الوسع ہمیشہ افضل کام پر مداومت و محافظت فرمائی ہے۔ نیز حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ وہ نماز عید کیلئے عید گاہ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اگر باہر نکل کر نماز عید پڑھنا مسنون نہ ہوتا تو میں مسجد میں پڑھتا۔ اس لئے عید گاہ میں نماز پڑھنا ہی مسنون اور افضل ہے۔

نماز کسوف کا بیان

۱۵ - بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ

(گرہن والی نماز)

(۴۰۱) عَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ، فَقَالَ النَّاسُ: أَنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَاتَانِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ، لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْهُوا اللَّهَ وَصَلُّوا، حَتَّى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتَّى تَنْجَلِيَ».

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں جس روز ابراہیم کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن لگا۔ لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”شمس و قمر اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کو گرہن کسی کی موت و حیات کی وجہ سے نہیں لگتا۔ چنانچہ جب تم (ان کو) اس حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہاں تک کہ سورج گرہن کھل جائے۔“ (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے، ”نماز پڑھتے رہو تاوقتیکہ وہ روشن ہو جائے۔“

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ: «أَوْ بَكْرَةَ: اور بخاری میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ «فَصَلُّوا، وَادْهُوا، حَتَّى يَنْكَشِفَ مَا فِيكُمْ»۔ سے دور ہو جائے۔“

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة الكسوف﴾ کسوف کہتے ہیں رگمت کی سیاہی مائل تبدیلی کو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ﴿كسفت الشمس وانكسفت﴾ یعنی سورج بالکل سیاہ ہو گیا اس کی شعائیں غائب ہو گئیں اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے سورج گرہن کیلئے کسوف اور چاند گرہن کیلئے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کیلئے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ ﴿یوم مات

ابراہیم ؑ ابراہیم نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ ۱۰ھ کے ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ ﴿انکسفت لموت ابراہیم﴾ یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ و تخیل کے مطابق تھا کہ کسوف و خسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتا ہے۔ ﴿آیتان﴾ نشانیاں، علامات۔ ﴿من آیات اللہ﴾ اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت، وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں یا اپنے بندوں کو ڈرانے، خوف دلانے کیلئے یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت و طاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع و نقصان اور دفع ضرر کے مالک و مختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع و نقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ ﴿حتی تنکشف﴾ یہاں تک صاف ہو جائیں اور روشن ہو جائیں کہ ان پر چھائی ہوئی سیاہی اور بے نور پن دور ہو جائے۔ حتیٰ یکشف صیغہ مجہول ہے یعنی بلند ہو جائے اور اس پر وارد کیفیت گرہن دور ہو جائے، زائل ہو جائے۔ ﴿حتی تنجلی﴾ یہاں تک صاف اور روشن ہو جائے۔ ﴿حتی یکشف﴾ صیغہ مجہول ہے، یعنی بلند ہو جائے اور ڈھل جائے۔

حاصل کلام: آفتاب و ماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اپنی قدرت کے اظہار اور بندوں کے خوف اور ڈرانے کیلئے اتنی بڑی مخلوق کو خدا کے حضور پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطہ خداوندی نہیں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطہ سے سرمو انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع و ضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ و خیال کی تردید ہے۔

اس موقع پر نماز و دعا مسنون ہے نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپؐ سے ثابت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع (واذا دایتموها) اور جب تم انہیں دیکھو کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکروہہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس صورت کے علاوہ نماز کسوف و خسوف کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں۔ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام، دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے میں اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تو دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے۔ اس میں بھی چار اقوال ہیں۔ ایک قول کی رو سے بلند آواز سے پڑھی جائے گی۔ اس رائے کے حق میں امام احمد رحمہ اللہ، اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں آہستہ پڑھ لی جائے یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ ایک تیسرا قول ہے کہ دونوں میں اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھ لی جائے اور ایک چوتھا قول یہ ہے کہ آفتاب کو گرہن لگے تو آہستہ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَصَلَّى، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا نَحْوًا مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انْصَرَفَ، وَقَدْ انْجَلَتْ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

اللہ تعالیٰ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپؐ نے نماز کسوف ادا فرمائی، اس میں سورہ بقرہ کی تلاوت کے برابر قیام کیا۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا۔ پھر کھڑے ہوئے تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم، پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم (لمبا) تھا، پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا۔ پھر سجدہ کیا پھر آخر کار سلام پھیر دیا تو (اس دوران) سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورج گرہن کے موقع پر آٹھ رکوع چار سجدوں کے درمیان ادا کئے۔

حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابرؓ سے یوں بھی ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

اور ابو داؤد میں حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ.

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

وَلِابْنِ دَاوُدَ عَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى، فَكَرَعَ

خَمْسَ رَكَعَاتٍ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، رکوع اور دو سجدے پہلی رکعت میں کئے اسی طرح وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذَلِكَ. دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿نحواً من قراءۃ سورۃ البقرۃ﴾ تقریباً سورۃ بقرہ کی قرأت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں سورۃ فاتحہ آہستہ پڑھی گئی ہے بلند آواز سے نہیں۔ اس لئے کہ اگر نبی ﷺ نے سورۃ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو اسے اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں تمام کی تمام ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے قریب ہی کھڑے تھے پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت حضور ﷺ نے فرمائی ہوگی۔ بعینہ وہ اسے یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو تو ان کو اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور انہوں نے سورۃ بقرہ کی قرأت کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کے باوجود بلند آواز سے پڑھنے والی روایت صحیح ترین ہے اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مثبت ہیں اور یہ اصول ہے کہ مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے۔ ﴿دون القیام الاول﴾ یعنی پہلے قیام سے کم۔ دون القیام الاولی اور دون الركوع الاول کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا۔

حاصل کلام: تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دو دو رکوع تین تین رکوع چار چار رکوع اور پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں ثابت ہوتے ہیں۔ بعض نے ان کو جمع کر کے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ کسوف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے۔ بعض علمائے کرام نے ان احادیث کو راجح قرار دیا ہے۔ جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ صحیح سورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلہ کی تسبیح و تحقیق ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین، پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراہیمؑ جو روز فوت ہوئے وہ ۱۰ ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی۔ جبکہ انگریزی ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے وقوع کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلمان

منصور پوری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سیرت ”رحمت للعالمین“ میں ذکر کیا ہے کہ سورج گرہن کی تعداد نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور اور بالخصوص ہجرت کے بعد دس بنتی ہے۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپؐ کے لخت جگر ابراہیم کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان سب کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کا کہ کہاں واقع ہوئے ہیں، تاکہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو مسلم نے عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیز اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو حادثہ پیش آیا ہے بخدا اسے ضرور میں دیکھوں گا۔ یہ سیاق دلالت کرتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کیلئے پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے، پہلے کا نہیں۔ مسلم اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراہیم کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے۔ لہذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے پہلا گرہن ۹ یا ۲۸ ربیع الآخر بمطابق ۱۳ اگست ۶۳۰ء کو اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلہ میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا گرہن ۹ شوال بمطابق فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا اور تیسرا گرہن ۱۰ شوال بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ گرہن دو ہوئے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینہ میں پہلا گرہن یہ شدید گرمی میں واقع ہوا اور ابراہیم کی وفات پر جو جنوری کے مہینہ میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن ہے اور جو ۹ شوال کے مہینہ میں (فروری) میں واقع ہوا وہ دوسرا گرہن ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا ملاحظہ کرنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضی ہے۔ لیکن یہ تعدد روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تلاش میں سود مند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلق روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں۔ پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین، چار چار اور پانچ پانچ رکوع کئے۔ ابراہیم کی وفات کے روز گرہن کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔

عام طور پر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھی گئی ثابت ہے۔ پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں۔ پس ہمارے نزدیک خواہ ہم متعدد واقعات سے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ وہ روایات جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے وہ قوی ترین ہیں سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے صحیح ہونے کی وجہ سے رائج بھی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث رائج ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپؐ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(۴۰۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلَّا جَنَّا النَّبِيَّ ﷺ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا». رَوَاهُ طَرِيقَانِ دُونِی (روایت کیا ہے)

الشَّافِعِيُّ وَالْعَبْرَانِيُّ.

لفظی تشریح: ﴿ہبت﴾ ہبوب سے ماخوذ ہے۔ نصرینصر باب سے ہے، ہوا کا تیز و تند چلنا ﴿ریح﴾ مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں یا تیز و تند ہوا کو۔ ﴿قط﴾ ”طاء“ پر تشدید۔ اس پر ہمیشہ ضمہ ہی آتا ہے (یعنی بالضم) ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کیلئے آتا ہے جس طرح ابد کالفظ مستقبل کیلئے آتا ہے ﴿جفا﴾ نصرینصر باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کیلئے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اندھیری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اسے ہمارے لئے باعثِ رحمت بنا، باعثِ عذاب نہ بنا۔ ایک دوسری حدیث میں ”ریح“ کی بجائے ”ریاح“ کالفظ بھی آیا ہے کہ یا الہی! اس تیز و تند آندھی کو ریاہ بنا دے اور ریح نہ بنا کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے ریاہ کالفظ رحمت کیلئے ہے اور ریح کالفظ عذاب کیلئے۔ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں دونوں کا معنی ہوا ہے۔

(۴۰۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث بھی مروی

عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى فِي زَلْزَلَةٍ سِتٍّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هَكَذَا صَلَاةُ الْآيَاتِ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْهُ، دُونَ آخِرِهِ.

ہے کہ انہوں نے زلزلے کے موقع پر نماز چار رکعات، اربع سجدات، وقال: ہکذا صلاۃ الآيات۔ رواہ البیہقی، و ذکر الشافعی عن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ منہ، دون آخرہ۔

روایت کیا ہے اور شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں)

لعفی تشریح: ﴿فی زلزلۃ﴾ اس میں فی سبب بیان کرنے کیلئے ہے (”فاء“ سببی ہے) معنی ہے زلزلہ کی وجہ سے ﴿ست رکعات﴾، ﴿اربع سجدات﴾ چھ رکوع اور چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے ہوتے تھے ﴿صلۃ الایات﴾ آیات سے یہاں مراد ناگمانی اور پریشان کن واقعات ہیں ﴿دون آخرہ﴾ یعنی حدیث کے آخری الفاظ یعنی ”ہکذا صلاۃ لہ الایات“ نہیں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگمانی حادثہ، ارضی و سماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے ”صلۃ الایات“ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے دور کرنے کیلئے رجوع صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا چاہئے غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ان کو مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے جس کی بخشش نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ تمام کئے کرائے اعمال اکارت جائیں۔

نماز استسقاء کا بیان

۱۶ - بَابُ صَلَاةِ الْاسْتِسْقَاءِ

(بارش مانگنے کیلئے نماز)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بڑی تواضع کے ساتھ، سادہ لباس میں نہایت عاجزی و انکساری، بہت خشوع اور بڑی زاری اور تضرع کرتے ہوئے نماز کیلئے باہر نکلے۔ عید کی نماز کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابوعوانہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

(۴۰۶) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعًا، مُتَبَذِّلًا، مُتَخَشِّعًا، مُتَرَسِّلًا، مُتَضَرِّعًا، فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي الْعِيدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هَذِهِ. رَوَاهُ الْحَمَّصِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حَبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة الاستسقاء﴾ استسقاء کے معنی ہیں باران رحمت کی طلب کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سقایہ اور سقی۔ پانی اور بارش کو کہتے ہیں اس لئے کہ پینے اور سیراب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿خرج﴾ عید گاہ کی طرف نکلے ﴿متواضعا﴾ تواضع سے ماخوذ ہے تواضع کہتے ہیں بڑائی اور تکبر کی ضد کو۔ بڑائی اور تکبر اظہار شان و آن ہوتی ہے، تواضع میں عاجزی و انکساری۔ ﴿متبذلا﴾ تبذل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے زیب و زینت کو چھوڑ دینا اور پھٹا پرانا کپڑا زیب تن کرنا اور ﴿متخشعا﴾ یعنی خشوع کو ظاہر کرنے والا اور اس کے بدن، نظر اور آواز سے دھیمہ پن نمایاں ہوتا ہے۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ﴿متوسلا﴾ جلد باز نہ ہو آرام و سکون سے چلنے والا۔ ﴿متضرعا﴾ تضرع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا۔ یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت و ضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغہ اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہے کہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿لم یخطب خطبتکم هذه﴾ تمہارے خطبہ کی طرح آپؐ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ خطبہ کی حالت میں دعا تفرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابو داؤد میں روایت میں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نماز استسقاء رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقاء کے لغوی معنی پانی کیلئے درخواست کرنا، دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ استسقاء کی تین قسمیں ممکن ہیں۔ ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اوسط کی صورت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد باجماعت ادا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کیلئے باہر نکل کر عاجزی و انکساری، خشوع و خضوع کی حالت میں نماز استسقاء ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔

نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے کے دوران ایک آدمی نے آپؐ سے بارش کیلئے دعا کی درخواست کی تو آپؐ منبر پر کھڑے ہوئے اور دعا فرمائی جس کے نتیجے میں بارش شروع ہو گئی اور آئندہ جمعہ تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ کے دوران دعا کر سکتا ہے اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ خطبہ کے دوران خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپؐ نے نماز استسقاء عید کی نماز کی طرح ادا فرمائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں بھی کیں تھیں۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ محمد اور اس کا والد عبدالعزیز دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث اس کی تائید کر رہی ہے۔

خطبہ نماز استسقاء مختصر مگر جامع ہونا چاہئے۔ خطیب مقاصد خطبہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ بے موقع و

خلاف موقع گفتگو کر کے لمبا اور طویل بھی نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب حجة اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز استسقاء ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھنپھانا ہو، ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرے۔ اس کے بعد امام ان کو دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قرأت بلند آواز سے کریں۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے اس دوران چادر کو الٹا کرے۔

(۴۰۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: شَكََا النَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فُحُوطَ الْمَطَرِ، فَأَمَرَ بِمِنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي الْمُصَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْمًا يَخْرُجُونَ فِيهِ، فَخَرَجَ حِينَئِذٍ بَدَأَ حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللَّهَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَذَبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللَّهُ أَنْ تَذْعُوهُ، وَوَعَدْتُكُمْ أَنْ يَسْتَجِيبَ لَكُمْ، ثُمَّ قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، الرَّحْمَنَ الرَّحِيمَ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ اللَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ الْغَنِيُّ، وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلَاءً إِلَى حِينِهِ. ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتَّى رَفَعَ يَافِئُضَ إِبْطِئِهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپ نے عید گاہ میں منبر لے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ چنانچہ منبر عید گاہ میں لا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں وہ سارے باہر نکلیں۔ آپ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا۔ تشریف لا کر آپ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی پھر (لوگوں سے مخاطب ہو) کر فرمایا ”تم لوگوں نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ حکم دے چکا ہے کہ اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا“ پھر فرمایا ”تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ لوگوں کے حق میں بڑا مہربان اور ہمیشہ ہر وقت مہربان ہے۔ روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الہ نہیں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لئے روزی اور مدت دراز تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر

وَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ، فَأَنْشَأَ اللَّهُ تَعَالَى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، بِإِسْنَادِهِ جَيِّدٍ.

اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ کی بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہو گئے اور اپنی چاور کو پھیر کر پلٹایا۔ آپؐ اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لمحہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بادل پیدا کیا وہ بدلی گرجی اور چمکی اور بارش برسنے لگی۔ (اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ و جید ہے)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ، وَفِيهِ: فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلَّى رَكَعَتَيْنِ، جَهَرَ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ. وَلِلدَّارَقُطَنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوْلَ رِدَائِهِ لِيَتَحَوَّلَ الْقَنَظُ.

صحیح بخاری میں عبد اللہ بن زیدؓ کی روایت میں (تبدیلی چادر) کا قصہ اس طرح ہے پھر آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا فرماتے رہے پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ ان میں قرأت بلند آواز سے کی۔ اور دار قطنی میں ابو جعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنی چادر اس لئے پھیر کر بدلی کہ قنط سالی بھی اسی طرح پھر جائے۔

لغوی تشریح: ﴿قحوط المطر﴾ قحوط میں ”قاف“ پر ضمہ۔ قحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ معنی بندش بارش، باران رحمت کا نازل نہ ہونا ﴿ووعد الناس یوما﴾ یعنی ایک دن مقرر فرما دیا ﴿بدا﴾ نمایاں ہونا ظاہر ہے ﴿حاجب الشمس﴾ سورج کا ابو، سورج کا پہلا حصہ ایک کنارہ یا آفتاب کی روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ ﴿جذب دیارکم﴾ اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت ﴿ان يستجب لکم﴾ دعا کو قبول فرماتا ہے اپنے ارشاد کے مطابق جس میں ہے ﴿ادعونی استجب لکم۔ ۱۰/۲۰﴾ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا تمہاری پکار دعا کو اور فرمایا ﴿اجیب دعویٰ الداع اذا دعان: ۱۸۶/۲﴾ میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ ﴿الھیث﴾ بارش۔ ﴿بلاغاً الی حین﴾ یعنی ایسی روزی عطاء فرما جو ہمیں لمبے عرصہ تک چلے۔ ﴿البلاغ﴾ کے معنی ہیں جو کسی کو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ ﴿حتی رئی الخ﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿الابط﴾ جو حصہ، جسم، بازو اور کندھے کے نیچے ہے ﴿حول﴾ تحویل سے ماخوذ ہے معنی ہے کہ اس نے پلٹایا، پھیرا ﴿الی الناس ظہرہ﴾

لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف ﴿وقلب دوائہ﴾ یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف اور نچلے حصہ کو اوپر کیا اور ظاہری حصہ کو باطن بنایا اور اس کی ہر کیفیت کو برعکس بھی کیا۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ (دائیں) سے بائیں طرف سے ٹپکی طرف کو پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے حصہ کو پکڑا پھر دائیں ہاتھ سے دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے یوں تو اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ ﴿وہو رافع یدبہ﴾ یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے ﴿فانشنا﴾ پیدا فرمایا ﴿فرعدت﴾ اس میں کڑک، گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ ﴿وبرقت﴾ بادل کا چمکنا ﴿فی الصحيح﴾ اور صحیح بخاری میں ہے ﴿من حدیث عبداللہ بن زید﴾ اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ ﴿لیتحول القحط﴾ تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبز و شادابی میں تبدیل ہو جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقاء کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ نیز عید کی طرح خطبہ استسقاء نماز کے بعد پڑھا گیا اور استسقاء کیلئے دعائیں ہاتھ اٹھاتے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوجعفر باقر﴾ ابوجعفر محمد الباقر (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب، امامیہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ باقر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا، بڑے ماہر و متبحر عالم تھے۔ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۷۷ھ میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(۴۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا دَخَلَ الْمَسْجِدَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! هَلَكَتِ الْأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَأَذْعُ اللَّهُ يَغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْنِنَا، اللَّهُمَّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا، اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، وہ بولا یا رسول اللہ! (موسیٰ) اموال (موسیٰ) ہلاک ہو گئے اور آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی۔ یا الہی! بارش

أَغْنِنَا، اللَّهُمَّ أَغْنِنَا، فَذَكَرَ سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یا الہی! بارانِ رحمت سے الْحَدِيثَ، وَفِيهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا۔ ہماری فریاد رسی فرما۔ ساری حدیث بیان فرمائی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السبل﴾ سبیل کی جمع ہے جس کا معنی راستہ ہے۔ ”سین“ اور ”باء“ پر ضمہ ہے۔ راستوں کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کیلئے چارہ پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہو گئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنہیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے، جب چیزیں ہی نہیں تو بار برداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمدورفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ ﴿بغینا﴾ ”یا“ پر ضمہ یعنی ہمیں فوری طور پر بارش سے نواز دے تاکہ ہماری تکلیف دور ہو۔ ﴿فرع یدیدہ﴾ بخاری نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ ﴿اغینا﴾ اغاثہ سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ ہمیں بارانِ رحمت سے سیراب فرما۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس نے ساری حدیث بیان کی جس میں مذکور ہے۔ اس دعا کے بعد بارش مسلسل و لگاتار نازل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دوسرے جمعہ کے روز پھر ایک آدمی دورانِ خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرتِ بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا۔ تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہو گیا اور مصنف نے ﴿وفیہ الدعاء بامساکہا﴾ کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انبیاء کرامؑ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہِ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے ورنہ نبی کریم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ نیز صحابہ کرامؓ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی از خود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحطِ سالی سے نجات دیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کان و ما یکون کا علم بھی نہیں رکھتے تھے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قحطِ سالی کی وجہ سے بیرونِ شہر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔

وہ آدمی کون تھا؟ اس میں اختلاف ہے کسی نے ابوسفیانؓ کا نام لیا ہے حالانکہ ابوسفیانؓ اس وقت دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ اندازِ گفتگو اور طرزِ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل

ضرور کوئی مسلمان ہے ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپؐ کو مشکل کشا سمجھ کر آپؐ ہی سے درخواست کرتا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ مسند احمد میں ہے کہ کعب بن مرہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف دعا ہی فرمائی ہے بارش کیلئے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے غالباً اسی سے استدلال کیا ہے استسقاء کیلئے صرف دعا کرنا سنت ہے مگر دوسری احادیث سے نماز استسقاء پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بارش کیلئے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے۔ (۱) ایک دفعہ تو آپؐ لوگوں کو عید گاہ میں لے گئے، نماز پڑھائی، خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (۲) ایک دفعہ خطبہ جمعہ کے دوران ہی صرف دعا ہی منبر پر کھڑے ہوئے فرمائی۔ (۳) ایک مرتبہ آپؐ نے باقاعدہ منبر مگلوایا اور اس پر بیٹھ کر صرف دعا فرمائی یہ الفاظ مروی ہیں بلکہ حدیث میں اس کے برعکس خطبہ کے لفظ بھی کہے اور نماز نہیں پڑھی۔ (۴) ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر سب لوگوں کے ساتھ اجتماعی دعا کی۔ (۵) ایک دفعہ آبادی سے باہر نکل کر احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (۶) اور ایک دفعہ جنگ کے دوران بارش کیلئے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ (زاد المعاد۔ السبل)

(۴۰۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى
عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ
بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَالَ: اللَّهُمَّ إِنَّا
كُنَّا نَسْتَسْقِيكَ إِلَيْكَ بَنِينَا فَتَسْقِينَا،
وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِينَا فَاسْقِنَا،
فَيُسْقَوْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ کے واسطے سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا اور اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ لائے ہیں لہذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے (اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں) ان کو بارش سے سیراب کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قَحَطُوا ﴾ صیغہ مجہول وہ قحط کا شکار ہو گئے۔ ﴿ يَسْتَسْقِي بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ﴾ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اور ان سے شفاعت و سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے اس لئے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ ﴿ اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِيكَ إِلَيْكَ بَنِينَا ﴾ یا الہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان سے دعا اور سفارش کے ذریعہ سے بارش طلب کرتے تھے۔ ان کی ذات سے نہیں ﴿ وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ ﴾ اور اب ان کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا

عباس بن عبدالمطلب ؑ کو وسیلہ بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر ؓ اور حضرت عباس ؓ دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر ؓ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس ؓ نے بارگاہ رب العزت سے عرض کیا۔ الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہ کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور توبہ کے بغیر وہ دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی ﷺ کی جگہ مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے، یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں، گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب سے توبہ کے ذریعہ فریاد رسی کے طلبگار ہیں تیرے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لہذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی، زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی۔ لوگوں میں زندگی آگئی۔ اس واقعہ کو زبیر بن بکار نے اپنی الانساب میں ذکر کیا ہے۔ (مرعاۃ، ج: ۲، ص: ۳۹۹ اور سل السلام)

حاصل کلام: قبہ و قبر پرستوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت عباس ؓ کو طلب بارش کیلئے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کیلئے دعا مانگی۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو زندہ و مردہ، حاضر و غائب بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کا وسیلہ پکڑنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے چچا کی عدم موجودگی میں بھی جائز ہوتا حالانکہ ایسا کسی حدیث سے اور قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہ حدیث ہمارے لئے تین باتوں کا ذکر کرتی ہے ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کیلئے خیر اور خاندان نبوت کے کسی فرد کو جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو، ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس حدیث سے حضرت عباس ؓ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر ؓ میں تواضع و انکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ نیز یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی خواہ فوت شدہ سے مرتبہ و منصب میں کم تر ہو، دعا اسی سے کرانی چاہئے۔ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں نہ ثابت ہے اور نہ ہی معتبر ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت عباس بن عبدالمطلب ؓ﴾ حضورؐ کے چچا، ان کی کنیت ابو الفضل تھی۔ بیت اللہ کی آباد کاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تاکہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں۔ اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوہ میں شریک بھی ہوئے۔ غزوہ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ھ میں رجب یا رمضان میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(۴۱۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بھی مروی ہے قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: فَحَسَرَ تَوْبَهُ اللَّهُ ﷻ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ تَوْبَهُ اللَّهُ ﷻ مَا رَأَى الْمَطَرَ، وَقَالَ: إِنَّهُ حَتَّى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ، وَحَدَّثُ عَهْدَ بَرِّهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. بدن اطہر سے کپڑا اوپر اٹھایا کہ بارش آپ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور ارشاد فرمایا کہ ”یہ اپنے آقا و مالک کے ہاں سے نئے نئے تحفہ کی صورت میں آ رہی ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فحسرو توبہ﴾ حضور ﷺ نے اپنے بدن مبارک سے کچھ کپڑا اٹھالیا۔ ﴿حتى اصابه من المطر﴾ کہ بارش کے کچھ قطرے آپ کے جسم پر پڑ گئے۔ ﴿حدیث عہد برہ﴾ اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے یا یہ معنی ہے کہ اپنے مالک کے ایجاد کرنے سے بری ہے۔ یعنی بارش رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی نازل فرمایا ہے۔ لہذا اس کے ذریعہ سے برکت حاصل کی جائے۔

حاصل کلام: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش عالم قدس سے نازل ہوئی ہے۔ ہنوز یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گنہگار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ نیز اس میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ بارش کے پانی میں نہانا مفید اور جائز ہے۔

(۴۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ قَالَ: «اللَّهُمَّ صَيِّبًا» اے اللہ! اس بارش کو منافع بخش و سود مند بنا نافعاً۔ اَخْرَجَاهُ۔ دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿صیبا﴾ صادر پر فتح ”یاء“ کے نیچے کسرہ اور تشدید۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے یعنی اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔ ﴿اخرجہ﴾ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(۴۱۲) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي الْأَسْتِسْقَاءِ: «اللَّهُمَّ جَلِّلْنَا سَحَابًا كَثِيفًا، صَيِّفًا، دَلُوقًا، ضَحُوكًا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ دعاء استسقاء میں یہ دعا مانگی۔ ”یا الہی! ہمیں ایسے بادل سے جو ساری زمین پر چھایا ہوا ہو، گہرا ہو، کڑکنے والا، زور سے برسنے والا، چپکنے گرجنے والا، تیز

نُطِرْنَا مِنْهُ رُدَاذًا، قِطْقُطًا، سَخْلًا، بہ تہ ہو، سے بارش کی باریک بوندیں بہت زیادہ برسا
يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. اے بزرگی اور عزت کے مالک!“ (مسند ابی
عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ. عَوَانَةُ)

لغوی تشریح: ﴿جللنا﴾ تجلیل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ یہ بادل روئے زمین
پر چھا جائے۔ ﴿کثیفا﴾ گاڑھا تہ بہ تہ ﴿قصیفا﴾ ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زور دار بارش
کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فاعیل کے وزن پر ہیں ﴿دلوقا﴾ دال پر فتح اور لام پر ضمہ زور سے
برسنے والا۔ جیسے کہتے ہیں سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ ﴿ضحوکا﴾ ”ضاد“ پر فتح اور ”حاء“ پر ضمہ ہے۔
چمکنے والا۔ جس میں بجلی ہو۔ ﴿رداذا﴾ ”راء“ پر ضمہ۔ چھوٹے چھوٹے قطرے، باریک باریک بوندیں ﴿
قطقطا﴾ دونوں ”قاف“ پر کسرہ اور پہلا ”طاء“ ساکن۔ باریک بوندیں حتیٰ کہ رائی کے دانوں کے
برابر۔ ﴿سجلا﴾ سین پر فتح، جیم ساکن۔ زور دار بارش۔ مصدر ہے۔ بادل کی تعریف کی گئی ہے۔ مبالغہ
کے طور پر موسلا دھار برسنے والا۔

حاصل کلام: رسول اللہ ﷺ سے دعائے استسقاء کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں۔ یہ دعا ان
میں سے ایک ہے، جو دعا چاہے پڑھے۔

(۴۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَسْتَسْقِي، فَرَأَى نَمَلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلَى ظَهَرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَاءِ، تَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اِنَّا خَلَقْنَا مِنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنَى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «ارْجِعُوا فَقَدْ سَقَيْتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ اَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”حضرت سلیمان علیہ السلام بارش
طلب کرنے کیلئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک چوٹی کو
پشت کے بل ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے
دیکھا جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی۔
الہی ہم تیری مخلوق ہیں تیری دوسری مخلوق کی طرح۔
ہم بھی تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔
یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا چلو
واپس چلیں تمہیں بارش سے سیراب کر دیا گیا، غیروں
کی دعا کی بدولت۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم
نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مستلقیہ﴾ علی ظہرہا ﴿اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی﴾ قوائِمہا
قائمہ کی جمع ہے۔ پاؤں کے معنی میں۔ ﴿خلق﴾ ”حاء“ پر فتح اور لام ساکن۔ اس کی مخلوقات میں
سے ایک مخلوق۔ ﴿سقیاک﴾ سین پر ضمہ اور ”قاف“ ساکن۔ تیری بارش ﴿سقیتم﴾ صیغہ

زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ صحیح روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ ﴿خز﴾ ”خاء“ اور ”زاء“ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ جس سے مراد ریشم ہے۔ مگر یہ دراصل حر سے تخفیف ہے۔ جیسا کہ حافظ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے، ملاحظہ ہو: (فتح الباری ج: ۱۰ ص: ۳۵، ۳۶) ﴿الحریر﴾ ریشم کی تمام اقسام کیلئے حرر کا لفظ مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں ایک ریشم کا پنپنا دو سرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا انسان کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے۔ اسی لئے اسے امت پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ زینت و لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورت کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ بخاری میں اس کی اصل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ معلق یاں طور کہ عبدالرحمن جو اس کے راوی ہیں کو شک و تردید ہے کہ انہوں نے یہ حدیث ابو عامر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے یا ابومالک سے۔

راوی حدیث: ﴿ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عبداللہ بن حانی یا عبید بن وہب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۴۱۶) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَشْرَبَ فِي آيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبِّسِ الْحَرِيرِ وَالذِّيَبَاجِ، وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

نغوی تشریح: ﴿دیباچ﴾ گاڑھے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(۴۱۷) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رِيشَ مَنْ يَدِيهِ يَدَايَا ثَلَاثَ أَوْ ثَلَاثِينَ أَوْ أَرْبَعِينَ مَقْعًا. وَاللَّفْظُ لِلْمُسْلِمِ.

حاصل کلام: مردوں کیلئے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے البتہ خارش وغیرہ عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴۱۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ دُرَّانَ سَفَرِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَزَيْدِ بْنِ

رضی اللہ عنہ

حاصل کلام: نبی ﷺ کو یہ حلہ تحفہ کے طور پر وصول ہوا تھا۔ آپؐ نے یہ حضرت علیؑ کو دے دیا۔ جسے حضرت علیؑ نے زیب تن فرمایا مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔“ چنانچہ حضرت علیؑ نے ککڑے ککڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے، خواہ اس کا استعمال مرد کیلئے جائز نہ ہو۔

(۴۲۰) وَعَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ
قَالَ: «أَجَلُ الذَّهَبِ وَالْحَرِيرِ لِلنِّسَاءِ
أُمْتِي. وَحُرْمٌ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ
أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کیلئے حلال کر دیا گیا ہے اور ان کے مردوں پر حرام۔“ (اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کیلئے سونا پہننا بصورت زیور و لباس جائز ہے مگر ترغیب نہیں، اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(۴۲۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ السَّيْهِيُّ.

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہئے۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(۴۲۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى (شہر کا نام) کے ساختہ کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

نغوی تشریح: ﴿القسى﴾ قاف پر فتح سین کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ قس کی طرف منسوب ہے۔ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے، یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا اور ایک قول یہ

بھی ہے کہ یہ ”قر“ کی طرف منسوب ہے اور یہ ریشم کا بیکار، بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ ”زا“ اور سین کے قریب الخرج ہونے کی وجہ سے ”زا“ کو سین میں تبدیل کر دیا اور اس قر سے قس بن گیا۔ ﴿والمعصر رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفّر سے رنگا ہوا۔ عصفّر ہندی زبان میں کسبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی اور زردی کے بین بین ہوتا ہے۔ ہندو کاہن، سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

(۴۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَأَى ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ نَوْبَيْنِ مُعْصَفَرَيْنِ، دیکھے تو فرمایا ”کیا تیری والدہ نے یہ پہنے کا حکم دیا فَقَالَ: «أَمَرَكَ بِهَذَا؟». رَوَاهُ ہے؟“ (مسلم)

مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿رای علی﴾ علی حرف جر ہے ”یاء“ پر تشدید ”یاء“ متکلم مجرور۔ ﴿امک امرتک؟﴾ امر سے صیغہ غائب ہے۔ آپ نے ایسا شدید ناپسند کیگی کے اظہار کے طور پر فرمایا۔

حاصل کلام: تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے کیا؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں اس لئے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً حضور ﷺ نے بطور تنبیہ اور زجر و توبیخ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو فرمایا ”نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔“

(۴۲۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ کا ایک رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَيْنِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَضَلَّهُ فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حَتَّى فُضِّتْ، فَقَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَتَحْنُ نَعْلُهَا لِنَمْرُضَى، نَسْتَنْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمَفْرُودِ: وَكَانَ يَلْبَسُهَا لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

چوغہ نکالا جس کی آستینوں، گریبان اور چاک پر دیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا کہ وہ وفات پا گئیں تو میں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ نبی کریم ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے تھے اور شفاء طلب کرتے تھے اور بخاری نے الادب المفرد میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کیلئے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿مکفوفہ﴾ منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿مکفوف﴾ کا مطلب ہے ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہوتا تھا۔ ﴿الجیب﴾ جیم پر فتحہ اور یا ساکن۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے۔ ﴿والکمین﴾ کاف پر ضمہ اور میم پر تشدید کم کا تشبیہ ہے قمیص کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ ﴿والفرجین﴾ فاف پر فتحہ را ساکن فرج کا تشبیہ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے بسا اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہوتا ہے۔ ﴿دباج﴾ دبیز و گاڑھا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا۔ ﴿حسی قبضت﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وفات پاگئیں۔ ﴿فقبضنها﴾ تو میں نے اس جبہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ﴿نستشفی بها﴾ صیغہ معروف متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں بستشفی صیغہ مجہول بھی ہے یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی۔ ﴿للسوف﴾ واو پر فتحہ اور فاساکن۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر اور معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور مجمعوں کے مواقع پر زینت و زیبائش کیلئے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا معنی یہ ہے کہ یہ ریشم کے کپڑے کے عرض میں لگا ہوا (طول میں نہیں) اور آستینوں، گریبانوں اور چاک پر ان کے طول کے حساب سے جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت، امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں اور وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مجمعوں کیلئے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے اور عمدہ اور اچھا صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہئے۔ بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ فخر و ریا اور کبر و نخوت اور شان نمائی نہ ہو۔ ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا گیا ہو۔



۳۔ کِتَابُ الْجَنَائِزِ

جُنازے کے مسائل

(۴۲۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «أَكْثَرُ مَا ذُكِرَ هَازِمُ اللَّذَاتِ: ذِكْرُ كَثْرَتِ سَيِّئَاتِهِ» (اے ترمذی اور الموطأ، الترمذی والنسائی، وصححه نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے) ابْنُ حَبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجنائز﴾ جیم پر فتح۔ جنازہ کی جمع ہے۔ جنازہ کی جیم پر فتح اور کسرہ دونوں اعراب ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ چارپائی پر رکھی ہوئی میت اور ایک قول کے مطابق جیم پر فتح ہے اس صورت میں اس کا معنی میت کے ہیں اور کسرہ کی صورت میں اس چارپائی کو کہیں گے جس پر میت پڑی ہو اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے یعنی فتح کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرہ کی صورت میں میت ”کتاب الصلوٰۃ“ کے معابد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجنیز و تکفین کے جملہ امور و افعال میں نماز جنازہ زیادہ اہم ہے۔ لہذا اس طرح دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق جنازہ کی مشروعیت ہجری میں ہوئی۔ ﴿اکثروا﴾ اکثر سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو ﴿هاذم﴾ مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور ”لذات“ کی طرف مضاف ہے۔ ”ذال“ کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کا معنی کٹ ڈالنے والی، توڑ دینے والی۔ اس سے مراد موت ہے۔ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی، سب ختم ہو جاتی ہیں اور آدمی کو دنیا سے بے رغبت کر دیتی ہے اور ایک روایت میں ہادم بھی منقول ہے جو ﴿هدم البناء والجدار﴾ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ ﴿الموت﴾ جر (کسرہ) کی صورت میں عطف

بیان ہوگا اور رفی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر جو ”ہو“ ہو سکتا ہے اور نصب کی صورت میں ”اعنی“ کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں وہ ہاژم کا بیان ہوگا۔

حاصل کلام: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرینش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہر ایک کے اعزاء و اقرباء، احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے، سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی، خوف، محاسبہ اعمال، قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(۴۲۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ لِضُرِّ نَزَلَ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ مُتَمَنِّيًّا، فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ أَحْبِبْنِي مَا كَانَتْ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتْ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہو موت کی تمنا و خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہئے اے اللہ! جب تک جینا میرے لئے بہتر ہو اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب موت میرے لئے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا یتمنّین﴾ ”تمنی“ سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ ”نفر“ ضار پر ضمہ اور کبھی فتح بھی آجاتا ہے۔ میرے جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے ﴿لابد﴾ ”با“ پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ ﴿احببنی﴾ حمزہ اس میں قطعی ہے یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہے مجھے زندگی عطا فرما ﴿توفنی﴾ مجھے وفات دے۔ یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آکر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے اور شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں خوف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: ایک سچے پکے مومن کیلئے زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صالح آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے، بدکردار، بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے۔ اس لئے دنیوی مصائب و آلام، مفلسی، غربت، بیماری وغیرہ سے تنگ آکر موت کی آرزو نہ کرے۔ البتہ رب کائنات سے

ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ اگر دین کے بارے میں کسی فتنہ اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت و آرزو کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو اونچا اڑانے کا باعث ہیں۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

(۴۲۷) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ بَرِيدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ نے نبی ﷺ سے بیان کیا کہ آپ ﷺ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: نے فرمایا ”مومن کی موت کے وقت اس کی پیشانی پر «الْمُؤْمِنُ يَمُوتُ بِعَرَقِ الْجَبِينِ»۔ پسینہ رونما ہو جاتا ہے۔“ (اس روایت کو تینوں (ترمذی، زوٰۃ الثلاثة، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿عَرَقُ الْجَبِينِ﴾ ”عرق“ پسینہ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہوتا ہے جو مومن کے گناہوں کی تطہیر کیلئے موت کے وقت اس کی پیشانی پر رونما ہوتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ طلب حلال، صوم و صلاۃ کی ادائیگی، احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلہ میں جو محنت و مشقت اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے تا آنکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(۴۲۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبْنِي حَضْرَتِ ابُو سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ اور حضرت ابو ہریرہ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے مُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قریب قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَقِنُوا مَوْتَكُمْ المرگ آدمی کو”لا الہ الا اللہ“ کی تلقین کرو۔“ (اسے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ. زَوَّاهُ مُنْصِلِمٌ وَالْأَذِنَةُ. مسلم اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لَقِنُوا﴾ تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے معنی ہیں یاد دہانی کراؤ۔ ﴿مَوْتَاكُمْ﴾ میت کی جمع ہے۔ جب مرنے والے کا وقت قریب ہو تو اس کو سناتے ہوئے اس کے پاس پڑھا جائے، تاکہ وہ اسے سنے اور سمجھے اور پھر خود بھی پڑھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گو صرف لا الہ الا اللہ کی تلقین کا ذکر ہے مگر اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ قریب المرگ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے پڑھیں اور جب مرنے والے کے حواس قدرے ٹھیک ہوں تو اسے بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔ نہ تو اسے مرنے والے ہی کو تلقین کرنے پر منحصر کیا جانا چاہئے اور نہ اعزاء و اقرباء اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ نبی ﷺ نے خود ایک قریب المرگ آدمی کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کیلئے فرمایا تھا۔ (مسند احمد) جس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو بھی پڑھنے کیلئے کہا جاسکتا ہے۔

(۴۲۹) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «افْرَأُوا عَلَى مَوْتَاكُمْ يَسْ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اپنے مرنے والوں کے قریب سورہ یس پڑھا کرو۔“ (اسے ابوداؤد، نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اقروا﴾ امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے پڑھو، پڑھا کرو ﴿علی موتاکم﴾ جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورۃ یاسین پڑھنے سے میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تاہم امت کی اکثریت کا اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿مَعْقِلُ بْنُ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ معقل میں میم پر فتح، ”عین“ پر سکون اور ”قاف“ پر کرہ ہے۔ مزینہ قبیلہ کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نمر منسوب ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھودی تھی اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ ”اذا جاء نهر الله بطل نهر معقل“ جب اللہ نمر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو معقل کی نمر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ آپؐ امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر دور میں ۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک مزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(۴۳۰) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَدْ شَقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ اتَّبَعَهُ الْبَصَرُ»، فَصَبَّحَ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لَا تَذْغُو عَلَى أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُوْمِنُ عَلَى مَا تَقُولُونَ»، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْزُقْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّينَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّزْ لَهُ فِيهِ، وَاخْلُقْهُ فِي عَقِبِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿ابوسلمہ رضی اللہ عنہما﴾ ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے شوہر ﴿شق﴾ شین پر فتح صیغہ معلوم۔ ﴿بصرہ﴾ اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے۔ اس صورت میں کہ وہ لازم ہے اور نصی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی فعل ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی اور ﴿شق بصرہ﴾ کنایہ ہے موت سے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹی نہیں۔ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے ﴿فاعمضہ﴾ آپؐ نے اسے بند کر دیا یعنی آنکھ کے پپوٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ ﴿قبض﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿فصح﴾ اس میں فاتعقوب کیلئے ہے، یعنی معاً اہل خانہ نے رونا، چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح واویلہ اور واشورہ کہہ رہے تھے اس لئے حضور ﷺ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کہ فرشتے تمہارے لئے آمین کہتے ہیں۔ ﴿تومن﴾ تامين سے ہے یعنی آمین کہتے ہیں۔ ﴿وافصح﴾ وسع و کشادہ فرما دے۔ ﴿نور﴾ تنویر سے امر کا صیغہ ہے یعنی اس کیلئے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ ﴿واخلفہ﴾ باب نصر یصغر سے۔ یعنی اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ ﴿فی عقبہ﴾ عین پر فتح اور قاف پر کسرہ۔ اپنے پیچھے، یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل و عیال، مال و متاع جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب و محافظ بن جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی جب روح جسد خاکی سے پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں انہیں فوراً بند کر دینا چاہئے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل و عیال اور حتی الامکان اعزہ و اقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہئے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کیلئے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت و بخشش کی دعا کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کیلئے دعا فرمائی۔ مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوسلمہ رضی اللہ عنہما﴾ ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پھوپھی زاد بھائی۔ آپؐ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما دونوں کا رضاعی بھائی ہے۔ ابولسب کی آزاد کردہ لونڈی نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ ہجرت اپنی البیہ کے ساتھ کی۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوہ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہو گیا مگر پھر جاری ہو گیا۔ ۳۴ جمادی الاولیٰ میں وفات پائی۔ شوال میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہما کو حرم نبوی میں داخل فرمایا۔

(۴۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَبَّ فُوتَ هُوَ تَوَّابٌ كَوَ اِيَكْ وَهَارِي دَارِ تَوَّابِي، سَجِّي بِرْدِ جَبْرَةٍ. مَتَّقْ عَلَيْهِ. چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿سجی﴾ تسجیۃ یعنی باب تفعیل سے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں۔ ڈھانپ دیا گیا۔ ﴿ببرد حبرہ﴾ اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور صفت موصوف کی بھی اور ﴿برد﴾ کے ”با“ پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا اور ﴿حبرہ﴾ میں ”حا“ کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے اور فتح بھی۔ بیل بوٹے والی چادر اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔ حاصل کلام: میت کو غسل سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ دوسرا آپؐ پر بھی موت وارد ہوئی۔ اس سے حیات النبی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا کہ اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی تو آپؐ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا ہے جو مرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (غسل اور تدفین و تجنیز وغیرہ) (۴۳۲) وَعَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَبْلَ النَّبِيِّ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. (کی پیشانی) کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿قبل﴾ تقبیل یعنی باب تفعیل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا تعظیم و تکریم کے نقطہ نظر سے بوسہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی منقول نہیں گویا اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

(۴۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”مومن کی روح قرض کے ساتھ اس وقت «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدِينِهِ، حَتَّى تَك معلق (لنگی) رہتی ہے جب تک اسے ادا نہیں يُقْضَى عَنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، کر دیا جاتا۔“ (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور وَحْشَهُ. ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿معلقہ﴾ تعلیق تعلیق یعنی باب تفعیل سے۔ جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کیلئے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا ﴿بدینہ﴾ وال پر فتح۔ قرض جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمہ واجب ہو۔ ﴿حتیٰ یقضیٰ عنہ﴾ صیغہ مجہول یعنی تا وقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تا وقتیکہ جس کا حق تھا وہ حق دار اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار میت کے ذمے ہوتا ہے جب تک اس کی طرف سے وہ قرض ادا نہیں کر دیا جاتا۔ خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب و رفقاء میں سے کوئی یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے قرض لیا تھا۔ جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے مگر جن لوگوں نے

دوسروں کی کوئی چیز یا مال فریب، دھوکہ یا ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہوگی، اس کا کیا حشر ہو گا۔

اگر مرنے والے نے اپنا مال اتنا پیچھے چھوڑا ہو کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو وارث اس مال میں سے قرض کی ادائیگی کرنے کے پابند ہیں۔ اگر وہ مفلس و غریب تھا اتنا مال ہی ترکہ میں پیچھے نہیں چھوڑا تو پھر اسلامی ریاست اس کے قرض ادا کرنے کی پابند ہوگی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”مرنے والا جو مال اپنے پیچھے چھوڑ کر مرے تو وہ وارثوں کا حق ہے اور جو قرض اس کے ذمہ تھا وہ میرے اور میرے والیان ریاست کے ذمہ ہے۔ ہم اسے ادا کریں گے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ قرض کی معافی نہیں کیونکہ یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

(۴۳۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ
فِي الَّذِي سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ، فَمَاتَ:
اغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَكَفَّنُوهُ فِي
ثَوْبَيْنِ. مَثَقَّ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
نے اس آدمی کے متعلق جو اپنی سواری سے گر کر
جاں بحق ہو جائے فرمایا کہ ”اسے پانی اور بیری کے
پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفن
دے دو۔“ (بخاری)

غلوٰی تشریح: ﴿فی الذی سقط عن راحلتہ﴾ یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے اونٹ سے گر گئے اور ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ ﴿بماء وسدر﴾ بیری کے پتوں کا طریق استعمال تین طرح پر ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنالی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے پھر خالص پانی سے بدن میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہوگا۔ ﴿کفینوہ﴾ تکفین سے امر کا صیغہ ہے۔ (باب تفعیل ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ (۲) اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ (۳) حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بھری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ (۴) انہی احرام کے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر ڈھانکا نہ جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سرنگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لبیک اللہم کا تلبیہ پڑھتا ہوا ننگے سر اٹھے گا۔ (بخاری) بھری کے پتوں میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم بھی ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

(۴۳۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ ﷺ، قَالُوا: وَاللَّهِ مَا نَذَرِي نُجَرِّدُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ لَا؟ الْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم! ہمیں علم نہیں کہ ہم نبی ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مَوْتَانَا اَمْ لَا؟ الْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

پھر ساری حدیث بیان کی۔ (احمد اور ابو داؤد)

لغوی تشریح: ﴿ماندری﴾ یعنی ہمیں معلوم نہیں۔ ﴿نجرود﴾ تجرید سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف مرحوم رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابہ کرامؓ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں انہوں نے کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ لہذا صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہؓ کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں انہیں تردد ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں۔ ورنہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا۔ البتہ قابل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(۴۳۶) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُعْسَلُ ابْنَتَهُ، فَقَالَ: «اغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذَلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الْأَخْيَرَةِ كَافُورًا، أَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُورٍ»، فَلَمَّا فَرَعْنَا آذَانَهُ، فَأَلْقَى إِلَيْنَا حِقْوَهُ، فَقَالَ: أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «أَبْدَأَنَّ بِمِيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا». وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَفَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلَاثَةً قُرُونٍ، فَأَلْقَيْنَاهَا حَلْفَهَا.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپؐ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”اسے تین یا پانچ مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو“ غسل پانی اور بیری کے پتوں سے دو“ آخر میں کافور یا فرمایا کچھ کافور ڈالو“ جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو اطلاع بھجوا دی آپؐ نے اپنا تہ بند اتار کر ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا ”اسے جسم کے ساتھ لگا دو۔“ (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ غسل دائیں طرف سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کرنا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے سر کے بالوں کو

تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو پشت پر ڈال دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ونحن نفسل ابنہ﴾ مشہور روایت کے مطابق یہ آپؐ کی صاحبزادی، ابوالعاص کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ خواتین کی میت کو غسل دیا کرتی تھیں۔ ﴿ان رایتن ذلک﴾ اگر تم یہ سمجھو کہ تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ ﴿بماء وسدر﴾ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ کا تعلق ﴿اغسلنہا﴾ کے ساتھ ہے یعنی غسل پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ دو۔ ﴿فی الاخیرۃ کافورا﴾ راوی کو تردید ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ”کافور“ کہا ہے یا ﴿شیشا من کافور﴾ فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لیتا۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ ”واجعلن فی آخر ذلک کافورا“ بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ ﴿آذناہ﴾ ابدان سے ماخوذ ہے۔ صیغہ جمع متکلم ہے۔ یعنی ہم نے آپؐ کو خبر دی۔ ﴿حقوہ﴾ ”حا“ پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے یعنی حاء کے نیچے کسرہ اور قاف ساکن ہے۔ اس سے مراد تہہ بند ہے۔ دراصل تو یہ تہبند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر مجازی طور پر ازار کیلئے بولا جاتا ہے۔ ﴿اشعرنہا ایاء﴾ اشعار سے امر کا صیغہ ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس تہبند کو بطور شعار استعمال کرو۔ ”شعار“ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ ﴿ابدان﴾ آغاز کریں، ابتداء کریں ﴿بمیا منہا﴾ میمنہ کی جمع ہے یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ ﴿فضفرنا شعرہا﴾ ﴿الضفر﴾ مینڈھی، بالوں کو اس طرح بٹ دے کر یا بن کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ ﴿ثلاثۃ قرون﴾ قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی ﷺ کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔

حاصل کلام: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہئے۔ البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ یعنی طاق کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہئے۔ غسل کا آغاز بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد حصول برکت کی غرض سے کسی بزرگ کا خاص کپڑا پہنانا بھی جائز ہے۔ خاتون میت کے سر کے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیچھے ڈال دیئے جائیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہئے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا

چاہئے یا جسم پر کافور مل دینا چاہئے۔ کافور کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔

(۴۳۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَفَّنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُفْنًا ثَلَاثَةً أَنْوَاعٍ بِنَصْرِ سَحُولِيَّةٍ تَمِينَ كِطْرُونَ فِي كَفْنٍ دِيَاغِيَا تَهَا. جَسَ فِي مِثْقَالِ قَمِيصٍ أَوْ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا يَكُونُ نِجَاسٌ فِيهَا. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کفن﴾ تکفین سے ماخوذ ہے ﴿ثلاثة انواع﴾ یعنی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ ﴿بعض﴾ ”با“ کے نیچے کسرہ ہے، بیض کی جمع ہے۔ ﴿سحولیة﴾ ”سین“ اور ”حا“ دونوں پر ضمہ اور یہ بھی منقول ہے سین پر فتح اور ”حا“ پر ضمہ۔ حول کی طرف منسوب ہے۔ یمن کا ایک قصبہ یا بستی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا۔ کیونکہ دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سحولیہ کا معنی تقیہ (صفائی و طہارت اور پاکیزگی و نظامت) کے ہوں گے۔ ﴿کرسف﴾ کاف پر ضمہ ”را“ ساکن اور سین پر ضمہ یعنی کپاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت مرد ہو تو اسے تین کپڑوں میں کفن دینا چاہئے۔ ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ ہی گپڑی اور کفن میں سوتی کپڑا بہتر ہے۔ تین کپڑوں سے مراد جہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی، تہ بند اور بڑی چادر ہے۔

(۴۳۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَا: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ اللَّهِ ﷺ فُوتَ هُوَا تَوَا سَ كَابِثَارَ سَوَالِ اللَّهِ ﷺ كِي خَدَمَتِ فِي اللَّهِ بِنُ أَبِي جَاءَ ابْنُهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَاضِرَ هَوَا اَوْ عَرَضَ كِيَا اَوَّ اَوَّ قَمِيصِ عَنَايَتِ فَرَمَادِیْ فَقَالَ: اَعْطِنِي قَمِيصَكَ اُكْفِنُهُ كِه مِی اَس مِی اَس كِفْنِ دِے دَو۔ اَوَّ نِے اَوَّی فِیْهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿فاعطاه﴾ اپنی قمیص عطا فرمادی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا۔ پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ ممکن ہے آپ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو، دفن کے بعد یہ وعدہ جب یاد دلایا گیا تو آپ نے قمیص عنایت فرمادی۔ آپ نے اپنی قمیص اس لئے عنایت فرمائی تھی کہ غزوہ بدر کے اسیران کو آپ نے لباس دیئے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے ان کا قد لمبا تھا کسی کی قمیص انہیں پوری نہیں آتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تو انہیں پوری آگئی۔ حضور ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے اس لئے یہ قمیص اس کو پہنائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی، اس واقعہ سے اندازہ لگالیں۔ اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ (بلکہ منافق کی خواہش کا بھی احترام کیا) راہنمایان و لیڈر حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن ابی﴾ جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہونے کے بعد منافقین کا لیڈر بنا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوہ احد کے موقع پر لشکر اسلام کا تہائی حصہ لے کر واپس ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورہ منافقین میں آیت (لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منها الاذل) اسی کا قول ہے۔ ۹ھ میں ذی قعدہ میں فوت ہوا۔ ”ابی“ ہمزہ پر ضمہ اور یا پر تشدید۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

﴿ابنہ﴾ اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول مراد ہیں۔ عظیم صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمانہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں بہت سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے لئن رجعنا..... الخ کہا تھا تو انہوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(۴۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الْبُسُوءُ مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيْضُ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفَنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ». علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ. صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس آنحضور ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا۔ گو آپؐ نے کبھی کبھی رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہئے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۴۴۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ دَعَا سَائِلًا أَنْ يَكْفِنَهُ». (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اچھا و عمدہ کفن

دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہئے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ آری ہے۔

(۴۴۱) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اور انہی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبی ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «أَيُّهُمُ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ؟» فَيَقْدُمُهُ فِي اللَّحْدِ، وَلَمْ يُعْسَلُوا، وَلَمْ يُصَلَّ اتارتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ہی ان عَلَيْنِهِمْ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔ کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿قتلی﴾ قتل کی جمع ہے۔ معنی مقتول کے ہی ہیں۔ ﴿احد﴾ ”عمزہ“ اور ”حا“ دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوہ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا۔ جو تاریخ اسلام میں معروف ہے۔ یہ غزوہ ۳ھ میں شوال کے مہینہ میں ہوا تھا جس میں ستر صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش کیا اور نبی کریم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ ﴿ایہم اکثراخذاً للقرآن﴾ جسے قرآن زیادہ اذہر ہو۔ ﴿فیقدمہ﴾ تقدیم سے ماخوذ ہے یعنی اسے آگے رکھا جائے۔ ﴿اللحد﴾ میت کو قبر میں رکھنے کیلئے قبر کے پہلو میں جو شکاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفننا درست ہے۔ (۲) دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کیا جانا چاہئے۔ (۳) شہداء فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا کہ ”ان کو غسل مت دو۔ ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک کی سی خوشبو دے رہا ہوگا۔“ (۴) شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کیلئے دعائے مغفرت ہے۔ ورنہ شہید کی نماز جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(۴۴۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ فرماتے سنا کہ (بہت قیمتی کفن نہ دیا کرو۔ وہ تو بہت يَقُولُ: «لَا تَغَالُوا فِي الْكَفْنِ، فَإِنَّهُ جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

يُسَلَّبُ سَرِيْعًا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿لَا تَعَالَوْا﴾ معالاء سے ماخوذ ہے یا تعالیٰ ہے۔ اس صورت میں ایک ”تا“ محذوف ہوگا۔ اس کے معنی ہیں ”بہت قیمتی“ ﴿يُسَلَّبُ﴾ صیغہ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔ حاصل کلام: بہت قیمتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ دیر یا سویر بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ روایت سند اکمزور ہے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دینا۔ زندہ آدمی نے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (بخاری)

(۴۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: نے انہیں فرمایا کہ ”اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو لَوْ مِتُّ قَبْلِي لَفَسَلْتُكَ، الْحَدِيثُ. جائے تو میں تمہیں غسل دوں گا۔“ (اسے احمد اور ابن رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ. ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر اپنی اہلیہ کو غسل دے سکتا ہے۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام کا عمل امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ (رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر کو خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں اور یہی بات رائج ہے۔

(۴۴۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنَّ تَحِي کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ وصیت کی يُعَسِّلُهَا عَلَيَّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. (دارقطنی) رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ.

حاصل کلام: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہو گیا۔

راوی حدیث: ﴿فاطمہ بنت النبی رضی اللہ عنہا﴾ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار۔ ۲ھ رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ھ رمضان المبارک میں نبی ﷺ

کے چھ ماہ بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(۴۴۵) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے عابدیہ کے قصہ میں مروی ہے
تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْعَامِدِيَّةِ، جسے رسول اللہ ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں
النَّبِيِّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزَّانَا رجم و سنگساری کا حکم دیا تھا کہ آپؐ نے اس کی نماز
- قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصُلِّيَ عَلَيْهَا جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا پھر خود اس کی جنازہ پڑھی
وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اور اسے دفن کیا گیا۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿فی قصۃ العامدیۃ﴾ عابدیہ عابد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے عابدیہ کہلائی۔
بحینہ کی ایک شاخ تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو خود اس کا اعتراف کیا
کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ لہذا نبی ﷺ نے بچہ کا دودھ پلائی کا زمانہ گزار کر دودھ چھڑانے کے بعد رجم کا
فیصلہ فرمایا اور حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ رجم کہتے ہیں مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے
گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس
کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حاصل کلام: صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ آنجناب ﷺ نے بذات خود عابدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی
تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مثلاً خودکشی کرنے والا زنا کرنے والد وغیرہ کے بارے میں قاضی
عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام
اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہئے، تاکہ فاسق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(۴۴۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے تیر سے
النَّبِيِّ ﷺ بِرَجْلِهِ قَتَلَ نَفْسَهُ خودکشی کی تھی۔ آپؐ نے اس کی نماز نہ پڑھی۔
بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ (مسلم)

مسلم

لعنوی تشریح: ﴿اسی﴾ صیغہ مجہول لایا گیا ﴿بمشاقص﴾ مشقص کی جمع۔ مشقص کے میم کے
نیچے کسرہ ہے۔ چوڑا نیزہ ﴿فلم یصل علیہ﴾ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ یعنی بطور عبرت اور اس جیسا
فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے، دھمکانے کیلئے آپؐ نے نماز جنازہ نہ پڑھی۔

حاصل کلام: خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ
نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز و فضاء تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔
البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ نسائی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔“
یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ جیسے ابتداء میں آپؐ مقروض کا جنازہ

نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہؓ کو فرمادیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو۔

(۴۴۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْمَرْأَةِ الَّتِي كَانَتْ تَقُمُ الْمَسْجِدَ - قَالَ: فَسَأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلَا كُنْتُمْ أَذْنُتُمُونِي؟» - هِيَ؟ گویا انہوں نے اس کے معاملہ وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ۔ انہوں نے آپؐ کو اس کی قبر کا راستہ بتا دیا۔

آپؐ نے وہاں جا کر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَرَأَى مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظِلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِنِي جاتی ہے۔»

لغوی تشریح: ﴿نقم﴾ قاف پر ضمہ اور میم پر تشدید یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیوں، کپڑے کے چیتھڑوں کے ذریعہ کوڑا کرکٹ اور غبار اور بھوسا وغیرہ نکال باہر کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام ام مَجْن تھا۔ ﴿آذنتمونی﴾ اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ ﴿صغروا﴾ نبی ﷺ کی عظمت کے پہلو کے اعتبار سے انہوں نے اس کی وفات کو معمولی اور حقیر سمجھا۔ ﴿دلونی﴾ دال پر ضمہ۔ دلالت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿فدلوه﴾ دال پر فتح اور لام پر ضمہ دلالت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ﴿ظلمة﴾ منسوب ہے تمییز واقع ہونے کی بنا پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپؐ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (۲) مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انہی قبروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔۔ (۳) مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ (۴) مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ (۵) مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلًا، لَا يَبْشُرُكُونَ بِاللَّهِ شَيْئًا، إِلَّا شَقَّعَهُمُ اللَّهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ”کوئی مسلمان نہیں مرتا کہ اس کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مرنے والے کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کثرت جنازہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں چالیس موحّد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے کہ بعض دوسری احادیث میں سو کی تعداد بھی ہے اور بعض میں تین مضمون کا ذکر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپؐ نے تعداد کا ذکر فرمایا دیا۔

(۴۵۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ حَدَّثَنَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نَفْسِهَا، فَقَامَ وَسَطَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپؐ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی نفساها﴾ بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان میں کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مسند امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلہ میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منہ ایمان ہے اس لئے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ مگر یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

(۴۵۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: وَاللَّهِ لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى ابْنَتِي بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (مسلم)

حاصل کلام: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی شرعی و نقلی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رحمہ اللہ کا جنازہ حضرت عمر رحمہ اللہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ نیز مسند سعید منصور میں ہے کہ حضرت عمر رحمہ اللہ خلیفہ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت صہیب رحمہ اللہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ اگر ایسا کرنا ناجائز و مکروہ ہوتا تو خلفاء راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابہؓ کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی قسم کی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جاسکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بیضاء﴾ سھل اور سھیل کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فہرہ ہے اور ان کے خاوند کا نام وہب بن ربیعہ قرشی ہے۔ سھل تو ان لوگوں میں سے تھا جس نے قریش کے اس صحیفہ کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا اور ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ رہے سھیل تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے ہیں۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل رہے ہیں۔ غزوہ تبوک ۹ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ دو تو یہ تھے اور تیسرا صفوان تھا۔ غزوہ بدر میں قتل ہو کر جام شہادت نوش کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کافئ عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(۴۵۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبِعًا، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةِ حُمْسًا، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُكَبِّرُهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَالْأَزْهَعِيُّ.

حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے تھے مگر (خلاف معمول) ایک مرتبہ انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور

ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے پانچ، چھ، سات اور آٹھ تکبیریں بھی منقول ہیں۔ مگر اکثر روایات میں چار

الْجَنَّةِ، وَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَعَذَابَ اَهْلِ و عِيَالٍ سَهْمًا اَهْلٍ و عِيَالٍ عَطَا فَرَمَا، اَسَ جَنَّةِ النَّارِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

دوزخ سے محفوظ رکھ۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نزله﴾ ”نون“ اور ”زا“ دونوں پر ضمہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”زاء“ ساکن ہو۔ خورد و نوش کی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی کوئی چیز اور یہاں اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿وسع﴾ توسیع باب تفعیل سے۔ کشادہ و وسیع کر۔ ﴿مدخلہ﴾ میم پر ضمہ، جائے داخلہ۔ مراد یہاں قبر ہے۔ ﴿البرد﴾ ”با“ اور ”را“ دونوں پر فتح اولے مراد ہیں۔ ﴿نقه﴾ ”قاف“ پر تشدید۔ تنقیہ سے ماخوذ ہے، دعا ہے کہ پاک کر دے صاف ستھرا کر دے۔ ﴿الندس﴾ وال اور نون دونوں پر فتح میل یکیل۔ ﴿ابدلہ﴾ ابدال سے ماخوذ ہے (باب افعال) بدل دے۔ اس کے عوض دے ﴿وقہ﴾ اس میں واؤ عطف کی ہے۔ ”قاف“ کے نیچے کسرہ ہے۔ وقایہ سے ماخوذ ہے۔ دعا ہے اور ”ہاء“ ضمیر میت کی طرف راجع ہے۔ بچا ہے، حفاظت فرما اس کی، محفوظ رکھ اسے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی۔ تبھی تو حضرت عوف بن مالکؓ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ ابو داؤد وغیرہ میں تو ”سمعت“ کا لفظ صراحتاً منقول ہے کہ میں نے یہ دعا آپؐ سے سنی اور یہ بھی امکان ہے کہ راوی نے آپؐ سے بعد میں پوچھ کر یاد کر لیا ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے اور بعض بآواز بلند کے بھی قائل ہیں۔ بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رات کے اوقات میں بآواز بلند اور دن میں آہستہ آواز سے مانگی چاہئے۔ دعائیں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے اس لئے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو رائج قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباسؓ کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عوف بن مالکؓ﴾ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلہ ایشیع سے تعلق کی وجہ سے اشیعہ کہلائے۔ غزوہ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلہ اہمّج کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(۴۵۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: ”الّٰہی! ہمارے زندوں اور مردوں، ہمارے حاضر و غائب، ہمارے چھوٹوں اور بڑوں، ہمارے مردوں اور عورتوں کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الٰہی! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور

أَحْيَيْتُهُ مِنَّا فَأَخِيهِ عَلَى الْإِسْلَامِ ، جیسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز
وَمَنْ تَوَقَّيْتُهُ مِنَّا فَتَوَقَّهِ عَلَى الْإِيمَانِ ، فرما۔ الٰہی! ہمیں اس کے اجر و ثواب سے محروم نہ
اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ ، وَلَا تَنْفِتِنَا رُکھو اور نہ ہمیں اس کے بعد گمراہ کرنا۔ (اسے مسلم
بَعْدَهُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْأَزْبَعَةُ۔ اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت

کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿شاہدنا﴾ جو حاضر ہیں۔ ﴿صغیرنا﴾ کم عمر اور چھوٹے عمر والوں کے حق میں بلندی
درجات کی دعایا اس کی دعا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ ﴿
فاحیہ﴾ احياء سے ماخوذ ہے۔ زندگی کی دعا۔ ﴿لا تحرمنا﴾ ”تا“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ۔
حرمان سے ماخوذ و مشتق ہے۔ نہ محروم رکھ ہمیں۔ ﴿اجرہ﴾ اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا
ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ ﴿لا نفیتنا﴾ دوسرے ”تا“ کے نیچے کسرہ اور نون جمع پر تشدید۔ باب ضرب
بضرب سے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و
آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لئے مقام عبرت بنا دے۔ یہ حدیث مسلم میں نہیں
ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ کسی کاتب کی کرم فرمائی ہے، مصنف کی نہیں۔

(۴۵۹) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے
«إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ
الدُّعَاءَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ. خلوص دل سے اس کیلئے دعا کرو۔“ (اسے ابوداؤد نے

روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز جنازہ پڑھنے والے دراصل مرنے والے کیلئے رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی
سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو اس لئے سفارش کرنے
والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے۔ لہذا اس کیلئے جتنے
خلوص قلب سے دعا کی جاسکتی ہو کرنی چاہئے۔ لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں۔ خلوص
نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے اور دو تین منٹ میں جنازے کا جھٹکا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(۴۶۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے
«أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكَ صَلَاحَةً، فَخَيْرٌ تَقْدُمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكَ سَوَى ذَلِكَ، فَشَرٌّ تَضُمُونَهُ عَنْ
جَاؤُا اور اگر دوسرا ہے (برا آدمی ہے) تو اپنی گردن

رِقَابِكُمْ۔ مَنَقَّ عَلَيْهِ۔ سے اتار کر رکھ دو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اسرعوا﴾ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کو جلدی لے جاؤ اور تجیزو تکفین میں جلدی کرو ﴿تضعونه﴾ وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانا ہوتا ہے اور یہ کنایہ اپنے سے دور کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے دفن کرنے میں بلا ضرورت تاخیر کرنا خلاف سنت ہے۔ میت کو جلدی دفن کرنے کی تاکید حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھی۔ نیز طبرانی میں سند حسن سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اسے روک نہ رکھو بلکہ اسے قبر کی طرف جلدی سے لے جاؤ۔“

(۴۶۱) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ». مَنَقَّ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «حَتَّى تُوَضَّعَ فِي اللَّحْدِ»۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔“ دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”دو قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔“ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے ”میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔“ اور بخاری کی روایت میں ہے ”جس نے کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿قیراط﴾ ”قاف“ کے نیچے کسر۔ نصف دانق اور دانق درہم کا چھٹا حصہ۔ قیراط سمجھ میں جلدی آجانے والا پیمانہ وزن تھا اس لئے قیراط بولا گیا ہے۔ اس زمانہ میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مذکور قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی بتانا مطلوب و مقصود تھا کہ اس کو دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ ﴿ایماننا و

احتساباً کے دونوں منصوب ہیں علت کی بنا پر یا پھر حال واقع ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازہ میں شرکت کے ساتھ طلب اجر و ثواب کی غرض ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازہ میں شرکت کا اہتمام کریں۔ اس روایت میں لفظ ”قیل“ سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ابو عوانہ میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال آپ سے کیا تھا کہ قیڑ کیا ہے؟

(۶۲۲) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ حَضَرَتِ سَالِمُ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، انہوں نے نبی ﷺ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو يَمْشُونَ أَمَامَ الْجَنَازَةِ. رَوَاهُ الْحُسَيْنُ، جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (اس کو پانچوں نے وَصَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَأَعْلَاهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةٌ روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی اور ایک گروہ نے اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا بِالْإِسْأَالِ۔

(5)

حاصل کلام: جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہئے یا پیچھے۔ مختلف روایات سے آپ کا عمل دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرح ثابت ہے مگر بہتر کونسا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ جمہور علماء امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ تینوں ائمہ آگے آگے چلنے کو بہتر خیال کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ پیچھے چلنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے پیچھے ہر سمت چلنا جائز ہے۔ کسی پر فوقیت و برتری اور ترجیح نہیں۔ چلنے والے جس طرح سہولت پائیں، اس پر عمل کریں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیدل چلنے والے آگے چلیں اور سوار جنازے کے پیچھے پیچھے۔ یہ رائے سفیان ثوری اور کچھ دیگر علماء کی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ خواتین بھی ہوں تو اس صورت میں مردوں کو جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے ورنہ پیچھے چلیں گے۔ بہر حال جس طرح کی صورت درپیش ہو چلنے والے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

راوی حدیث: (سالم) ان کی کنیت ابو عبد اللہ یا ابو عمر ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ سالم بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے فقہاء سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم و فضل میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۰۶ھ میں ذی القعدہ یا ذی الحجہ کے مہینے میں فوت ہوئے۔

(۴۶۳) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: نُهَيْتُنَا عَنْ اتِّبَاعِ
الْجَنَازِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ
ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا مگر یہ
ممانعت ہم پر لازمی قرار نہیں دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نہینا﴾ صیغہ مجہول ہے مگر یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ بخاری میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ ﴿لم یعزم﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی یہ ممانعت ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دی گئی بلکہ یہ نفی کراحت و ناپسندیدگی کیلئے تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہو گیا تو جس طرح آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے نسائی، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ ایک جنازہ میں عورتیں شریک ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”انہیں جانے دو۔“

(۶۶۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ الْجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ بَعَثَهَا فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى تَوَضَّعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم کسی جنازے کو آتے دیکھو تو الجنازۃ فقوموا، فمن بعثها فلا يجلس حتى توضع.“ متفق علیہ۔

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فقوموا﴾ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری دو ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قیام چھوڑ دیا تھا (حتیٰ توضع) آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔

حاصل کلام: موت کا عمل انسان کیلئے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے۔ نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ کو علم ہوا کہ جنازہ کیلئے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپؐ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنا نہیں چاہئے۔ نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ نبی ﷺ کسی جنازے پر حاضر ہوئے ہوں اور جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے ہوں۔

(۶۶۵) وَعَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، أَنَّ فَضْلَ بْنَ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا رَأَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ بَعَثَهَا فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى تَوَضَّعَ».

حضرت ابواسحقؓ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يَزِيدَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَذْخَلَ الْمَيِّتَ مِنْ قَبْلِ رَجُلِي فِي اتَارِا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (ابوداؤد)
القَبْرِ، وَقَالَ: هَذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿مَنْ رَجَلَ الْقَبْرِ﴾ یعنی اس جانب سے جس جانب سے میت کے پاؤں ہوتے ہیں یہ حال کا اطلاق محل پر ہے۔ یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔
حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہئے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعیؒ و احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو اسحاق﴾ عمرو بن عبد اللہ سیبی حمدانی کوئی۔ مشہور تابعی کثیر الروایہ۔ مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عبد اللہ ابن یزیدؓ﴾ عظمیٰ انصاری۔ قبیلہ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیرؓ کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

(۶۶۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُورِ، فَقُولُوا: بِسْمِ اللَّهِ، وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَأَعْلَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوُفِّ.
حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو ”بسم اللہ“ وعلی ملہ“ رسول اللہ“ کہو۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے نکالا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے معلول قرار دیتے ہوئے اسے وقوف کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ امام دارقطنیؒ کی طرح نسائی نے اس روایت کو گو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔

(۶۶۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «كُسِرَ عَظْمُ الْمَيِّتِ كَكُسْرِهِ زَنْدَةَ إِنْسَانٍ كِي هُذِي تَوُزْنُهُ كَالْغَنَاءِ»
حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کسی مردے کی ہڈی توڑنے (کا گناہ)“

حیًا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، (اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرط کی سند سے روایت کیا ہے) وَزَادَ ابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: «فِي» اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت میں الإِنْمِ» اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (گناہ میں)۔

لغوی تشریح: ﴿فِي الْإِنْمِ﴾ گناہ میں۔ یعنی کہ مردہ کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسا ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنے کا ہے۔ یہ درد اور الم و تکلیف کے پہلو سے نہیں کیونکہ زندہ کو اس سے تکلیف ہوگی جبکہ مردے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسلمان خواہ وہ مردہ ہی ہو اس کی عزت و احترام کا سبق ملتا ہے۔ احترام میں زندہ اور مردہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھا۔ مگر اس دور میں سرجری نے اتنی ترقی کر لی ہے جس کا صدیوں پہلے خواب و خیال بھی نہ تھا۔ علماء کرام نے جرم کی تحقیق و تفتیش کیلئے پوسٹ مارٹم اور علاج معالجہ کیلئے چرچاڑ کی اجازت دی ہے۔

(۴۶۸) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَلْحَدُوا لِي لَحْدًا وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبْنَ نَضْبًا، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے لئے بغلی لحد والی قبر بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں چننا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔ (مسلم)

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر زمین سے صرف ایک باشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ”قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔“

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الْأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقَعَّدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُنْبَى عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿الْحَدُوا﴾ فتح یفتح سے امر کا صیغہ۔ لحد۔ قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں جہاں سے میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے ﴿وَانْصِبُوا﴾ ضرب بضر ب سے صیغہ امر ہے۔ اقیموا کے معنی میں یعنی نصب کرو، قائم کرو ﴿اللبن﴾ لام پر فتح اور ”با“ کے نیچے کسرہ، اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے جب اسے آگ میں پکایا جائے تو ”آجر“ کہتے ہیں یہ جیم پر ضمہ اور ”را“ پر تشدید ﴿قدر شبر﴾ شین پر کسرہ اور ”با“ ساکن۔ یہ فاصلہ ہے جو انگوٹھے کے سر سے لے کر چھٹکی کے سر تک۔ یعنی باشت۔ ﴿ان

میت کیلئے ثابت ہے۔ مگر اس دور میں لوگوں نے سنت کو پس پشت ڈال کر نئی نئی رسمیں ایجاد کر لی ہیں اور اذانیں شروع کر دی ہیں جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

(۴۷۱) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيبٍ - حضرت ضمرة بن حبیب رضی اللہ عنہ جو ایک تابعی ہیں سے أَحَدِ التَّابِعِينَ - قَالَ: كَانُوا يَسْتَحْبُونَ إِذَا سُويَ عَلَى الْمَيِّتِ قَبْرُهُ وَانْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلَانُ! قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلَانُ! قُلْ: رَبِّي اللَّهُ، وَدِينِي الْإِسْلَامُ، وَنَبِيِّ مُحَمَّدٍ ﷺ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْفُوعًا، وَلِلطَّبْرَانِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أُمَامَةَ مَرْفُوعًا

مروی ہے کہ لوگ مستحب سمجھتے تھے کہ جب میت کی قبر برابر و ہموار کر دی جاتی اور لوگ جانے لگتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کو مخاطب ہو کر یوں کہا جائے اے فلاں (لا الہ الا اللہ) کہو۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں)۔ اس کو تین مرتبہ کہتے۔ اے فلاں! ”ربی اللہ و دینی الاسلام و نبی محمد“ کہو۔ (میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور محمد میرے نبی ہیں)

(سعید بن منصور نے اسے موقوف بیان کیا ہے اور طبرانی نے اسی طرح کی ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی لمبی مرفوع حدیث بیان کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿کانوا یستحبون﴾ پسند کرنے والوں سے یہاں صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ﴿سوی﴾ تسوئہ سے ماخوذ ہے، علامہ ابن قیم نے المنار میں کہا ہے کہ تلقین کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک موضوع ہونے میں ذرا بھر شک نہیں۔ اسی طرح انہوں نے ”الہدیٰ“ میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

حاصل کلام: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اہل شام کے علاوہ میں نے یہ عمل کسی اور کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راوی حدیث: ﴿ضمرة بن حبیب﴾ ان کی کنیت ابو عتبہ ہے۔ ضمرة میں ضاد پر فتح اور میم ساکن۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ ضمرة بن حبیب بن مصعب زیدی۔ زیدی کی ”زا“ پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے اس لئے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(۴۷۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْنِ - حضرت بریدہ بن الحُصَیْب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَالَهَا تَذَكُّرُ الْآخِرَةِ». زَادَ ابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتَزَهُدٌ فِي الدُّنْيَا». کیا ہے کہ ”یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنا دیتی ہے۔“

لغوی تشریح: فزورواھا زیارت سے امر کا صیغہ ہے۔ ممانعت کے بعد اجازت کے معنی میں ہے۔ ﴿تذکر﴾ تذکیر سے ماخوذ ہے یعنی یاد دہانی کراتی ہے۔ ﴿تزهّد﴾ تزهید سے ماخوذ ہے۔ یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ابتداء میں آپؐ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

(۴۷۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، لَعَنَتْ فَرَمَائِي. (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صححہ ابن جبار۔) نے صحیح قرار دیا ہے

حاصل کلام: یہ حدیث خواتین کا قبور کی زیارت کیلئے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کیلئے جانا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت و رخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت و رخصت دی گئی تو اس میں مرد و عورت شامل ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تا حال زیارت قبور کی حرمت خواتین کیلئے برقرار ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع و فرح، آہ و بکا کثرت سے کرتی ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عموماً حرام کام کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں، روتی پٹختی اور بین کرتی ہیں، جزع و فرح کرتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں، یہ امور اسلام کی تعلیم کے متنافی ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے، اخروی یاد دہانی و تذکیر کیلئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں ”زوارات“ کا لفظ ہے کہ عورتوں کے باکثرت قبرستان جانے پر آپؐ نے لعنت فرمائی۔ عبرت کیلئے گاہے بگاہے جانا جائز ہے۔

علامہ البانی نے بھی اسی بات کو صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے ”زارات القبور“ کے الفاظ ضعیف ہیں اور صحیح ”زوارات القبور“ کے الفاظ ہیں جن میں عورتوں کیلئے کثرت سے قبرستان جانے کی ممانعت ہے۔ (احکام الجنائز)

(۴۷۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نُوْحَ كَرْنِے اور سُنْے والی پر لعنت رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ. فرمائی ہے۔ (ابوداؤد) أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: نائحة نباحہ سے ماخوذ ہے۔ مرنے والے کے اوصاف و شائل کو گن گن کر بلند آواز سے بیان کرنا اور رونا اور اچھے اور عمدہ کارناموں کو بیان کر کے چیخ و پکار کرنا۔ حاصل کلام: اس حدیث سے نوحہ کرنے اور سننے کی حرمت ثابت ہوتی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا باقاعدہ عہد لیتے تھے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(۴۷۵) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ حَضْرَتِ ام عطیہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ ﷺ نَحْمَ سے بیعت کے موقع پر یہ عہد لیا تھا کہ اللہ ﷻ أَنْ لَا نَنْوَحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ہم میت پر نوحہ نہ کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مرنے والوں پر نوحہ اور بین کرنا، چیخا چلانا، وایلا کرنا، گریہاں چاک کرنا، منہ نوچنا حرام افعال ہیں۔ غی سے آنکھوں کا اشک بار ہونا، آنسوؤں کا بے اختیار بہہ نکلنا حرام نہیں۔ گویا آنکھوں کا فعل حرام نہیں بلکہ زبان کا فعل حرام ہے۔

(۴۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ حَضْرَتِ ابْنِ عمر رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”مرنے والے کو اس پر نوحہ کرنے والوں کے «الْمَيْتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا يَنْبَغُ سَبَب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم عَلَيْهِ). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنِ الْمُفَيْزَةِ نِزَانِ دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطے سے اسی طرح بِنْدِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. روایت بیان کی ہے۔)

لغوی تشریح: «الْمَيْتُ يُعَذَّبُ» اس حدیث میں ایک اشکال ہے کیونکہ اس کی رو سے دوسرے کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ثابت ہو رہا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَذَرُوا وَرَثَةً (۱۵/۱۷) کہ ”کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“ اس لئے علماء کرام نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک قول ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ ہو اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا ہو پھر تو اسے عذاب ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو۔ بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

(۴۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ بِنْتًا لِلنَّبِيِّ ﷺ تُدْفَنُ، وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ جَالِسٌ عِنْدَ الْقَبْرِ، فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَذْمَعَانِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کی ایک صاحبزادی کی تدفین کے موقع پر حاضر تھا۔ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ میں نے دیکھا آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری)

نفوی تشریح: ﴿شہدت بنتا﴾ یہ آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثومؓ تھیں۔ جنہوں نے ۹ھ میں وفات پائی۔ ﴿تدفن﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ ﴿تدمعان﴾ ”تا“ اور میم دونوں پر فتح یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے۔ نبی ﷺ کے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیمؓ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ بھی گریہ و زاری کرتے ہیں؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا ”یہ بے صبری کی وجہ سے نہیں بلکہ شفقت پداری کی بنا پر ہے۔“ گویا غم کی وجہ سے شفقت پداری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قاتل مذمت و ملامت نہیں البتہ زبان سے چیخ و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(۴۷۸) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلَّا أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهَ، وَأَصْلُهُ فِيهِ مُسْلِمٌ، لَكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ فِي اللَّيْلِ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کیلئے مجبور ہو جاؤ۔“ (ابن ماجہ) اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپؐ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا الا یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

نفلوی تشریح: ﴿ لا تدفنوا ﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ ﴿ زجر ﴾ زجر سے مأخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔ مسلم کی حدیث میں رات کے اوقات میں میت کو دفن کرنے کی ممانعت صرف اس گمان کے تحت ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے۔

حاصل کلام: یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت کفن اچھی طرح نہ دیا جاسکے گا۔ اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی جائے اور کسی عذر سے دفن کی نوبت رات کو آئے تو یہ منع نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ کو رات ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی رات ہی کو ہوئی تھی بلکہ خود رسالت مآب ﷺ نے ایک صحابی کو رات کو دفن کیا تھا۔ (ترمذی، ابن ماجہ) یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کو کسی خاص وجہ کے بغیر بھی دفن کرنا جائز ہے۔ جمہور اسی

کے قائل ہیں۔ مگر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ رات کو بلا ضرورت دفن کرنا مکروہ ہے۔

(۴۷۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعِيُّ جَعْفَرٍ، حِينَ قُتِلَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، «اصْنَعُوا لِإِلِّ جَعْفَرٍ طَعَامًا، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ».

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو۔ ان کو ایسی تکلیف دہ اطلاع ملی ہے جو ان کو کھانا پکانے سے مشغول رکھے گی۔“ (نسائی کے علاوہ اسے یابنوں نے

أَخْرَجَهُ الْحَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيُّ.

روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو ان کو کھانا کھانا مسنون ہے۔ ہمسایہ کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اقرباء کیلئے سنت ہے باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔

راوی حدیث: ﴿جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ﴾ حضرت جعفر، ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا۔ نبی ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا ”مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے اتنی مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔“ انتہائی سخی انسان تھے۔ ۸ھ میں موت کے معرکہ میں جام شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکہ میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ کے بدلہ ان کے دو پر لگا دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔“ اسی وجہ سے ان کو جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر زوالجناحین بھی انہی کا لقب ہے۔

(۴۸۰) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَعْلَمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى الْمَقَابِرِ، أَنْ يَقُولُوا: السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا

حضرت سلیمان بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب قبرستان جاتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو سکھاتے کہ یوں کہو۔ سلام ہو تم پر اے گھر والو! مومنوں اور مسلمانوں میں سے اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں

شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، نَسَأَلُ اللَّهَ اور ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے عافیت کا لَنَا وَلَكُمْ الْعَافِيَةَ. رَوَاهُ مُسْنِم. سوال کرتے ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اہل الدیار﴾ ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار، دار کی جمع ہے۔ گھر کو قبر سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے کہ قبر میت کیلئے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر ان کیلئے اور اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ”من المومنین والمسلمین“ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک، کافر اور لحد کے لئے دعا و بخشش جائز نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس، مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یہ سب کام خلاف شرع ہیں اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سلیمان بن بریدہ بن حصیب اسلمی مروزی رحمہ اللہ﴾ مشہور تابعی ہیں۔ ابن معین اور ابوحاتم نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کیس مذکور نہیں مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث مسلم میں منقول ہیں۔

(۴۸۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِقُبُورِ الْمَدِينَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! يَغْفِرُ اللَّهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالْآثَرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ کے قبرستان پر ہوا۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ”اے اہل قبور! تم پر سلام ہو۔ اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔ اہل القبور! یغفر اللہ لنا ولكم، تم ہمارے پیشرو ہو اور ہم تمہارے پیچھے چلے آرہے ہیں۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿انتم سلفنا﴾ سلفنا میں سین اور لام دونوں پر فتح ہے۔ یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ ﴿نحن بالآثر﴾ اثر میں مرمرہ اور ”ثا“ پر فتح، ہم تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور تمہیں ملنے والے ہیں۔

(۴۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مردوں کو گالی مت دو اس لئے کہ انہوں نے جو بھیجا ہے اسے حاصل کر لیا ہے۔“

وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُعِيزَةِ نَحْوَهُ، لَكِنْ قَالَ: رَوَيْتُ كَيْفَ لَكِنْ اس میں فتوٰ ذوالاٰحیاء ہے
یعنی گالی سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔

لغوی تشریح: ﴿لَا تَسْبُوا﴾ سب سے ماخوذ ہے۔ باب نصرینصر گالی گلوچ، سب و شتم، برے اور قبیح
وصف سے پکارنا۔ ﴿افضو﴾ افضاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں۔ پاچکے ہیں ﴿الٰی مَاقَدَمُوْا﴾ جو اعمال
و افعال وہ آگے بھیج چکے ہیں یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ ﴿فتوٰ ذوالاٰحیاء﴾ ایذاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی
تمہارا مردوں کو برا بھلا کہنا، سب و شتم کرنا، زندوں کیلئے باعث اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے
قربت داری کا تعلق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو سب و شتم نہیں کرنا چاہئے۔ ابو لہب کی بیٹی
ورۃ مسلمان ہوئی تو بعض نے کہا اللہ کے دشمن کی بیٹی مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے اس کی شکایت رسول
اللہ ﷺ سے کی تو آپؐ نے فرمایا ”مرنے والوں کو برا مت کہو۔ اس سے ان کی مسلمان ہونے والی اولاد کو
تکلیف پہنچتی ہے۔“ (مسند احمد) غور فرمائیں جب کفار کو ان کی مسلمان اولاد کے سامنے گالی دینا جائز نہیں
تو مسلمانوں کے اکابرین کو گالی دینا اسلام کی کونسی خدمت ہے؟



۴۔ کِتَابُ الزَّكَاةِ

زکوٰۃ کے مسائل

(۴۸۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ: «إِنَّ اللَّهَ قَدْ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تَأْخُذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتَرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ». مَثَقَّ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ «تَرَدُّ» (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الزکاة﴾ لغت میں زکوٰۃ نمول یعنی زیادہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور پاکیزہ ہونا۔ زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مال کو پاک کر دیتی ہے اور مال کو اور بڑھا دیتی ہے اور اس کے وقت فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ھ میں فرض ہوئی، رمضان کی فرضیت سے پہلے اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ میں ہی ہو گئی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں ۲ھ کو نازل ہوئے ہیں۔ ﴿بعث معاذاً الى اليمن﴾ آپؐ نے ۱۰ھ میں معاذ بن جبلؓ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا اور ایک قول کے مطابق ۹ھ میں اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ھ میں بھیجا۔ معاذ بن جبلؓ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر شام کا رخ کیا اور طاعون عمواس کے زمانہ میں وفات پائی۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کیلئے وصیت تھی کہ انہیں اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک انجام دینا ہے ﴿افترض﴾ فرض قرار دی گئی۔ ﴿فترد﴾ اس میں ”فا“ تعقیب کیلئے ہے یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ﴿ترد﴾ رد سے ماخوذ ہے

اور صیغہ مجہول ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے عہد باسعادت سے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہو گیا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکوٰۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مقامی فقراء سے اگر زکوٰۃ بیچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکوٰۃ منتقل کی جاسکتی ہے۔ یہ غباء کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔

(۴۸۴) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كَتَبَ لَهُ: هَذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ، الَّتِي فَرَضَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، وَالَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولُهُ: «فِي كُلِّ أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ مِنَ الْإِبِلِ فَمَا دُونَهَا الْغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٍ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَعِشْرِينَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلَاثِينَ، فَفِيهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُتْنَى، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ فَأَبْنَى لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَثَلَاثِينَ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِينَ فَفِيهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُتْنَى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَأَرْبَعِينَ، إِلَى سِتِّينَ، فَفِيهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةٌ الْجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّينَ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِينَ، فَفِيهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَسَبْعِينَ، إِلَى تِسْعِينَ، فَفِيهَا بِنْتُ لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِينَ، إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ، فَفِيهَا حِقَّتَانِ طَرُوقَتَا الْجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو دیا تھا کہ اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری جب تعداد پچیس سے بڑھ کر پینتیس ہو جائے تو اس تعداد پر ایک سالہ اونٹنی اگر میسر نہ ہو تو پھر دو سالہ نر بچہ اور جب چھتیس سے تعداد بڑھ کر پینتالیس تک پہنچ جائے تو ان میں دو سالہ اونٹنی اور جب چھیالیس سے بڑھ کر ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں تین سالہ جوان اونٹ کی جفتی کے قابل اونٹنی اور جب اکٹھ سے بڑھ کر پچھتر تک پہنچ جائے تو ان میں چار سالہ اونٹ اور جب چھتر سے تعداد بڑھ کر نوے ہو جائے تو ان میں دو، دو سالہ دو اونٹیاں اور پھر اکانوے سے بڑھ کر تعداد ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو ان میں تین، تین سالہ دو جوان اونٹیاں۔ جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد

وَمِائَةٌ، فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بَنْتُ لَبُونٍ، وَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حَقَّةٌ. وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ إِلَّا أَرْبَعُ مِنَ الْإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَفِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ، فِي سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِينَ، إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاءَ، شَاءَ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ، فَفِيهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ، إِلَى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِيهَا ثَلَاثُ شِبَاءٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاءَ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عَنْ أَرْبَعِينَ شَاءَ، شَاءَ، وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشِيَّةُ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ، فَإِنَّهُمَا يَتَرَاكِعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ. وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرَمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ، وَلَا تَيْسٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْمُصَدِّقُ. وَفِي الرِّقَّةِ: فِي مِائَتِي دِرْهِمٍ، رُبْعُ الْعُشْرِ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ إِلَّا تِسْعِينَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حَقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحَقَّةُ،

پر کوئی زکوٰۃ نہیں الا یہ کہ ان کا مالک چاہے اور بکریوں کی زکوٰۃ کہ جو باہر چرنے جاتی ہوں، چالیس سے لے کر ایک سو بیس کی تعداد پر صرف ایک بکری زکوٰۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے گی تو دو بکریاں زکوٰۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائے گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے گی تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ وصول ہوگی، اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم تعداد میں ہوں تو مالک پر کوئی زکوٰۃ نہیں الا یہ کہ مالک چاہے۔ زکوٰۃ کے ذر سے نہ تو الگ الگ چرنے والیوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ ہی اکٹھی چرنے والیوں کو الگ الگ۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہوں وہ مساوی طور پر زکوٰۃ کا حصہ نکالیں۔ زکوٰۃ کی مد میں بوڑھا اور نہ یک چشم جانور اور نہ ساند لیا جائے الا یہ کہ زکوٰۃ دینے والا آپ چاہے اور چاندی کے سکوں کا نصاب دو سو درہم ہے اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم سے ایک درہم بھی کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں الا یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکوٰۃ میں چار سالہ اونٹ واجب الوصول ہو اور اس کے پاس اس عمر کا اونٹ نہ ہو اور یہ اس کے پاس تین سالہ ہو جو ان اونٹنی تو اس سے دو بکریاں اور تین سالہ جفتی کے لائق جو ان اونٹنی وصول کیا جائے بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب

ومائۃ ﴿ ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔ ﴿ ففی کل اربعین ﴾ تو ان کو چالیس اور پچاس کے دو زمروں میں تقسیم کر لیں گے۔ مثلاً جب مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں اس تعداد کو تین مرتبہ چالیس شمار کیا جائے گا اور ایک کے زائد عدد کا کوئی وزن نہیں۔ تین دفعہ چالیس کی صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی۔ یہ ایک سو تیس تک کی زکوٰۃ ہوگی اور ایک سو تیس کی صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس پر دو بنت لبون، بس اسی طرح دس کے اضافہ کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکوٰۃ ہوگی تاوقتیکہ یہ تعداد ایک سو انیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضاء کلام یہ ہے کہ رسول کو شمار میں نہیں رکھا جاتا اور تمام دہائیوں میں زکوٰۃ ہے (مثلاً دس، بیس، تیس علیٰ ہذا القیاس)۔ (عون المعبود اور سبل الاسلام) الا ان يشاء ربہا الا یہ کہ اونٹوں کا مالک رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکوٰۃ کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ اس پر واجب نہیں ہے۔ ﴿ ففی سائمۃ ﴾ سے مراد زکوٰۃ میں وصول کی جانے والی بکریاں ”سائمۃ“ وہ بکری جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنا ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔ ﴿ الی عشرين ومائۃ شاة شاة ﴾ ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے پہلا ”شاة“ کا لفظ مائۃ کی تیز ہے اور دوسرا شاة مرفوع ہے اور یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ ﴿ ففی صدقۃ الغنم ﴾ ہے اور شاة کے لفظ میں زروادہ، بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاہ کا مترادف ہے یعنی شاة اور غنم دونوں ہم معنی ہیں اور ﴿ فاذا زادت علی عشرين ومائۃ ﴾ جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو اس میں دو بکریاں ہیں اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں ﴿ فاذا زادت علی ثلاث مائۃ ففی کل مائۃ شاة ﴾ اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ تعداد چار سو تک پہنچ جائے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی۔ پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے ”کہ جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے“ جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ فاذا کانت سائمۃ الرجل ﴾ جب آدمی کے جانور جنگل میں چرنے چکنے والے چالیس سے تعداد میں کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکوٰۃ دینا نہیں بنتی۔ ﴿ ناقصۃ ﴾ منصوب ہے۔ کانت کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ﴿ من اربعین شاة واحدة ﴾ دونوں شاة پر فتح ہے اس لئے منصوب ہے پہلی صورت میں عدد سے تمیز واقع ہو رہی ہے اور دوسری صورت میں حرف جر محذوف ہے جسے نزاع الحافض کہتے ہیں یعنی بشاة واحدة یا پھر یہ ناقصہ مفعول ہے۔ مطلب ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے

پاس باہر چرنے چکے والے جانوروں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور جب تعداد ایک سے بھی زیادہ کم ہو پھر تو کسی صورت بھی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿وَلَا يَجْمَعُ﴾ صیغہ مجمول (نہ جمع کیا جائے گا نہ اکٹھا کیا جائے گا) ”ولا یفرق“ ”را“ پر تشدید (صیغہ مجمول) ﴿خَشِيَةَ الصَّدَقَةِ﴾ منسوب، مفعول لہ واقع ہو رہا ہے یعنی زکوٰۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر، زیادہ کا اندیشہ ہو تو مالک کو ہو گا اور کم کا خوف زکوٰۃ وصول کرنے والے کیلئے۔ دونوں فریقین کیلئے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ کی صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب آتی ہے اس طرح مجموعی طور پر تین بکریاں دینا پڑتی ہیں مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو انہوں نے بکریاں جمع کر لیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح ان کو صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں دو سو اور ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ دینا لازمی ہے مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کر لیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ ایسے مال کے مالکوں کو اس طرح حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی یہ صورت ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم نہ شریک ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو بیس یا کم و بیش بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں از خود جمع کرتا ہے اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ تین بکریاں وصول کر لیتا ہے اور جدا اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملک میں ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کر لیتا ہے۔ بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ﴿خَشِيَةَ الصَّدَقَةِ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا تعداد کی قلت کے نقطہ نظر سے دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ﴾ خلیطین کا معنی شریک ہیں اور اس میں ”من“ موصول کے بیان کیلئے ہے ”والخلطه“ اور شرکت یہ ہے کہ چرواہا، چراگاہ، نر اور پانی پلانا ایک طرح کا ہے۔ فانہما یسرا جعان بینہما بالسویۃ سویۃ میں ”یا“ پر تشدید ہے معنی مساوات برابری کی سطح پر اور ”تراجع“ کا معنی یہ ہے کہ جب زکوٰۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعہ پر واجب زکوٰۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کر لیتا ہے حالانکہ اس کے ذمہ تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔ تو اب زکوٰۃ وصول کرنے والا دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کر دے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بالسویۃ یہی ہے۔ ہی برابری مراد ہے۔ ﴿لایخرج﴾ صیغہ مجہول نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿ہرمۃ﴾ فتح اور کسرہ۔ ”ہا“ پر فتح ”را“ کے نیچے کسرہ۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ ﴿ولا ذات عوار﴾ عوار کے عین پر فتح اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ عیب کے معنی میں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے عین پر فتح کی صورت میں اس کا معنی عیب ہوگا اور ضمہ کی صورت میں کانا ہوگا اور بہتری یہ ہے کہ اسے فتح سے ہی پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ ﴿ولا تیس﴾ ”تا“ پر فتح ”یا“ ساکن۔ ساند بکرا جو بکریوں پر جفتی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ ﴿الان یشاء المصد﴾ مصدق کے صادر پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ پہلے کا اصل متصدق یعنی زکوٰۃ و صدقہ دینے والا۔ یعنی مال کا مالک۔ اس میں استثناء فقط لفظ تمیں کی طرف راجع ہے۔ یعنی ساند بکرا کا لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا صا مخفف ہے۔ جس کا معنی صدقہ لینے والا، اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا اور استثناء تینوں کی طرف راجع ہے یعنی بوڑھی گھونسٹ۔ عیب والی اور ساند بکرے (بوک) کی طرف الّا یہ کہ زکوٰۃ لینے والا اس کے لینے میں مصلحت سے زیادہ موافقت محسوس کرے اور مساکین کیلئے زیادہ اچھا سمجھے۔ ﴿وفی الرقۃ﴾ اور چاندی میں زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہے۔ رقۃ کے ”را“ کے نیچے کسرہ۔ دراصل یہ ورق سے ہے۔ ورق ”واو“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ۔ چاندی کو کہتے ہیں ﴿ربع العشر﴾ ربع کے راء اور عشر کے عین پر ضمہ ہے اور ”با“ اور شین ساکن ہیں یا دونوں پر ضمہ ”ربع“ کسی چیز کا چوتھا حصہ اور ”عشر“ دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا اور دو سو درہم باون تولہ اور چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں یعنی سات سو پینتیس گرام اور درہم تین ماشے ایک رتی کا اور پانچ رتی بڑے رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿فان لم تکن﴾ اور اگر چاندی ﴿الا تسعین ومائۃ﴾ ایک سو نوے درہم ہو یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ سو پورا ہونے سے پہلے آخری گنتی نوے ہی ہے اور حساب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب احاد سے اکائی تجاوز کر جائیں تو دہائیوں سے گنتی کی جاتی ہے۔ جیسے دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ (فانہا تقبل منه الحقۃ) جذع کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ ﴿ویجعل﴾ مالک ساتھ شامل کرے گا۔ ﴿معہا شاتین﴾ دو بکریاں نقصان و کمی کی تلافی کرنے کیلئے کیونکہ حقہ جذع سے چھوٹا ہوتا ہے ﴿ان استیسیرتالہ﴾ بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں ﴿او عشرین درہما﴾ او یہاں تحیر کیلئے ہے یعنی اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہے تو یہ دے دے، چاہے وہ دے دے۔ ﴿ویعطیہ المصدق﴾ دال پر تشدید۔ زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے والا سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مال و مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب مذکور ہے نیز اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا طریق کار۔ زکوٰۃ میں وصول کئے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام

مذکور ہے۔ نہ تو مالک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی سرکاری اہل کار کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہر قسم کے موسیئوں پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چٹنے والوں پر ہے۔

(۴۸۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَيَّحَا اَنْ كُوْهُم دِيَا كِه وَه تَمِيں گَايُوں پَر اِيك سَالِه بَعَثَهُ اِلَى الْيَمَنَ، فَأَمَرَهُ اَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثَيْنِ بَقْرَةً تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ دِينَارًا، أَوْ عَدْلَهُ مَعَاوَرِيًا. رَوَاهُ الْحَنَسِيُّ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيِّ، وَأَشَارَ إِلَى اخْتِلَافٍ فِيهِ وَضَحَّهُ ابْنُ تَرْمِذٍ فِي اَسَے حَسَن قَرَار دِيَا هے اور اس كے موصول هُونے كے بارے ميں اِخْتِلَاف كَا اِشَارَه كِيَا هے اِبْن حَبَان اور حَاكِم دُونُوں نے اسے صَحِّح كَمَا هے۔

لغوی تشریح: ﴿من كل ثلاثين بقرة﴾ یہ نصاب متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تمیں سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زہری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کر کے کہا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور ”بقرة“ اسم جنس ہے اور ”تا“ اس میں ”وحدة“ کی علامت ہے، تانیث کی نہیں۔ یہ مذکور مونث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔ تبعا او تبعة تبعا اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور ”او“ اس میں تخییر کیلئے ہے یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے اور چاہے نہ وصول کرے۔ مسنة اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں یعنی جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ تحفة الاحوذی (ج ۲، ص ۴) میں ہے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر چالیس کی تعداد پر منہ یا مسن ہے ﴿ومن كل حالمة﴾ ہر بالغ سے۔ خواہ احتلام سے دو چار ہوا ہو یا ہنوز نہ ہوا ہو پر ”دینارا“ ایک دینار بطور جزئیہ وصول کیا جائے گا۔ ﴿واوعدله﴾ عین پر فتح۔ دال ساکن ہے مراد ہے اتنی قیمت۔ اس کے برابر مساوی قیمت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح اور کسره دونوں برابر ہیں۔ ﴿معاویریا﴾ وہ چادریں جو یمن کی بنی ہوئی ہیں۔ ”معافر“ بروزن مساجد ہے یہ حمدان کا ایک قبیلہ ہے۔ انہی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گائے کے نصاب کی تفصیل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سے جزئیہ وصول کرنے کا بھی حکم ہے۔ بالاتفاق علماء نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اس کی حلت اور زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو گائے کا

ہے۔

(۴۸۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے
عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تُؤَخِّدُ صَدَقَاتِ الْمُسْلِمِينَ
اللَّهُ عَلَيْهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلَا يَنْبِي ذَاوَدَ: پانی پلانے کی جگہوں پر وصول کی جائے گی۔ (احمد)
دَوْلَا تُؤَخِّدُ صَدَقَاتِهِمْ إِلَّا فِي ذَوْدِهِمْ. اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے
صدقات ان کے گھروں ہی پر حاصل کئے جائیں گے۔

لعنوی تشریح: ﴿علی میاہم﴾ میاہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چشمے ہیں جہاں لوگ اپنے جانوروں
کو پانی پلانے کیلئے لے جاتے ہیں۔ ﴿الافی دورہم﴾ دور، دار کی جمع ہے۔ ان کی اپنی رہائش گاہیں،
جائے رہائش، مکانات، پانی کے گھاٹ، ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ
ہے کہ سرکاری زکوٰۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ کی وصولی کرے۔ ایسا نہیں کہ خود دور
دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آکر زکوٰۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں
کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے لوگوں کے پاس ان کے گھروں،
مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے۔ تاکہ کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہ کیا جاسکے اور وہ اپنی
حاکمیت کی دھونس بھی نہ جاسکے۔ بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جا کر زکوٰۃ وصول کرے۔ جابر
بن عتیک کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری
نمائندے آئیں گے جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو خوش آمدید کہو اور جس چیز کا وہ مطالبہ کریں وہ
ان کے سپرد کر دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو انہیں ثواب ملے گا اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا
وبال انہی پر پڑے گا۔“ اگر یہ زکوٰۃ مقدار وجوب سے زیادہ طلب کریں تو صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں
زیادہ ہرگز نہ دی جائے۔

(۴۸۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ
وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ”غلام میں زکوٰۃ
وَلَيْسَ عَلَى الْعَبْدِ صَدَقَةٌ، إِلَّا صَدَقَةُ فِطْرَتِهِ“ نہیں مگر صدقہ فطر سے۔“

الفطر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔ یعنی جو غلام اپنی خدمت
کیلئے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لئے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اگر برائے تجارت

نہ دیا ﴿فَانَا اخذوها﴾ تو ہم اسے بزور و زبردستی وصول کریں گے۔ ﴿وشطر ماله﴾ کچھ مال یا آدھا مال۔ نہ زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر ﴿اخذوها﴾ میں جو ضمیر مجبور ہے، اس پر اس کا عطف ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کر دے اور بہترین و افضل حصہ خود وصول کر لے۔ ﴿عزمۃ﴾ رفی حالت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں مصدر۔ مطلب ہے کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے ﴿من عزمات ربنا﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ﴿لایحل لال محمد﴾ آل محمد کیلئے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم، بنو عبد المطلب بن عبد مناف مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد بالخصوص آل علی، آل عباس اور آل عقیل اور آل حارث بن عبد المطلب ہیں۔ ﴿اوعلق الشافعی﴾ علق تعلیق سے ماخوذ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قول اس کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس کا دارودار بھڑ بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے والے سے مقدار زکوٰۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام: زکوٰۃ کے ایک مسئلے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ بنو ہاشم، بنو عبد المطلب زکوٰۃ نہیں لے سکتے۔ بنو ہاشم میں اولاد علی، اولاد عباس، اولاد عقیل اور اولاد حارث بن عبد المطلب شامل ہیں۔ یہ بھی زکوٰۃ کا استحقاق نہیں رکھتے۔ امام یوسف کے بقول سید، سید کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بہز بن حکیم﴾ ابو عبد الملک ان کی کنیت ہے۔ بھڑ کی ”با“ پر فتح اور ہا ساکن۔ بھڑ بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ۔ حیدہ کی ”حا“ پر فتح ”یا“ ساکن اور ”وال“ پر فتح، تصغیر ہے۔ بھڑی ہے۔ طبقہ سادہ کے تابعی ہیں۔ اس حدیث سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد کا خیال ہے کہ اس کی احادیث صحیح ہیں۔ ابن مبین، ابن مدینی اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابو حاتم نے کہا ہے، اس سے احتجاج نہیں کیا جاتا اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتے ہیں۔ ۱۲۰ھ کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۶۰ھ کے بعد۔

﴿عن ابیہ﴾ یعنی حکیم بن معاویہ، یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ ﴿عن جدہ﴾ معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب قشیری صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔

(۴۸۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مَائَتَا دِرْهَمٍ، بِرُحْمَةٍ أَوْ بِرُحْمَتَيْنِ، فَزَكَّاهَا زَكَاةً، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا خُمْسُهُ» حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ وحوال علیہا الحول، ففیہا خمسہ ہے۔ جب تک تیرے پاس بیس دینار نہ ہوں اور ان

دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عَشْرُونَ دِينَارًا، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَحِسَابُ ذَلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَمَعْرُ حَسَنٌ، وَقَدْ اخْتَلَفُوا فِي زَنْعِهِ.

پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اس وقت تک تجھ پر کوئی چیز نہیں جب بیس دینار ہوں تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہوگا تو اسی حساب سے زکوٰۃ ہوگی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے) اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو مالی سال کے

وَلِلتَّزْمِيزِيِّ عَنْ ابْنِ عُمَرَ: مَنْ اسْتَفَادَ مَالًا، فَلَا زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. وَالرَّاجِعُ وَفْقُهُ. موقوف ہے۔

دوران حاصل ہو اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں اور رائج بھی ہے کہ یہ روایت

لغوی تشریح: ﴿حال علیہا الحول﴾ یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ ﴿عشرون دینارا﴾ بیس دینار موجود وزن کے مطابق ساڑھے سات تولہ یعنی ۱۰۵ گرام بنتا ہے۔ ﴿فما زاد فبحساب ذلك﴾ اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہوگا خواہ وہ قلیل ہے یا کثیر، اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ﴿من استفاد مالا﴾ جو حاصل ہوا ہو۔ ﴿والراجع وقفہ﴾ رائج بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کیلئے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث میں سونے اور چاندی کی مقدار زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سواتین ماشہ ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے باون تولہ نصاب زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے اور سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے بیس مثقال کے یا نوے ماشہ کے جو ساڑھے سات تولہ بنتا ہے اور ایک حساب اس طرح بھی لگایا گیا ہے کہ درہم سواتین ماشہ کا ہوتا ہے، اس لحاظ سے محتاط اندازے کے مطابق پچاس تولے مقرر کیا گیا ہے اور زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال بیس قیراط کا وزن تین ماشہ ایک رتنی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے تو بیس مثقال سونے کے ساڑھے باٹھ ماشہ بنتے ہیں (یعنی پانچ تولہ اڑھائی ماشہ) اور اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ کلندی نوٹ جو روپیہ کا بدل ہے اس میں بھی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دو طریق سے منقول ہے۔ ایک عاصم بن ضمرہ عن علی اور دوسرا حارث الامور عن علی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں طریق صحیح ہیں۔

(۴۹۰) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ بِلَوْنٍ عَلَى زَكَاةٍ وَاجِبَةٍ. (اسے ابوداؤد اور دارقطنی الْعَوَامِلُ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ نے روایت کیا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔) وَاللَّازِطِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَفَقَهُ أَيْضًا.

لغوی تشریح: ﴿البقر للعوامل﴾ عوامل عاملہ کی جمع ہے۔ عاملہ وہ جانور جو کھیتی باڑی کیلئے جوتے ہیں، گاہنے کا کام لیتے ہیں، کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے کام لیا جائے یعنی آلات و ذرائع کے طور پر استعمال ہوں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(۴۹۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَجَرَّ لَهُ، بَنِيَّ اسْمُهُ، وَفَقَهُ أَيْضًا. رَوَاهُ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ ہی التِّرْمِذِيُّ وَاللَّازِطِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ اسے کھا جائے۔“ (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت مَرَسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ. کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، البتہ امام شافعی کے پاس

ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من ولی﴾ علم، بعلم کے باب سے معروف کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ جو شخص متولی ہے اور لام پر تشدید کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ ﴿فلیتجر﴾ باب افتعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ ”ولا یترکہ“ نہی کا صیغہ ہے یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ ﴿حتی تا کله الصدقة﴾ کہ زکوٰۃ اسے کھا جائے۔ یعنی سال بہ سال اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

(۴۹۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كِي خَدْمَتٍ مِّنْ جِبِّ لَوْكَ زَكَاةً لِّ

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَتَاهُ قَوْمٌ يَصَدَّقُهُمْ قَالَ: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ.
”يا اللہ! ان پر رحم و کرم فرما۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نسائی میں ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کیلئے ان الفاظ میں دعا دی۔ اللھم بارک فیہ وفی اھلہ۔ الہی! اس شخص اور اس کے اہل میں برکت نازل فرما۔“ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کیلئے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔

(۴۹۳) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْعَبَّاسَ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فِي تَعْجِيلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ، فَرَحَّصَ لَهُ فِي ذَلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ آیا زکوٰۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے؟ تو آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ (ترمذی اور مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ان تحل ﴾ مقررہ وقت آنے سے پہلے۔ یحل، حلول سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ سال گزرنے اور وقت مقررہ سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

حاصل کلام: زکوٰۃ فرض تو سال گزرنے کے بعد ہوتی ہے مگر نبی ﷺ نے پیشگی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج ایسی عبادات اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے یہ بھی اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتی۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے حالانکہ یہ استدلال و قیاس کچھ زیادہ وزنی نہیں اس لئے کہ زکوٰۃ کا دیگر عادات کی طرح ٹائم ٹیبل متعین نہیں۔ اسے اگر قدرے تاخیر سے دیا جاسکتا ہے تو پیشگی بھی ادا ہو سکتی جس کی دلیل یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جمہور اہل عالم کی بھی یہی رائے ہے۔

(۴۹۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، قَالَ: «لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ دَوْدَاقٍ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح اونٹوں کی تعداد پانچ سے کم ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم کھجوروں پر بھی زکوٰۃ نہیں۔“ (مسلم)

اور مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

خَمْسَةَ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةً. پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلہ میں زکوٰۃ نہیں۔
 رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ؛ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و
 لَيْسَ فَيَمَّا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِنْ مُسْلِمٍ فِيهِ
 تَمْرٍ وَلَا حَبٍّ صَدَقَةً. وَأَصْلُ حَدِيثِ
 أَبِي سَعِيدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لعوی تشریح: ﴿اواق﴾ اس پر تین ہیں اور قاف کے بعد ”یاء“ مشدودہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے۔ اوقیہ کی جمع ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ اور ”یا“ پر تشدید۔ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانہ کی اصطلاح کے مطابق یہ سات سو پینتیس گرام بنتا ہے۔ ﴿الورق﴾ ”واو“ پر فتح اور ”را“ پر کسرہ اور ”را“ ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی ”فود“ ذال پر فتح اور ”واو“ ساکن۔ اونٹ کے معنی میں۔ یہ اسم جمع ہے اس میں مذکر و مؤنث سبھی شامل ہیں۔ اسی لئے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ ﴿اوسق﴾ ہمزہ پر فتح ”واو“ ساکن اور سین پر ضمہ، وسق کی جمع۔ وسق کی ”واو“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور ایک صاع میں چار مد آتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے۔ پس صاع جدید پیمانہ کی زبان میں اڑھائی کلو گرام کے قریب ہوتا ہے ﴿اوساق﴾ وسق کی جمع ہے، اوسق کی طرح ہے۔ ﴿حب﴾ ”حا“ پر فتح اور ”با“ پر تشدید۔ بیج، تخم مثلاً گندم کا بیج، جو، مسور وغیرہ اور لفظ ﴿دون﴾ چاروں جگہ ﴿اقل﴾ کے معنی میں ہے یعنی کم از کم مراد یہ ہے کہ مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تفاوت و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہو گئے کوئی تفاوت نہ رہا۔ تین سو صاع مجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلہ سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ ہے مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسالت مآب ﷺ نے جب خود وزن مقرر فرمایا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ اپنی جانب سے کم و بیش کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر اس جنس میں جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً گندم، چاول، جو، باجرہ، مکی، ماش، مونگ، پنے وغیرہ۔

(۴۹۵) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت

عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا، أَلْعَشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلَا يُبَيِّنُ دَاوُدُ: أَوْ كَانَ بَعْلًا أَلْعَشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوْ النَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ.

کرتے ہیں، انہوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”جو زمین آسمانی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا رطوبت والی ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے (عشر ہے) اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو۔ اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔“ (بخاری) ابوداؤد کی روایت میں ”بعلا العشر“ کا لفظ ہے ”العشر“ کی جگہ اور اگر جانوروں کے ذریعہ یا ڈول سے پانی نکال کر سیراب کی جاتی ہو اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ﴾ اس سے مراد بارش، اُلے، برف، شبنم وغیرہ ہے اور یہ خبر مقدم ہے۔ ﴿وَالْعُيُونُ﴾ عین کی جمع ہے۔ چشمے کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتا ہے اور بلا کسی مشقت و محنت کے اس کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا﴾ ”عین“ اور ”ثا“ دونوں پر فتح ہے اور ”را“ کے نیچے کسرہ اور ”یا“ پر تشدید۔ زمین میں جو رطوبت ہوتی ہے، اس میں سے خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے کیونکہ پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زمین بغیر سیراب کئے اور پانی چھوڑے پانی حاصل کر لیتی ہے ”العشر“ متداء مؤخر ہے۔ عین پر ضمہ ہے اور شین ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لئے جائیں تو اس کا ایک جزء عشر کہلائے گا۔ ﴿وَفِيمَا سُقِيَ﴾ صیغہ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے ﴿بِالنَّضْحِ﴾ نضح کے نون پر فتح اور ”ضاد“ ساکن ہے۔ اصل میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا بلکہ خوب پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعہ پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح نیل اور گدھے جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ ﴿بَعْلًا﴾ یعنی ﴿عَثَرِيًّا﴾ کے بدلے بعلا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بعل کی ”با“ پر فتح اور عین ساکن۔ وہ زمین جو سیراب کئے بغیر زمین کی نمی و رطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو۔ اس کا معنی بھی قریب قریب وہی ہے جو عثری (نمی والی زمین) کا ہے یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ ﴿بِالسَّوَانِي أَوْ النَّضْحِ﴾ سوانی سانیه کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ سانیه اور نضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر عموماً علماء نے انہیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیه جانوروں کے ذریعہ پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور ”نضح“ عام ہے اس میں سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع و وسائل سے سیراب کرنے کی صورت میں زکوٰۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ مثلاً جو زمین مشقت طلب ذریعہ سے سیراب ہو جیسے اونٹ، نیل

یا آدمی پانی نکال کر یا لاکر سیراب کرتے ہوں تو اس زمین کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے۔ اسی طرح اگر زمین کنوئیں کے پانی، یوب ویل کے پانی سے یا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہو جیسے نہر کا پانی، یوب ویل کا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے آج کل آیات نہ دے کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یہ آیات نہ مشقت و محنت کے قائم مقام ہے لہذا موجودہ نظام کے تحت نہری پانی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار میں بھی بیسواں حصہ ہے۔

(۴۹۶) وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ حَضْرَتِ ابْنِ مَوْسَى الْأَشْعَرِيِّ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ وَمُعَاذِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ دُونوں سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا النَّبِيُّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: لَا تَأْخُذَا فِي كِه "جو، گندم، منقہ (کشش) اور کھجور ان چار الصَّدَقَةِ إِلَّا مِنْ هَذِهِ الْأَصْنَافِ اصناف کے علاوہ کسی غلہ پر زکوٰۃ وصول نہ کی الْأَرْبَعَةِ: الشَّعِيرِ، وَالْحِنْطَةِ، جائے۔ (اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور وَالزَّرْبِيبِ، وَالتَّمْرِ. رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ دار قطنی نے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کھیرا وَالْحَاكِمِ. زکوٰۃ معاف فرمائی ہے۔ مگر اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔

لِغَوَى تَشْرَحُ: ﴿الزَّبِيبِ﴾ خشک انگور (کشش) ﴿القِشَاءِ﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ اور "ما" پر تشدید۔ کھیرا ﴿الْبَطِيخِ﴾ "با" کے نیچے کسرہ "طاء" پر تشدید۔ تربوز ﴿الرَّمَانِ﴾ "را" پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ انار۔ ﴿القِصَبِ﴾ قاف اور صاد دونوں پر فتح۔ گنا۔ یہ حدیث زکوٰۃ کی فرضیت کو غلہ اور پھلوں میں انہی چار اصناف پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو اور جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ حصر اضافی ہے اس مناسبت سے کہ جو اجناس اس دور میں یمن میں دستیاب تھیں اور ان سبزیوں کی مناسبت سے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ پس چاول اور مکئی وغیرہ غلہ قسم کی اجناس جنہیں شہروں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں، میں زکوٰۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

حاصل کلام: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو دار قطنی کے حوالہ سے ہے اس میں ضعف اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ضعیف ہے اور سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التلخیص میں وضاحت بیان کی ہے۔

(۴۹۷) وَعَنْ سَهْلٍ بْنِ أَبِي حَنْمَةَ حَضْرَتِ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَنْمَةَ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا هُمِينَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نِي حَمْدِهِ دِيَا "جُب تَم غَلِه كَا رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ تَحْمِيْنِه اور اندازہ لگاؤ تو اِيك تَمَائِي چھوڑ ديا كرو اكر فَخْذُوا، وَدَعُوا الثَّلْثَ فَإِنْ لَمْ تَدَعُوا تَمَائِي نِيْسِي چھوڑ سكتے تو چوتھائی چھوڑ ديا كرو۔" (ابن الثَّلْثَ، فَدَعُوا الرُّمْعَ). رَوَاهُ الْحَمْسَةُ إِلَّا مَا جِه كِي علاوہ اسے پانچوں نے روايت كيا هے اور ابن حبان ابْنِ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالْحَاكِمُ. اور حاكم نے اسے صحيح قرار ديا هے)

لغوی تشریح: ﴿اِذَا خَرَصْتُمْ﴾ يہ خطاب زکوٰۃ وصول كرنے والے عمال كو هے اور ان كيلئے جو وصول زکوٰۃ كيلئے دوڑ دھوپ اور سعي و جہد كرتے هیں اور "خرص" اندازہ لگانے، تخمينہ كرنے كو كيتے هیں۔ يہاں خرص سے مراد انگور اور تركبجور كا درختوں پر اندازہ هے۔ ان دونوں كا اندازہ كس طرح لگايا جائے۔ اس طرح بيان كيا گيا هے كہ اندازہ لگانے والا مرد درخت كے گرد چكر لگائے۔ جب انگور اور كجبور ميں مٹھاس پيدا ہو جائے تو سارے پھل پر سرسري طور پر نظر دوڑائے پھر اندازہ لگائے كہ جب يہ انگور خشك ہو كر كشمش كي صورت اختيار كر ليس گے تو اس وقت ان كي مقدار اور وزن اتنا ره جائے گا اور يہ كجبور جب خشك هوگي تو اتني مقدار ميں باقِي ره جائے كي۔ اس تخمينہ اور اندازہ لگانے كيلئے ايك هِي آدمي كافي هے بشرطيكہ وه منصف مزاج اور عادل هو ﴿فَخْذُوا﴾ يس تخمينہ كے مطابق تَم زکوٰۃ وصول كر لو۔ "خذا" امر كا صيغہ هے اور اخذ سے ماخوذ هے۔ ﴿ودعوا الثلث الخ﴾ مال كے مالكوں كيلئے تخمينہ لگائي گئي مقدار ميں سے ۳/۱ حصہ چھوڑ دو ايك قول يہ هے كہ يہ ۳/۱ يا ۳/۱ حصہ جو مال كے مالكوں كيلئے چھوڑا جاتا هے وه اس لئے چھوڑا جاتا هے كہ مالك خود اپنے اعمراء و اقرباء اور اپنے همساويں كو اور اندازہ لگانے كے وقت پاس سے گزرنے والوں پر صدقہ و خيرات كر سكه اور مالك سے اس كا تقاضا و مطالبہ اسے كسي تنگي اور حرج ميں مبتلا كئے بغير كچھ محتاجوں اور مساكين كيلئے كيا جائے گا اور ايك قول يہ بهي هے كہ ۳/۱ يا ۳/۱ عشر نكالنے سے پہلے هِي اصل مال سے الگ ركھا جائے گا فراخ دلي كے خيال سے كہ پھلوں كا مالك خود اور اپنے اهل و عيال كو كھلا سكه اور ان كي فروخت اس وقت هوگي جبكہ كجبور رنگ پكڑ كر سرفي مائل هو جائے۔ اهل و عيال، همسائے اور مهمانوں كو فوقيت اور ترجيح دينے كيلئے۔ يہ مقدار جس كے چھوڑنے كا حكم ديا گيا هے، ان سبزيوں كے قائم مقام هے جن پر زکوٰۃ نيس۔ يہ حديث شريعت اسلامي كي خويوں اور محاسن ميں سے هے۔ صاحب سبل السلام نے بتايا كہ امام ابن تيميه رحمہ اللہ كا قول هے كہ يہ تو معمول كي بات هے كہ جب پھل پك جائے تو مال كے مالك كيلئے ناگزير هے كہ وه خود اور اس كے اهل و عيال وه پھل كھائیں اور لوگوں كو اس قدر كھلائیں كہ وه ذخيره كر كے نہ ركھے جا سكيں۔ عرف عام ميں خود كھانے اور دوسروں كو كھلانے كو ان سبزيوں كي جگہ تصور كيا جاتا هے جو ذخيره كر كے ركهي نيس جا سكتیں۔

راوي حديث: ﴿سهل بن ابي حشمه رضی اللہ عنہ﴾ سهل كے سين پر فتحہ اور "هء" ساكن هے۔ ان كا نام عبد اللہ يا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاري خزرجي مدني هے۔ صغار صحابہؓ ميں شمار هوتا هے۔ ۳ھ ميں پيدا

ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ ہی میں وفات پائی۔

(۴۹۸) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أُسَيْدٍ حَضْرَتِ عَتَّابِ بْنِ أُسَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُخْرَصَ الْعِنَبُ، اس طرح لگائیں جس طرح کجوروں کا اندازہ لگایا کَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، وَتُؤْخَذُ زَكَاةُ جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ میں کشش وصول کی زَيْبًا. رَوَاهُ الْحَمَّسِيُّ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ. (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں

انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں انقطاع ہے اس لئے کہ اسے سعید بن مسیب، عتاب بن اسید سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب کا عتاب سے سماع ہی ثابت نہیں۔ مگر امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ﴾ عتاب میں عین پر فتح اور ”تا“ پر تشدید۔ بن اسید۔ اسید کے معنی پر فتح اور سین کے نیچے کسرہ۔ بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی کی۔ مشہور صحابی ہیں۔ جب نبی ﷺ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو ان کو مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(۴۹۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حَضْرَتِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امْرَأَةً أَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَهَا ابْنَتُهُ لَهَا، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: «أَنْعِطَيْنِ زَكَاةَ هَذَا؟» قَالَتْ: لَا، قَالَ: «أَيْسُرُكَ أَنْ يُسَوِّدَكَ اللَّهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَوَارِيزَ مِنْ نَارٍ؟» فَالْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَاسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ. اس خاتون نے اس سے فرمایا ”کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟“ اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا ”کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے؟“ یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے

۳۴-۳۵) ”یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے.....“ ﴿اِذَا دِيتْ زَكَاتُهُ﴾ اس سے زیور میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ جب مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا زیور ہو گا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اوضاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا واضح کی جمع ہے، وضع کہتے ہیں روشن اور چمک دکھ کر۔ دراصل تو یہ زیور چاندی سے تیار ہوتا تھا۔ اس ظاہری چمک دکھ اور سفیدی کی وجہ سے اسے اوضاح کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ زیور سونے کا بھی تیار کیا جانے لگا۔ اس حدیث سے بھی سونے چاندی سے ساختہ زیورات پر زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ چاندی کے زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے دیکھے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ”اے عائشہ! تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا ”اچھا تو پھر جہنم کی آگ میں سے تمہارے لئے یہی کافی ہیں۔“ حاکم نے اس کی سند کو شیخین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔

(۵۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حَضْرَتِ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ ثَوْبًا نَعُدُّهُ لِلْبَيْعِ. رَوَاهُ (۱) ابوداؤد نے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ لَيْثٌ.

لغوی تشریح: ﴿نَعْدَهُ﴾ ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کیلئے حاضر کرتے تھے۔ ﴿نَعْدَهُ﴾ میں نون پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ اعداد سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ ﴿وَاسْنَادُهُ لَيْثٌ﴾ ابوداؤد نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ پھر منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (عون المعبود، ج ۲ ص ۳)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مجاہد نے اس کی فرضیت پر قرآن مجید کی آیت ﴿انْفِقُوا مِنْ طِبَابَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ سے استدلال کیا ہے اور ابن منذر نے اس کی فرضیت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ فقہاء سبعہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ ظاہریہ اس کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن سرہ مجہول ہے۔ لیکن متقدمین کا اتفاق اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مؤید ہیں۔

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے قبلِ جگہ میں واقع کانوں سے
 ﷺ أَخَذَ مِنَ الْمَعَادِنِ الْقَبِيلِيَّةِ زَكَاةَ وَصُولِ كِي- (ابوداؤد)
 الصَّدَقَةَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿معادن﴾ ”معدن“ کی جمع ہے۔ ”معدن“ میں دال کے نیچے کسرہ ہے۔ کان، زیرِ زمین
 اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سونا، چاندی اور جواہرات وغیرہ اللہ تعالیٰ نے بکثرت پیدا فرمائے ہوں۔ ﴿
 القبلیۃ﴾ ”قاف“ پر فتح اور ”با“ پر بھی ”قبل“ کی طرف نسبت ہے۔ ”فرع“ کے نواح میں ایک جگہ
 کا نام ہے اور ”فرع“ میں ”قا“ پر ضمہ ہے اور ”را“ ساکن ہے اور ایک قراءت کے مطابق دونوں پر ضمہ
 بھی ہے۔ مدینہ کے بلالی حصہ میں ساحلِ سمندر پر واقع زمین جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ سے آٹھ برد
 (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلہ پر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس
 میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان میں
 خنس نہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دینہ) دونوں ایک نہیں ہیں۔ لغوی اعتبار سے، حکماً نہ شرعاً۔
 راوی حدیث: ﴿بلال بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ بلال بن حارث مزنیہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے مزنی
 کہلائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ھ میں نمائندہ کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ میں سکونت
 اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انہوں نے مزنیہ قبیلہ کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی
 عمر میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

صدقہ فطر کا بیان

۱ - بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

(۵۵۵) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكْرِ وَالْأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ، مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ولابنِ عديٍّ وَالذَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: أَغْنَوْهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هَذَا الْيَوْمِ.

ابن عدی اور دارقطنی میں ضعیف سند سے ہے کہ
 اس روز غریاء کو در بدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔

لغوی تشریح: ﴿باب صدقة الفطر﴾ رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ قسطلانی کے بقول فطرانہ کی فرضیت رمضان المبارک کے آغاز سے صرف دو روز پہلے ۲ھ میں ہوئی۔ ﴿فرض﴾ بمعنی واجب اور لازم۔ یعنی اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقہ فطر (فطرانہ) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض قدر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ ﴿من المسلمین﴾ کافروں میں سے نہ ہو۔ اس لئے کافر غلام کا صدقہ فطر نہیں نکالا جاتا۔ ﴿اغنہم﴾ اغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر منصوب فقراء کی طرف راجع ہے یعنی ”ہم“ ضمیر سے مراد محتاج و ضرورت مند لوگ ہیں۔ ﴿عن الطواف﴾ دست سوال دراز کرنے کیلئے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں سے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ دن کے پہلے حصہ میں ادا کر دیا جائے تاکہ ضرورت مند لوگ اپنی ضروریات کا سامان خرید سکیں اور بے فکر ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے سب افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرہ کے ضرورت مند حضرات اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ اس فطرانہ کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں۔ البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمہ ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ فطر کیلئے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ نے تو فطرانہ کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(۵۰۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعًا مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ زَبِيبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعًا مِنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيدٍ: أَمَّا أَنَا فَلَا أَزَالُ أَخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أَخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. وَلَا بِنِي دَاوُدَ: «لَا أَخْرِجُ أَبَدًا إِلَّا صَاعًا».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانہ میں گندم سے ایک صاع اور کھجور سے ایک صاع اور جو سے ایک صاع اور کشمش (منقہ) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نکالا کرتا تھا اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿طہرۃ﴾ ”طا“ پر ضم۔ منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے۔ معنی روزہ دار کے نفس کی طہارت کیلئے۔ ﴿من اللغو﴾ لغو کا تعلق زبان و قول سے ہے، دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ﴿والرفث﴾ فحش کلامی۔ ﴿طعمۃ﴾ ”طا“ پر ضم۔ مراد کھانا اور اس کا عطف طہرۃ کے لفظ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ فطر بھی انہی کا مخصوص استحقاق ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقہ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے۔ من اداھا قبل الصلاۃ قبل صلاۃ سے مراد ہے نماز عید سے پہلے ﴿صدقۃ من الصدقات﴾ یعنی پھر یہ عام صدقہ ہوگا۔ صدقہ فطر نہیں ہوگا، اور آدمی فریضہ کا تارک ہی رہے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہئے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہوگا، فطرانہ عید نہیں ہوگا۔

۲ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ نفلی صدقے کا بیان

(۵۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «سَبْعَةُ يَظْلُهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ» - فَذَكَرَ الْحَدِيثَ - وَفِيهِ: «وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ بِيَمِينِهِ» - مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایسے روز میں سایہ عطا کرے کہ گاجس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔“ پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ ”ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے جو ایسے طریقہ سے مخفی طور پر صدقہ دے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہونے پائے کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿سبعة﴾ سات اقسام و انواع کے لوگ۔ ﴿یظلمہم﴾ باب افعال سے ماخوذ ہے۔ یعنی ان کو سایہ میں جگہ دے گا۔ ﴿فی ظلمہ﴾ اپنے سائے میں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی حمایت و حفاظت میں لے لے گا۔ ﴿یوم لا ظل﴾ جس روز کوئی سایہ نہ ہوگا اس سے مراد قیامت کا دن ہے ﴿فذکر الحدیث﴾ پھر حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان ساتوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں۔ (۱) امام عادل۔ (۲) وہ نوجوان جس کی نشوونما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ (۳) وہ آدمی جس کا قلب مسجد سے معلق ہو۔ (۴) ایسے دو آدمی جن کی باہمی

محبت اللہ کیلئے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطر اور اگر جدا جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کیلئے ہو۔ (۵) وہ آدمی جسے حسب و نسب والی حسین و جمیل نوجوان عورت دعوت برائی دے اور وہ یہ کہہ کر کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں، اس کی دعوت کو ٹھکرا دے۔ (۶) وہ آدمی جو تنہائی اور کج عزت میں ذکر الہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ (۷) اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ ﴿حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ﴾ بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ آرائی ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ و گمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اس روز عرش الہی کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ عرش کیا ہے۔ اس کی صحیح کیفیت و نوعیت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

اس حدیث میں مرد کی قید اتفاق ہے ورنہ انہی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب ملے گا۔ نیز اس حدیث سے صدقہ و خیرات مخفی طریقہ سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں رغبت و شوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی حیثیت کی حامل ہو اور ریا بھی مطلوب نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۵۰۹) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ عَنْهُمَا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ أَصَدَقَتِهِ حَتَّى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ. (ابن حبان اور متدرک حاکم)

رَوَاهُ ابْنُ جِبَّانَ وَالتَّحَاكُمُ.

حاصل کلام: اس حدیث میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی و تمازت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہوگی۔ سایہ کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ سایہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سایہ میں کھڑا سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوگا یا دوسرا معنی یہ کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ صدقات نفلیہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکوٰۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(۵۱۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ أَصَدَقَتِهِ حَتَّى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ. (ابن حبان اور متدرک حاکم)

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”جو مسلمان اپنے برہنہ بھائی قَالَ: أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز ریشی عَلَى غُرَيْدٍ كَسَاهُ اللَّهُ مِنْ خَضِرٍ کپڑے پہنائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی بھوکے الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللَّهُ مِنْ ثَمَارِ کے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے پیاسے الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِمًا مسلمان بھائی کو پانی (یا مشروب) پلائے گا اللہ تعالیٰ عَلَى ظَمِئٍ سَقَاهُ اللَّهُ مِنَ الرَّحِيقِ اسے جنت کی مہربند پاکیزہ شراب پلائے گا۔“ (اسے الْمُخْتَوَمُ)۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ لِيْنٌ۔ ابو داؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿کسا﴾ کے معنی ہیں کسی کو لباس پہنانا۔ ﴿علی عری﴾ ﴿عری﴾ کے عین پر ضمہ اور ”را“ ساکن یہ مصدر واقع ہو رہا ہے۔ یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہیں۔ من خضر الجنة - خضر کے ”خا“ پر ضمہ اور ضاد ساکن یہ اخضر کی جمع ہے۔ یعنی جنت کا سبز لباس۔ ﴿علی جوع﴾ بھوکے کو۔ ﴿جانعا﴾ بھوکا، خالی پیٹ۔ ﴿علی ظما﴾ شدید پیاس کی حالت میں۔ ”ظا“ اور ”یم“ دونوں پر فتح یعنی پیاسا۔ ﴿الرحیق﴾ خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ ﴿المختوم﴾ مہربند جسے مرگا کر منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جس کو کستوری کی مرگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے عمل کا آخرت میں جو بدلہ عنایت فرمائے گا وہ اس کی جنس سے ہوگا۔ البتہ جنت کا لباس دنیا کے لباس سے عمدہ، بہترین، خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔ بدلہ اسے ملے گا جس کا عمل شرف قبولیت سے مشرف ہوگا۔ قبولیت عمل کیلئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشروع و منہون ہو غیر مشروع نہ ہو اور دوسرا اس سے مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول ہو۔ شہرت و ریا کاری اور دکھاوا مطمع نظر نہ ہو۔

حدیث میں پیاسے، ننگے اور بھوکے کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ بچے کئے نوجوان توانا کو اور مالدار اور پیشہ ور گداگر کو نہ دیا جائے۔ حقیقی ضرورت مند و حاجت مند کو دیا جائے۔ اس سے غرباء کی امداد پر جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی بشارت ملتی ہے۔ مہربند شراب پیش کرنے سے عز و شرف بھی حاصل ہوگا اور شراب میں کسی قسم کی آمیزش بھی نہ ہوگی۔ اس حدیث میں کمزوری جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ اس کی سند میں ابو خالد یزید بن عبدالرحمن مختلف فیہ راوی ہے۔

(۵۱۱) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا ”اوپر والا ہاتھ نیچے قَالَ: أَلَيْدُ الْعُلْبَا خَيْرٌ مِنَ الْبِدِ والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ آغاز و ابتداء ان سے کر

السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعْمَلُ، وَخَيْرُ جَنِّهِ تَوَكُّفَاتٍ اور عیال داری کرتا ہے اور بہتر صدقہ الصَّدَقَةُ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرٍ غَنَى، وَمَنْ يَسْتَعْفِفُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفُ اللَّهُ، يُعْفِهِ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفُ اللَّهُ، يُعْفِهِ اللَّهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ.

اللہ تعالیٰ اسے بچالے گا اور جو استغناء کا مظاہرہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مستغنی (بے پروا) کر دے گا۔“ (بخاری و مسلم، متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لعوی تشریح: ﴿اليد العليا﴾ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا ہاتھ ہے۔ ﴿اليد السفلى﴾ نیچے والے ہاتھ سے مراد ہے لینے والا، سوال کرنے والا۔ ﴿ابدا﴾ شروع کر، ابتداء و آغاز کر یعنی دو اور خرچ کرو۔ ﴿بمن تعمل﴾ جن کا نان و نفقہ تیرے ذمہ ہو۔ ﴿ماکان عن ظہر غنی﴾ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور لفظ ظہر محض کلام میں وسعت کیلئے استعمال کیا ہے۔ ﴿ومن يستعفف﴾ جو سوال کرنے، مانگنے سے بچتا چاہے۔ ﴿يعفه الله﴾ باب افعال سے اعف یعف سے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نیچے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ ﴿ومن يستغن﴾ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خواہ کم مقدار میں ہو یا کثیر، اسی پر قناعت کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند و محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھروالوں پر صرف کرے یا جمادنی سبیل اللہ میں خرچ کرے یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔ اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو از خود مانگنے سے بچتا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔

(۵۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: يَأْتِيكُمْ مِنْكُمْ مَنْ يَسْأَلُكُمْ فِي مَالِكُمْ، فَمَا تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جُهْدُ الْمُقِلِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعْمَلُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کم مال والے کا صدقہ اور صدقہ کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو از خود مانگنے سے بچتا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور

وَالْحَاكِمُ. حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿جهد المقل﴾ الحمد کے ”جہم“ پر ضمہ اور ”ہا“ ساکن۔ ہمت، طاقت اور اگر فتح پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے میم پر ضمہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ قلیل مال والا آدمی ہے معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس دوسری حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبر و برداشت کر سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے غنی سے نفس و ضمیر کا استغناء مراد ہے اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ امیر و مالدار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں۔ اس لئے اپنے گھروالوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہے۔

(۵۱۳) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَصَدَّقُوا»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! عِنْدِي دِينَارٌ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ وَالْحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدقہ و خیرات کرو۔“ ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔ ”آپؐ نے فرمایا ”اسے تو اپنی ذات پر خرچ کر۔“ وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔“ اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔“ اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر۔“ وہ بولا حضور ﷺ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ ”آپؐ نے

فرمایا ”اس کے خرچ کرنے کی تجھے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تصدق به علی نفسک﴾ ”تصدق“ انفق کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خرچ کر۔ صدقہ کا لفظ بول کر مراد اتفاق لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقدار کیلئے خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ ﴿انت ابصر﴾ یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کونا زیادہ مستحق ہے؟ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر پھر اولاد پر پھر بیوی پر پھر خادم پر جو کچھ بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھے، آئندہ کسی کام آئے گا۔ لہذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تاکہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(۵۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِرِزْقِهَا أَجْرُهُ بِمَا اُكْتَسَبَ، وَلِلْخَازَنِ مِثْلُ ذَلِكَ، لَا يَنْقُصُ بِنَفْسِهِمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب عورت اپنے گھر کے مال سے فضول خرچی کئے بغیر خرچ کرے تو اسے خرچ کرنے کے بدلے میں اجر و ثواب ملے گا اور اس کے شوہر کیلئے کمانے کا ثواب اور اسی طرح خزانچی کیلئے بھی اجر ہے ہر ایک کا ثواب دوسرے کے ثواب میں سے کچھ بِنَفْسِهِمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ بھی کم نہیں کرے گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿غیر مفسدہ﴾ یعنی فضول خرچی، اسراف و تبذیر بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت۔ شوہر کی جانب سے بیوی کو صریح طور پر اجازت ملنے پر محمول کیا جائے گا یا کسی اشارہ وغیرہ پر۔ جیسا کہ معاشرہ میں یہ چیز معروف و معلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مواخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

حاصل کلام: عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ و خیرات نہیں کرنا چاہئے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کیلئے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ معمولی

ہونے کی وجہ سے ثقیفہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبد اللہ بن معاویہ یا ابو معاویہ ہے۔ یہ نبیؐ اور اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور حضرت عمرؓ سے بھی۔ ان سے ان کے بیٹے، بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے روایت کیا ہے۔

(۵۱۶) وَعَنْ أَبِي عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جو لوگ گداگری اور ﷺ: «لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، بھیک مانگنے کو پیشہ ہی بنا لیتے ہیں قیامت کے روز حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي اِیسی حالت میں آئیں گے کہ ان کے چہرے پر وَجْهِهِ مُزْعَةٌ لَحْمٍ». مَنَقُولٌ عَلَیْهِ. گوشت نہیں ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مُزْعَةٌ﴾ اور ایک نخ میں ﴿مُزْعَةٌ﴾ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے، اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور ذلیل و خوار اور گری ہوئی توقیر کے ساتھ آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اسے اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چہرے کا گوشت تک اڑ جائے اور جب اٹھایا جائے تو چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی خولہ ڈھانچہ رہ جائے اور اسے اس کی پہچان کی علامت بنا دیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کے پیشہ کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کیلئے جائز ہے۔ ایک وہ شخص جو آفات ناگہانی کی زد میں آجائے اور سارا مال برباد ہو جائے۔ خورد و نوش کیلئے بھی باقی کچھ نہ بچے۔ اسے اپنے گزارہ کی حد تک مانگنے کی اجازت ہے اور ایسے آدمی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی ناحق تادان یا قرض کے گرداب میں پھنس جائے تو وہ مانگ کر اتنی رقم پوری کر سکتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو دیانت داری سے کام کرتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود کام نہ مل سکے یا جائز مصارف و اخراجات سے آمدنی کم ہو اور گھریلو معاشی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور فاقہ کشی کی نوبت کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایسا آدمی بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مانگ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر مستحق لوگ محض پیسہ جمع کرنے کی خاطر مانگتے ہیں ان کا انجام قیامت کے روز وہی ہوگا جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہوا ہے۔

(۵۱۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو آدمی اپنا مال بڑھانے اور زیادہ ﷺ: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ کرنے کی غرض سے لوگوں سے مانگتا ہے تو ایسا آدمی نَكْثَرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا، فَلَيْسَتْفَلَّ اپنے لئے انگاروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انہیں کم کر لے چاہے

مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿كدوح﴾ ”کاف“ اور ”دال“ دونوں پر ضم۔ کدح کی جمع ہے اور کدح کے کاف پر فتح اور دال ساکن ہے۔ خراش، زخم کو کہتے ہیں یعنی اس کے چرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی یا یہ کہ اس کے چرے پر ذلت و رسوائی اور اہانت کے نشانات ہویدا ہو رہے ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کسی سے مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہئے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے سوال اپنے حق کے حصول کیلئے ہے۔ اس میں کسی کے استئذان و احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

۳ - بَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ - اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان

(۵۲۰) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَفَرْتُ ابُو سَعِيدٍ خُدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَحُلْ الصَّدَقَةَ لِعِنَمِي إِلَّا لِحِمْسَةٍ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، أَوْ مُسْكِينٍ» (۱) علاوہ صدقہ حلال نہیں ہے (۱) زکوٰۃ کا مال اکٹھا کرنے کی صورت میں (۲) وہ شخص جو اپنے مال سے صدقہ کی کوئی چیز خریدے (۳) مقروض (۴) فی سبیل اللہ جہاد کرنے والا (۵) مسکین پر جو صدقہ کیا گیا ہو اس میں سے وہ کچھ مالدار کو تحفہ کے طور پر دے۔

لِعِنَمِي». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، (اسے احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَعْلَى بِالْإِسْلَامِ. نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے مرسل ہونے سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لعنمی﴾ غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں اوقیہ کے مساوی چیز ہو یا اتنی کہ صبح و شام اس کیلئے کافی ہو جائے۔ ﴿لِعَامِلٍ عَلَيْهَا﴾ عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقہ کی وصولی کیلئے کام کرتا ہے۔ مثلاً اسے اکٹھا کرنے والا، حساب رکھنے والا، تحریر کرنے والا۔ اس کیلئے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿غارم﴾ مقروض، قرضدار۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باہمی رقابت و دشمنی کی اصلاح کیلئے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے اسے اتارنے کیلئے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کیلئے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرہ میں شامل ہوگا ورنہ اسے غنی شمار کیا جائے گا اس لئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کیلئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں۔ غنی کون ہے؟ اس کی تعریف

میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح و شام کی گزر بسر ہو سکے۔“ اور نسائی میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ”جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ (دس روپیہ) ہو پھر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چمٹ کر سوال کیا۔“

(۵۲۱) وَعَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَدِيٍّ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَدِيٍّ بْنِ الْخَبَّارِ، أَنَّ رَجُلَيْنِ حَدَّثَاهُ: هُنَّ كِي دُو آدَمِيُوں نِي اُنْهِيں اِيْنَا وَاَقْعَه سَنِيَا كِي وَه اُنْهُمَا اَتِيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْأَلَانِيَه دُونُوں رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كِي خِدْمَت ميں حَاضِر هُوئے۔ مِّنَ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيْهِمَا الْبَصَرَ، دُونُوں نِي اُنْهِيں سِي صَدَقَه كَا سَوَال كِيَا۔ اُنْ نِي اِن فَرَاَهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: اِنْ شِئْتُمَا دُونُوں كُو اِيْك نَظَر اُٹْهَا كِر اُوپر سِي نيچي تِك دِيكْهَا تُو اَعْطَيْتُكُمَا، وَلَا حَظَّ فِيْهَا لِيْغْنِيَّ، وَلَا دُونُوں كُو طَاقُوْر پَايَا۔ اُنْ نِي فَرِيَا ”اگر تُم چَهِتِي هُو لِقَوِيٍّ مُّكْتَسِبٍ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ، وَتَوَاهُ اَبُو تُو تَمِيَسِي صَدَقَه دِي دِيْتَا هُوں مَكْرَمَالِدَار اُوْر صَحْت مَنَد كَمَاؤِ اَدَمِي كِي لِيي اِس ميں كُوِيْ حَصَه نِيَسِي۔“ (اسي دَاوُدُ وَالنَّسَائِيَّ).

احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فقلب فيهما البصر﴾ آپؐ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے ان کو دیکھا۔ ﴿جلدين﴾ جیم پر فتم اور لام ساکن اور اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی ﴿لاحظ﴾ کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ ﴿لقوی مكتسب﴾ صيغۂ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا ﴿ان شئتما اعطيكما﴾ یعنی صدقہ صحت مند اور غنی کیلئے لینا ذلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپؐ نے ان سے زجر و توبخ کے طور پر فرمائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کیلئے صدقہ و زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہئے کہ مسائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی تلقین کرے اور اس کو برے انجام سے خبردار کر دے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالله بن عدی بن خیار قرشی نوفلی﴾ خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش عمد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے عمرؓ و عثمانؓ وغیرہ سے روایت کی ہے اور ایک قول کے مطابق ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے۔ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فقہاء و علماء میں ہوتا ہے۔ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور میں وفات پائی۔

(۵۲۲) وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهَلَالِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَجُلُّ إِلَّا لِأَحَدٍ ثَلَاثَةً: رَجُلٌ تَحْمَلُ حِمَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكَ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاَحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشِهِ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُومَ ثَلَاثَةً مِنْ ذَوِي الْحِجَبِ مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشِهِ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ بِأَقْبَصَةِ سُحْتٍ، بِأَكْمَلِهِ صَاحِبُهُ سُحْتًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَانَ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سوال کرنا صرف تین آدمیوں کیلئے حلال ہے“ ایک وہ شخص جو کسی کا بوجھ اٹھالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا قرض وغیرہ ادا ہو جائے پھر وہ سوال کرنے سے باز آجائے اور دوسرا وہ جو کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہو گیا ہو اسے گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور تیسرا وہ شخص جسے فاقے آرہے ہوں اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی اسے فاقہ کشی کا سامنا ہے اسے بھی گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور ان کے علاوہ اے قبیصہ! سوال حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔“ (مسلم، ابوداؤد، ابن خزیمہ، اور صحیح ابن حبان)

لعفی تشریح: ﴿ثلاثة﴾ اس پر تین ہیں ﴿رجل﴾ تلاش سے بدل ہونے کی وجہ سے مجبور ہے یا پھر رفع ہے۔ اس صورت میں ﴿احدهم﴾ محذوف ہوگا۔ ﴿تحمل﴾ برداشت کیا، کفالت کی ”حمالہ“ کا پر فتح ہے۔ وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کر لی ہو اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو وہ دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ ﴿ثم یمسک﴾ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ ﴿جائحه﴾ آسمانی یا زمینی آفت مثلاً ٹالہ باری سے اس کی فصل تباہ ہوگئی، آگ لگنے سے اور ڈوب کر مرنے کی صورت میں تلافی مافات کیلئے ﴿اجتاحت﴾ ہلاک ہوگئی۔ ﴿قواما﴾ قاف کے نیچے کسر۔ قوام جس سے کوئی اپنی حاجت و ضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ ﴿الحجی﴾ ”حا“ کے نیچے کسر یعنی عقل مند ﴿سحت﴾ سین پر ضمہ اور ”حا“ ساکن معنی حرام۔ یسحت البرکۃ کے معنی ہیں جو برکت کو لے اڑے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سوال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرنے کیلئے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل و دانش آدمی اس کی حالت، کمپری اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کو سوال جائز ہے اور ساتلیں کی پوزیشن کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند افراد گواہی دے دیں تو اس کیلئے سوال کرنا جائز ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت و مزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿قبیصہ بن مخارق الہلالیؓ﴾ ابو بشر کنیت ہے۔ قبیصہ میں ”قاف“ پر تھمے اور ”باء“ پر کسرہ ہے۔ اور مخارق میں میم پر ضمہ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ قبیصہ بن مخارق بن عبد اللہ بن شراد العامری الہلالی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے، اور نبی ﷺ کے یاس وفد کے ساتھ آئے اور آپؐ سے احادیث سنیں چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(۵۲۳) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَنْبَغِي لِأَلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاطُ النَّاسِ». وَفِي رَوَايَةٍ: «وَأَنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِأَلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدقہ آل محمد ﷺ کیلئے مناسب ہی نہیں۔ یہ تو لوگوں کے اموال کی میل کچیل ہے“ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”صدقہ محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کیلئے حلال نہیں۔“ (مسلم)

نفعی تشریح: ﴿اوساخ الناس﴾ وح کی جمع ہے۔ میل پکھیل۔ آل محمد (ﷺ) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر کتاب الزکوٰۃ کی ایک ابتدائی حدیث میں گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارثؓ﴾ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم قرشی۔ مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ۶۲ھ میں وہیں پر وفات پائی۔

(۵۲۴) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَسَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمْسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةِ وَاحِدَةٍ، فَقَالَ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے بنو عبدالمطلب کو خیر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا ہے اور ہمیں نظر انداز فرمایا حالانکہ آپ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ سن کر

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلَبِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”بنو عبد المطلب اور بنو وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَاحِدٌ“. زَوَاهُ ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔“ (بخاری) البخاری.

لغوی تشریح: ﴿من خمس خبیر﴾ خمس میں خا اور میم دونوں پر ضم۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کیلئے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ ﴿ونحن وهم﴾ ”ہم“ سے یہاں بنو عبد المطلب مراد ہیں ﴿بمنزلۃ واحدۃ﴾ آپ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبد مناف سے تھا اس طرح دونوں ہاشم بن عبد مناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس، نوفل اور مطلب، ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ ﴿انما بنو عبد المطلب وبنو ہاشم شئی واحد﴾ اس لئے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی مولاۃ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ یہ لوگ قرابت داروں کو حصہ دینے میں شریک ہیں۔ اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں یہ تنبیہ کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ بنو عبد المطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکوٰۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں۔ یعنی دونوں کیلئے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ”ہم اور بنی مطلب برابر ہیں“ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وفاداری اور اطاعت کیشی جیسی بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرمانبرداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں۔ جتنا کچھ استحقاق قرابت انہیں آپ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سے تھے ان کو شرف دامادی بھی حاصل تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم قریش میں بالکل برابر کے قبائل شمار ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ بنو نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب مطلب کی اولاد ہیں۔ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اس طرح حضرت جبیر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تعلق نبی ﷺ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔

نبی ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ قدیم سے بنو ہاشم اور بنو امیہ برابر چلے آرہے ہیں۔ آپ نے اس حیثیت سے تفریق نہیں فرمائی بلکہ اس حیثیت سے فرمائی کہ بنو ہاشم بنو امیہ کی بہ نسبت آپ کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کیلئے زکوٰۃ لینا حرام قرار دے دیا اور بنو امیہ کیلئے

حرام نہیں کیا۔ اس لئے بنو ہاشم کو خمس میں سے دیا گیا اور بنو امیہ کو خمس میں سے نہیں دیا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خمس میں سے نہیں دیا گیا۔

(۵۲۵) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِي مَخْزُومٍ، فَقَالَ لِأَبِي رَافِعٍ: اصْحَبْنِي، فَإِنَّكَ تُصِيبُ مِنْهَا: فَقَالَ: لَا، حَتَّى آتِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَسْأَلُهُ، فَأَتَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَالثَّلَاثَةُ وَابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَانَ.

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تجھے اس میں سے کچھ حصہ مل جائے گا۔ اس نے کہا میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں آیا اور آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ”قوم کا غلام بھی انہیں میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ (زکوٰۃ) حلال نہیں ہے۔“ (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی)

لعوی تشریح: ﴿بعث رجلاً﴾ آپ نے ایک آدمی کو بھیجا اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں ﴿تصیب منها﴾ اس حاصل شدہ صدقہ میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کیلئے خود زکوٰۃ کا لینا حرام ہے اس کے غلام پر بھی حرام ہوتی ہے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی ﷺ کے غلام تھے اس لئے ان کیلئے بھی زکوٰۃ لینا حرام تھا۔

راوی حدیث: ﴿ابو رافع رضی اللہ عنہ﴾ ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ہرمزیا ثابت یا ابراہیم، قطبی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انہوں نے انہیں نبی ﷺ کو بہہ کر دیا تھا۔ غزوہ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابو رافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ۳۶ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(۵۲۶) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ،

حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز عطا فرماتے تو حضرت عمر

فَيَقُولُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ مِنِّي، فَيَقُولُ: مَا هِيَ إِلَّا عَطَا فَرَادَيْتُجْءَ. اس کے جواب میں آپؐ خُذْهُ، فَتَمَوَّلْهُ، أَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا هِيَ إِلَّا عَطَا فَرَادَيْتُجْءَ. وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمَالًا وَخَيْرَاتٍ كَرَدُوْهُ مَالٍ بَغَيْرِ عَمَلٍ وَلَا لُحْظٍ أَوْ مَانِكْنَةٍ كَـ فَلَا تُتْبِعُهُ نَفْسَكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

تمہارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿العطاء﴾ کام کرنے کا معاوضہ اور اجرت یا عطیہ ہو ﴿افقر﴾ افعال التفضیل کا صیغہ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ ﴿فتمولہ﴾ امر کا صیغہ ہے یعنی اسے اپنا مال بنا لو۔ ﴿مشرف﴾ اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص و لالچ ہونا۔ ﴿فلا تتبعہ﴾ اتباع سے امر کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ بل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہئے واپس نہیں کرنی چاہئے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کیلئے ہے یعنی ایسا کرنا مندوب ہے فرض و واجب نہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لینا چاہئے۔ لہذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں ”عطاء“ سے مراد یہی ہے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث میں ہے یہ حضرت عمرؓ کو وصولی زکوٰۃ کی اجرت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا۔ یہ امر مستحب ہے، ایجابی نہیں اور اس سے مراد ہر عطیہ بھی ہے، جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص و طمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔



٥ - كِتَابُ الصَّيَامِ

روزے کے مسائل

(۵۲۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقْدُمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلَا يَوْمَيْنِ، إِلَّا رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْمًا فَلْيَصُومُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو اسے چاہئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔“ (بخاری و مسلم)

نغوی تشریح: ﴿لا تقدموا﴾ یہ اصل میں "لا تقدموا" تھا یعنی رمضان کے استقبال کیلئے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو ﴿کان یصوم صوما﴾ یعنی معمول کے گئے چنے دنوں میں جو وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتہ میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آگیا تو اس طرح روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا ہے۔ ﴿فلیصمه﴾ اس میں لام امر جواز کے بیان کیلئے ہے یعنی معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

(۵۲۸) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا الْقَاسِمِ عليه السلام. ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَغْلِيْفًا، وَوَصَلَهُ الْخَمْسَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ (بخاری نے اسے تعلیقاً اور پانچوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الیوم الذی یشک فیہ﴾ یشک صیغہ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں روز ہے جبکہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

حاصل کلام: شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو اس روز روزہ رکھنا مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء بھی لازماً قابل اعتماد و یقین نہیں۔

(۵۲۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَافْطَرُوا، فَإِنْ غَمَّ عَلَيْكُمْ فَأَقْدَرُوا لَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَيُسَلِّمُ: فَإِنْ أَغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَأَقْدَرُوا لَهُ ثَلَاثِينَ. وَلِلْبُخَارِيِّ: فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ. وَلَهُ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (عید کے لیے) چاند دیکھ لو تو افطار کرو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کیلئے اندازہ لگا لو۔“ (متفق علیہ) مسلم کے الفاظ ہیں کہ ”اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لئے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو اور بخاری کے الفاظ ہیں ”پھر تیس روز کی گنتی و تعداد پوری کرو۔“ اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ”پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اذا رايتموه﴾ جب تم اسے دیکھ لو، اسے مراد چاند ہے یعنی جب چاند تمہیں نظر آجائے۔ ﴿فان غم﴾ غم کے غین پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ صیغہ مجہول۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔ ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے۔ ﴿فاقدرو له﴾ قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فاقدوالہ کے دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ مکمل مہینہ کی گنتی اور تعداد پوری کرو اور تیسویں روز افطار کرو۔

(۵۳۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ، فَأُخْبِرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنا شروع کیا تو میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے)

صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: تراى الناس الهلال لوگ عید کا چاند دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کیلئے خبر واحد یعنی صرف ایک آدمی

کی شہادت مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزہ کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند نظر آجائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرے۔ اگر انیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کئے جائیں اور اسی طرح اگر انیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو روزے تیس پورے کئے جائیں۔ اگر گرد و غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آجائے تو روزہ سارے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رویت قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ جمہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کیلئے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کیلئے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، سب متفق ہیں۔

(۵۳۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَغْرَابِيًّا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الْهَلَالَ، فَقَالَ: أَتَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَا بِلَالُ أَنْ بَصُومُوا غَدًا. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ، وَرَجَّحَ التَّنَائِي إِسْمَاعِيلُ.

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحرا نورد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا ”کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الہ نہیں؟“ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟“ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا بلال اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھا جائے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿فأذن﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کیلئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

(۵۳۲) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے صبح صادق سے

ﷺ قَالَ: «مَنْ لَمْ يَبْتَ الصَّيَامَ قَبْلَ» پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔“
 الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان
 وَمَا لَ التَّرْمِذِيُّ وَالتَّنَائِي إِلَى تَرْجِيحِ وَفَقُوا، اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور
 وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعًا ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جَبَّانَ. ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے) اور
 وَلِلدَّارِ قُطَيْبِي: «لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ» دار قطنی کی روایت میں ہے ”جس نے رات کو اپنے
 يَفْرِضُهُ مِنَ اللَّيْلِ.“ آپ پر واجب نہ کر لیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔“

لغوی تشریح: ﴿من لم يبيت﴾ الخ تبییت سے ماخوذ ہے۔ یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا ﴿لم﴾
 بفرضہ ﴿باب ضرب بضرب سے ہے۔ یعنی اس کو اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس
 نے اس کی نیت نہ کی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے ہونی ضروری ہے
 گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جاسکتی ہے۔ نیت
 اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے
 روزے کیلئے الگ الگ نیت شرط ہے۔ البتہ روزہ کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت
 ہے کیونکہ نیت دل کا عمل ہے، زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام
 رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما﴾ پہلے یہ خنیس بن حذافہ بھی
 کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوہ بدر کے موقع پر یہ وفات پاگئے تو رسول اللہ ﷺ نے
 ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ ۳ھ کی بات ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں
 شعبان ۴۵ھ میں فوت ہوئیں۔

(۵۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ قُلْنَا: لَا، قَالَ: فَإِنِّي إِذَا صَائِمٌ، ثُمَّ أَتَانَا يَوْمًا آخَرَ، فَقُلْنَا: أَهْدَيْ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِنِيهِ فَلَقَدْ أَضْبَحْتُ صَائِمًا، فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ ”کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟“ ہم نے عرض کیا، نہیں۔ تو آپ نے فرمایا ”اچھا تو میں روزہ سے ہوں۔“ اس کے بعد پھر ایک روز تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ حلوہ کا تحفہ ہمیں (کیس سے) دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ”ذرا مجھے تو دکھاؤ صبح سے میں روزے سے تھا۔“ (یہ فرما کر) آپ نے حلوہ

اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کا بھی یہی تقاضا ہے اس لئے شعار اسلام کا اہتمام کرنا اور شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیر و برکت کا باعث ہے۔

حاصل کلام: مطلع صاف ہو، گرد و غبار اور ابر آلودگی نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اور مصائب میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر و دیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے۔ لہذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہئے۔

(۵۳۵) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”سحری کھایا کرو اس لئے رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِيْهِ» کہ اس میں بڑی برکت ہے۔“ (بخاری و مسلم) السَّحُورِ بَرَكَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لعنوی تشریح: ﴿السحور﴾ سین پر فتح کی صورت میں طلوع فجر سے پہلے سحری کھانے کو کچھ کھایا پیا جائے اسے سحر کہتے ہیں اور اس پر اگر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے یہود و نصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔ اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵۳۶) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت الصَّبِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ كَرْتِے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ روزہ افطار کرے تو اسے کھجور سے افطار کرنا چاہئے۔ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ پھر اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ». رَوَاهُ لے اس لئے کہ وہ پاک ہے۔“ (اسے پانچوں نے الْحَمْسَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ جَبَّانَ روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے اسے وَالْحَافِظُ. صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو کھجور سے افطار کرنا چاہئے کیونکہ کھجور مقوی معدہ، مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار بہتر ہے۔ نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ﴾ سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث النضی۔

مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش رکھی تھی۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے ماسوا کوئی بھی ضعی صحابی نہیں۔

(۵۳۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ: فَإِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «وَأَيُّكُمْ مِنِّي؟ إِنِّي أَبِئْتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الْوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْمًا، ثُمَّ يَوْمًا، ثُمَّ رَأَوْا الْهَلَالَ، فَقَالَ: «لَوْ تَأَخَّرَ الْهَلَالَ لَزِدْتُكُمْ»، كَالْمُنْكَلِ لَهُمْ حِينَ أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا، مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ! آپ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ”تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ جب لوگوں نے وصال سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے ساتھ ایک دن پھر دوسرے دن کا وصال کیا۔ پھر انہوں نے چاند کو دیکھ لیا تو آپ نے فرمایا کہ ”اگر چاند آج نظر نہ آتا تو میں تمہارے لئے زیادہ دن وصال کرتا۔“ گویا آپ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الوصال﴾ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے پئے اور نہ سحری کے وقت۔ جمہور علماء اسلام کا قول یہ ہے کہ وصال کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپ کیلئے جائز اور امت کیلئے ناجائز ہے۔ ائمہ ثلاثہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وصال کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری بہر نوع کھانی چاہئے۔ ﴿یطعمنی ربی ویسقینی﴾ میرا رب مجھے کھلاتا ہے، پلاتا ہے۔ جمہور نے اسے مجازاً قوت پر محمول کیا ہے کہ کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ وہ قوت مجھے عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض نے اسے حقیقت پر معمول کرتے ہوئے کھانے پینے سے جنت کا کھانا پینا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے معارف کی ایسی غذا کھلاتے ہیں جس سے آپ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے اور اللہ کی محبت کی نعمت سے آپ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں افزونی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپ کو اللہ کی

جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپؐ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تخصیص از زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۴، ۱۵۵) ﴿کَالْمُكَلَّلِ لَهْمٌ﴾ تنکیل سے ماخوذ اسم فاعل ہے۔ معنی زجر و توبیخ، ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ بھی ان کے ساتھ مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ یہ بیان صرف جواز کیلئے نہیں ہے بلکہ زجر و توبیخ کیلئے ہے اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ پس جب انہوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پئے بغیر روزہ رکھنا انسانی قوتی کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی یا غذا کی قوت مل جاتی تھی اس لئے آپؐ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے نیکی کے جذبہ اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپؐ نے سبق سکھانے کیلئے مسلسل روزے رکھنا شروع کئے تو اتنے میں چاند نظر آگیا تو آپؐ نے زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا کہ ”کرد وصال کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں وصال صوم کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمہیں سبق ملے۔“ البتہ بخاری میں ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”وصال نہ کرو ہاں! اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔“ جس سے امام احمدؓ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری کا کھانا شعائر اسلام سے ہے۔ اس لئے سحری کھانا چاہئے اور رات دن کا وصال آنحضرتؐ کی خصوصیت ہے۔

(۵۳۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالْعَمَلَ بِهِ، وَالْجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». (بخاری اور ابوداؤد۔ اور الفاظ ابوداؤد ضرورت نہیں۔) ”(بخاری اور ابوداؤد۔ اور الفاظ ابوداؤد

کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لم يدع﴾ نہ چھوڑا، ترک نہ کیا۔ ودع سے ماخوذ ہے۔ ﴿الزور﴾ زاپر ضمہ اور ”واو“ ساکن معنی جھوٹ ﴿الجهل﴾ حماقت و بیوقوفی اور سختی ﴿فليس لله حاجة﴾ تو اللہ کو اس کی طرف التفات و توجہ کی حاجت و ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ، غلط بیانی، جہالت و نادانی

کے کام بھی ترک کر دینے چاہئیں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے روزے کی حالت میں ایک روزے دار کا چننا نہایت ضروری ہے۔ روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ، دغا، فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہی مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۵۳۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رُزْءًا فِي حَالَتِهِ مِثْلَ يَوْمِي كَابُوسَةٍ لِي لِيَتَّعِبُ يَقْبَلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلِحِكْمِهِ كَانَ أَمْلَكُكُمْ لِإِزْبِهِ. نسبت اپنی طبیعت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط کرنے مَقْنَعٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «فِي» والے تھے۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ یہ دونوں فعل رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿يَقْبَلُ﴾ تقبیل سے ماخوذ ہے۔ ﴿يُبَاشِرُ﴾ میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا، بغل گیر ہونا۔ ﴿لَارْبِهِ﴾ دونوں پر فتح ہے۔ یعنی حاجت، خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق) اور ایک قراءت کے مطابق مہرہ کے نیچے کسرہ اور راء ساکن۔ اس صورت میں حاجت اور عضو مخصوص کا احتمال ہے۔ اس حدیث سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کیلئے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو اور یہ رعایت ایسے آدمی کیلئے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلہ میں تمام اقوال و آراء میں زیادہ مناسب اور مبنی بر عدل ہے۔

(۵۴۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَضْرَتِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ أَسْتَحْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاسْتَحْتَجَمَ وَهُوَ لُغَوًى. رواه البخاري. صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ چھپنے یا سینگی لگوانے سے نہ احرام میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے اور نہ روزے میں کوئی کمی آتی ہے۔ دونوں حالتوں میں چھپنے لگوانے جائز ہیں۔ البتہ اگر کمزوری واقع ہو جائے اور اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ و خطرہ پیدا ہو تو پھر چھپنے لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اکثر ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ چھپنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۵۴۱) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ حَضْرَتِ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ﷺ بَقِيعٍ فِي يَوْمٍ مِنْ يَوْمِ رَمَضَانَ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ». رَوَاهُ الْخَنَسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ رَوَيْتَ كَمَا هُوَ. أَحْمَدُ، ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حَبَانٍ تَيَوَّنَ فِيهِ. (بجز ترمذی اسے پانچوں نے جیآن۔
اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿افطر الحاجم والمحجوم﴾ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ سیٹگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بظاہر یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ حدیث کے معارض ہے۔ جمہور علماء روزے دار کیلئے سیٹگی لگوانے کے جواز کے قائل ہیں اور اس حدیث کی تاویل میں ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے آپ افطار کیلئے خود کو پیش کر دیا ہے بلکہ قریب بھی پہنچ گئے جسے سیٹگی لگائی گئی وہ تو ضعف و کمزوری کی وجہ سے اور سیٹگی لگانے والا اس لئے کہ اس سے بچنا مشکل ہے کہ جب وہ خون چوس رہا ہو تو کوئی قطرہ خون حلق میں چلا جائے اور روزہ ٹوٹ جائے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ لیکن جہاں تک تاویل مذکور کا تعلق ہے تو حدیث کے الفاظ اس کے اطلاق کا انکار کر رہے ہیں۔ یہی بات رائج ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ سیٹگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ کی یہی رائے ہے مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ انہوں نے اس کی جو تاویل کی ہے وہ گواہی اہمیت نہیں رکھتی مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے نسخ کا احتمال قوی تر ہے۔

راوی حدیث: ﴿شداد بن اوس رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو یعلیٰ ہے۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری مدنی کہلائے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برادر زادہ (بھتیجے) تھے۔ علم و حلم کے مالک تھے۔ ۵۸ھ میں ۷۵ برس کی عمر پر کاشمیر میں وفات پائی۔

(۵۴۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَوَّلُ مَا كُرِهَتْ الْحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، أَنَّ جَعْفَرَ بْنَ أَبِي طَالِبٍ أَخْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: «أَفْطَرَ هَذَانِ. ثُمَّ رَحَّصَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ فِي يَوْمٍ مِنْ يَوْمِ رَمَضَانَ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ». رَوَاهُ الْخَنَسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ رَوَيْتَ كَمَا هُوَ. أَحْمَدُ، ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حَبَانٍ تَيَوَّنَ فِيهِ. (بجز ترمذی اسے پانچوں نے جیآن۔
اسے صحیح قرار دیا ہے)

الْحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، وَكَانَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اور انس رضی اللہ عنہ روزہ کی حالت میں سیکنی لگواتے تھے۔ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ وَقَوَاهُ. (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کو قوی کہا ہے) لغوی تشریح: ﴿بعد﴾ کے دال پر عموماً ضمہ ہے۔ اسے مبنی علی النظم کہتے ہیں۔ نیت میں مضاف الیہ ہونے کے باوجود اسے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے ﴿بعد ذلک﴾ اس میں ”ذلک“ ذہن میں ہوتا ہے مگر اسے حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے بعد پر ضمہ پڑھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ سیکنی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گذشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۵۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَكْتَحَلَ رَمَضَانَ میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (اسے ابن فہر رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ ماجہ نے بیان کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: لَا يَصِحُّ فِيهِ شَيْءٌ. اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں)

حاصل کلام: سرمہ لگانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ اسحق رحمہ اللہ، ابن مبارک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ روزہ دار کیلئے سرمہ لگانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ اس بارے میں گو مرفوعاً احادیث سب ضعیف ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر ان کا موید ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿لاباس باسناده﴾ ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ نے تو کہہ دیا ہے کہ سرمہ ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں ہے کہ ”روزہ اندر جانے والی چیز سے ٹوٹ جاتا ہے) اور سرمہ وغیرہ کا اثر حلق میں اتر جاتا ہے۔ مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ سرمہ وغیرہ کا اثر مساموں کے ذریعہ حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ براہ راست کھانے کی جگہ نہیں جیسے کوئی تمہ پاؤں کے تلوں پر ملے تو اس کی کڑواہٹ منہ میں محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس سے کوئی بھی روزہ ٹوٹ جانے کا قائل نہیں۔ مزید برآں یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں فضل بن الحجاز اور شعبہ مولیٰ ابن عباس دونوں ضعیف ہیں۔ رہی ابوداؤد کی ایک حدیث کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے پرہیز کرے تو اس کے بارے میں خود امام ابوداؤد نے وضاحت کر دی ہے کہ امام یحییٰ بن معین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ (نیل، سبل)

(۵۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرَبَ، فَلَيْتَمَ صَوْمُهُ، فَإِنَّمَا لے تو اسے چاہئے کہ اپنا روزہ پورا کر لے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

أَطْعَمَهُ اللَّهُ، وَسَقَاهُ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ. اور امام حاکم سے یوں روایت ہے کہ ”اگر کوئی وَلِلْحَاكِمِ: مَنْ أَفْطَرَ فِي رَمَضَانَ نَاسِيًا فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلَا كَفَّارَةَ. اور کفارہ نہیں۔“ (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

وَهُوَ صَحِيحٌ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

(۵۴۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنْ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ». اس کو معلول کہا ہے اور امام دارقطنی نے اسے قوی کہا رَوَاهُ التَّحْنُصِيُّ، وَأَعْلَهُ أَخَذُوا، وَقَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. (ہے)

لغوی تشریح: ﴿ذَرَعَهُ الْقَيْءُ﴾ یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے اور ”استسقاء“ کے معنی یہ ہیں کہ جو قصداً اور اراداً خود قے کرے۔

حاصل کلام: امام احمد رضی اللہ عنہ اور امام بخاری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے مگر امام دارقطنی رضی اللہ عنہ، امام ابن حبان رضی اللہ عنہ اور امام حاکم رضی اللہ عنہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہما، زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کا اس روایت کے مطابق یہی قول ہے کہ قصداً قے کرنے سے ہی روزہ ٹوٹا ہے بلکہ امام ابن منذر نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات قے سے روزہ ٹوٹ جانے اور اس کی قضاء کے قائل نہیں مگر یہ قول دلیل کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہے۔

(۵۴۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ، فِي رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الْعَمِيمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَقِيلَ لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أُولَئِكَ الْعُصَاةُ، أُولَئِكَ»۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپؐ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ آپؐ کُرَاعِ الْعَمِيمِ (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ پھر آپؐ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپؐ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”یہی لوگ نافرمان ہیں، یہی لوگ نافرمان ہیں۔“ اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ آپؐ سے کہا

وَفِي لَفْظٍ: «فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ النَّاسَ» گیا کہ بے شک لوگوں کو روزہ نے مشقت میں ڈال
قَدْ شَقَّ عَلَيْهِمُ الصَّيَامُ، وَإِنَّمَا دیا ہے اور اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ وہ
يَنْتَظِرُونَ فِيمَا فَعَلْتَ، فَدَعَا بِقَدْحِ آپ کے عمل کا انتظار کرتے ہیں تو آپ نے عصر
مِّن مَّاءٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَشَرِبَ». رَوَاهُ کے بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا۔
مُسْلِمٌ

لعوی تشریح: ﴿خرج عام الفتح﴾ نبی کریم ﷺ ۸ ہجری ۱۰ رمضان کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے
﴿كرع الغميم﴾ ”کاف“ پر ضمہ اور ”راء“ پر تخفیف اور ”ا“ نعیم“ میں ”غین“ پر فتح اور ”میم“ پر
کسرہ ہے۔ عصفان سے آگے ایک وادی کا نام ہے۔ ﴿دعا بقدح﴾ یعنی پیالہ طلب کیا۔ ﴿فرغه﴾ اٹھ
اس کو ہاتھ پر رکھ کر بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں اور روزہ افطار کر لینے کا انہیں علم ہو جائے۔ ﴿اولسكت
العصاة﴾ ”عصاة“ عاص کی جمع ہے یعنی نافرمان۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی اور روزہ
افطار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ الیامانی نے
سل السلام میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھے
اور اگر چاہے تو روزہ نہ رکھے اور ضرورت پر مسافر روزہ افطار بھی کر سکتا ہے اگرچہ دن کا اکثر حصہ روزہ
سے گزر چکا ہو۔ مولانا صفی الرحمن فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سفر کے دوران
مشقت کی صورت میں روزہ افطار کرنا افضل ہے۔

(۵۴۷) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ
الْأَسْلَمِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا: میں سفر
قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أَجِدُ بَيْنِي رُكْحَةً رُكْحَةً فِي السَّفَرِ، فَهَلْ رُكْحَةً
عَلَيَّ جُنَاحَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «هِيَ رُكْحَةٌ مِّنَ اللَّهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّفِقِ
عَلَيْهِ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو میں یوں ہے کہ حمزہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سوال کیا

راوی حدیث: ﴿حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ﴾ حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت
ابوصالح یا ابو محمد ہے۔ ان سے ان کے فرزند اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔
وہ ۱۱ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

(۵۴۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رُخْصَ بَرِيٍّ عَمْرُوَالِ بُوْزْهِي كُو رُخْصَتِ دِي گئی ہے کہ وہ لِلشَّيْخِ الْكَبِيرِ أَنْ يُفْطَرَ وَيُطْعَمَ عَنْ كُھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ (اسے دار قطنی اور رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَضَحَّاهُ۔ حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿رخص﴾ یہ ”رخصت“ سے ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ ﷺ نے کی ہو۔ ﴿وَيُطْعَمُ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مَسْكِينًا﴾ کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح علاج سے مایوس مریض کا بھی یہی حکم ہے کہ یومیہ ایک مسکین کے کھانے کے برابر صدقہ کرے۔ ایک روایت میں کھانے کا اندازہ آدھا صاع گندم آیا ہے۔ یعنی سوا کلو گندم۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے کھانا تیار کرایا اور تیس مسکینوں کو بلا کر کھلایا۔ امام دار قطنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک ضروری ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور بعض نے کھانا کھلانے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یعنی اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ (سبل، فتح)

(۵۴۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: هَلَكْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَ؟» قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّينَ مَسْكِينًا؟» قَالَ: لَا، ثُمَّ جَلَسَ، فَأَتَى النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيهِ تَمْرٌ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! (ﷺ) میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا ”کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟“ اس نے کہا میں رمضان میں اپنی عورت سے مباشرت کر بیٹھا۔ تو آپ نے فرمایا ”کیا تجھ میں اتنی طاقت ہے کہ ایک گردن کو آزاد کر دے؟“ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟“ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟“ اس نے کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ تو نبی

فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهَذَا»، فَقَالَ: أَعْلَى أَفْقَرَ مِنَّا؟ فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَهْلُ بَيْتِ أَخْوَجَ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «أَذْهَبَ قَاطِعِيهِ أَهْلَكَ». رَوَاهُ الشَّيْخُ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ.

ﷺ کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”ان کو خیرات کر دو۔“ اس نے کہا کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں)؟ کیونکہ دو سنگلاخ پہاڑوں (مدینہ) کے مابین کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ تو نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔“

لِئْسَلِهِ.

(اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿جاء رجل﴾ آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ منخر بیاضی تھا۔ ﴿وقعت علی امراتی﴾ میں اپنی بیوی پر پڑ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے میں نے اس سے وطی کی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ﴿هلکت﴾ میں ہلاک ہو گیا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عدا یہ حرکت کر لی۔ جس سے وہ شخص اس حکم سے خارج ہے جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ ﴿رقبة﴾ سے مراد غلام یا لونڈی ہے اور یہ ﴿ماتعتق﴾ میں ”ما“ کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿فانی﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ ﴿بعرق﴾ سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔ ﴿فیہ تمر﴾ جس میں پندرہ صاع یعنی ساٹھ مہ کھجوریں تھیں۔ یہ اس لئے کہ ہر مسکین کیلئے ایک مہ ہے اور دار قطنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا ہر مسکین کیلئے ایک مہ ہو ﴿اعلیٰ افقر﴾ میں حمزہ استنہام ہے اور ”علی“ حرف جر ہے۔ یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے اہل بیت سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ ﴿فما بین لابتئھا﴾ میں ﴿لابتئھا﴾ لابتہ کا ﴿تثنیة﴾ ہے اور باء پر فتح ہے۔ یعنی وہ سیاہ پتھریلی زمین جسے آگ نے جلایا ہو اور ”ہا“ کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف ہے اور ”لابتان“ سے معروف دو حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غربی جانب ہیں۔ ایک کا نام ”حرۃ الواقم“ اور دوسرے کا ”حرۃ الوبرة“ ہے اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقعہ ہے۔ لہذا ”لابتئھن“ سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔ ﴿انباہ﴾ یہ ”ناب“ کی جمع ہے اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو ”رباعی“ کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور ”رباعی“ ثنایا کے ساتھ والے دانت کو کہتے ہیں اور ”ثنایا“ سے سامنے کے دو دانت مراد ہوتے ہیں اور اس کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں پر ہوتا ہے۔ (اطعمہ اہلک) یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ یہ حدیث اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ فقیر پر کفارہ نہیں یا فقیر کا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہی کافی ہے بلکہ یہ تنگ دستی کی بنا پر کفارہ مؤخر ہونے کی دلیل ہے کہ جب میسر آئے تب کفارہ ادا کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے کہ تنگ دست پر کفارہ نہیں۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال درست نہیں، کفارہ جب میسر ہو بہر نوع ادا کیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کفارہ کا ذکر کیا۔ تنگ دستی کی بنا پر کھجوریں اسے بطور صدقہ کے دیں کفارہ کے طور پر نہیں۔ اس حدیث میں قطعاً ذکر نہیں کہ آپؐ نے اس سے کفارہ کو ساقط قرار دیا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کفارہ کے سقوط کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ نیز اس حدیث میں گو روزہ قضا رکھنے کا حکم نہیں مگر دوسری احادیث میں قضا کا حکم موجود ہے۔ اس بنا پر ائمہ اربعہ اور جمہور علماء ایسی صورت میں مرد و زن دونوں کیلئے روزہ رکھنے کے قائل ہیں۔ الا یہ کہ عورت روزہ دار نہ ہو۔ تو عورت پر قضا نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے اور اس سے ایک ہزار فوائد و مسائل کا استنباط کیا ہے۔

(۵۵۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصْبِحُ جُنُبًا مِنْ جِمَاعٍ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ «وَلَا يَغْتَسِلُ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جماع سے جنبی ہوتے تو صبح ہونے پر آپ غسل کرتے اور روزہ رکھتے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ زائد کیا کہ قضا نہیں دیتے تھے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنبی آدمی پر غسل سے پہلے صبح ہو جائے تو روزہ درست ہے۔ جسور اسی کے قائل ہیں بلکہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معارض مسند امام احمد وغیرہ میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کسی پر حالت جنابت میں صبح ہو جائے تو روزہ نہ رکھے، اس کے بارے میں جسور نے کہا ہے کہ وہ منسوخ ہے اور خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنے کے قائل تھے، نے جب یہ حدیث سنی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (سبل وغیرہ)

(۵۵۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزہ لازم ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

نفی تشریح: ﴿وعلیه صیام﴾ یعنی اس کے ذمہ روزہ لازم و واجب ہو کیونکہ ”علی“ کا لفظ وجوب کیلئے ہے۔ ﴿صام عنہ ولیہ﴾ اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہئے اور روزہ میں نیابت جائز ہے اور جن حضرات نے

کہا ہے کہ روزہ میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ رائج یہی ہے کہ روزہ میں نیابت ہے۔

حاصل کلام: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھانا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ میں نیابت بھی جائز ہے اور یہی بات رائج ہے۔ نیز حج کی طرح لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے کوئی اور دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل)

۱ - بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ، نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ

وَمَا نَهَى عَنْ صَوْمِهِ رُكْنَا مَنَعَ كَيْفَا هِيَ كَابِيَان

(۵۵۲) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ آلَاثْنِينَ، فَقَالَ: «ذَلِكَ يَوْمٌ وَلَدْتُ فِيهِ، وَبِعِثْتُ فِيهِ، وَأَنْزَلَ عَلَيَّ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرفہ (و ذوالحجہ) کے دن روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ”یہ (روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔“ اور آپ سے عاشورہ کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ”یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔“ اور آپ سے سوموار کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ”اس دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔“

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یوم عرفہ﴾ عرفہ کا دن، ذی الحجہ کا نوں دن ہوتا ہے اور جو میدان عرفات میں نہ ہو اس کیلئے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کیلئے روزہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ﴿یکفر﴾ یہ تکفیر سے ہے یعنی اس کی برکت سے پہلے اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور ان گناہوں سے صغیرہ

گناہ مراد ہیں کبیرہ نہیں کیونکہ وہ توبہ کے بغیر مغف نہیں ہوتے، یا یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرمادیں۔ ”یوم عاشوراء“ عاشورہ کا دن محرم الحرام کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ یہود اس دن روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی، البتہ فرمایا کہ ”یہود کی مخالفت میں ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو“ اور سوموار کے روز، روزہ رکھنے کے بارے میں آپؐ نے جو فرمایا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو۔ بطور تشکر و تقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور سوموار کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش کئے جائیں۔“

(۵۵۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ حَضْرَتِ ابُو أَيُّوبِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ رَزَعَهُ رَمَضَانَ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے اُتبعہ سِتّا مِنْ شَوّال، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ“ رکھے یہ عمل سارے سال (روزے رکھنے) کی مانند ہوگا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ثم اتبعه﴾ یعنی رمضان کے بعد روزہ رکھے۔ ﴿ستامن شوال﴾ چھ شوال کے۔ خواہ یہ شوال کے آغاز میں رکھے یا درمیان میں یا آخر میں اور خواہ متواتر رکھے یا متفرق ﴿کان کصیام الدھر﴾ گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔ یہ اس لئے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور چھ شوال کے دو ماہ کے برابر۔

(۵۵۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ رَزَعَهُ رَمَضَانَ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص ایسا نہیں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ رَزَعَهُ رَمَضَانَ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ“ کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو۔ بطور تشکر و تقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور سوموار کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش کئے جائیں۔“

خریفاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ترجمہ: بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی سبیل اللہ﴾ اللہ کی راہ میں، جب مطلقاً یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے۔ یعنی جہاد کے دوران جو ایک دن روزہ رکھتا ہے اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آجائے اور جہاد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ ”خریفاً“ سے مراد ایک سال ہے۔

(۵۵۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَصُومُ حَتَّى نَقُولَ لَا يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتَّى نَقُولَ لَا يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلَّا رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِي شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپؐ کبھی افطار نہیں کریں گے اور آپؐ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے تھے (اسی طرح) آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے کبھی سوائے رمضان کے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں اور میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپؐ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم و بیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مشاغل کی بنا پر کئی کئی دن روزہ نہ رکھتے۔ البتہ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے آپؐ شعبان میں رکھتے تھے۔

(۵۵۶) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، ثَلَاثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم ہر ماہ تین دن کے روزے رکھیں یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ (تاریخ کو)۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

(۵۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَرَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلَّا بِإِذْنِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِبُخَارِيٍّ، زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «غَيْرَ رَمَضَانَ».

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی عورت کیلئے حلال نہیں کہ وہ روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو۔ الا یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔“ (بخاری و مسلم) یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور ابو داؤد نے ”سوائے رمضان“ کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزہ سے مقدم ہے۔ نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے۔ البتہ فرضی روزہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ فرض کی ادائیگی بہر نوع مقدم ہے۔

(۵۵۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

فرمایا۔ عید الفطر کا دن اور قربانی کا دن۔ (بخاری و مسلم)

(۵۵۹) وَعَنْ نُبَيْشَةَ الْهَذَلِيِّ حَضْرَت نبیۃ الہذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامٌ أَكَلُ وَشُرِبَ وَذَكَرَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَكَلُ وَشُرِبَ وَذَكَرَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿ایام التشریق﴾ تشریق کے دن یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کے دن کے بعد۔ مزید تین دن ہیں۔ ﴿ایام اکل وشرب﴾ کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں روزہ رکھنا حرام ہے۔ راوی حدیث: ﴿نبیۃ الہذلی﴾ تغیر کے ساتھ، ان کے والد کا نام و نسب یوں ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عتب الہذلی۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انہیں ”نبیۃ الخیر“ کہا جاتا تھا۔

(۵۶۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ حَضْرَت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ أَنْ اجَازَتْ نَحْنُ سِوَايَ هَذِهِ الشَّخْصِ كَيْ يَصُومَ إِلَّا لِمَنْ لَمْ يَجِدِ الْهَدْيَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے ہدیہ ملا ہو۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لم یرخص﴾ یہ صیغہ مجہول ہے کہ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہؓ اور ابن عمرؓ) نے سورہ بقرہ کی اس آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو۔ فمن لم يجد... کہ جو ہدی نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے۔ ﴿ان یصمن﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ ﴿الامن یجد الہدی﴾ سوائے اس شخص کے جو ہدی نہ پائے۔ ”ہدی“ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص حج تمتع یا قرآن کرنے والا ہو یا محرم ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کیلئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں کیونکہ یہ حدیث حقیق طود پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں مرفوع روایات میں ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔ حاصل کلام: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی متعدد احادیث میں ممانعت آئی ہے اور اس بارے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ بعض اہل علم مطلقاً ان دنوں روزہ رکھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہے مگر یہ حقیقتاً مرفوع نہیں۔ احتمال ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کے ظاہری سیاق سے یہی سمجھا ہو کہ ”ایام حج“ سے مراد یہی ایام تشریق ہیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ یوم النحر سے پہلے اور ایام تشریق کے بعد کے دن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سنن دارقطنی وغیرہ میں جو یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی نہ رکھنے والے متمتع کو روزہ کی رخصت دی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی یحییٰ بن سلام قوی نہیں۔ اس لئے رائج یہی ہے کہ ایام تشریق میں بہر نوع روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(۵۶۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا تَخْصُوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلَا تَخْصُوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ، مَخْضٍ كَرَوْهُ سِوَاكَ اس كَ كَ جَعَدَ كَادَنَ اِيَسَ دَن اِلَّا اَن يَكُوْنَ فِي صَوْمِهِ يَصُومُهُ فِي صَوْمِهِ» (مسلم) أَحَدُكُمُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”دوسری راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کرنے کیلئے مخصوص نہ کرو اور نہ ہی دوسرے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص کرو سوائے اس کے کہ جمعہ کا دن ایسے دن میں آجائے جس دن روزہ رکھتا ہو۔“ (مسلم)

لفظی تشریح: ﴿لَا تَخْصُوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ﴾ یعنی اکیلا جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص نہ کرو۔ اس لئے کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے بھی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم جمعہ کا روزہ چھوڑتے تھے۔ مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ریب جمعہ کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعہ میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کا دن روزہ اس سے ایک روز پہلے یا بعد روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کی بعد کی حدیث میں آ رہا ہے۔

(۵۶۲) وَعَنْهُ أَيْضاً قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا أَنْ يَصُومَ يَوْمًا قَبْلَهُ، أَوْ يَوْمًا بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

(۵۶۳) وَعَنْهُ أَيْضاً أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا أَنْ يَصُومَ يَوْمًا قَبْلَهُ، أَوْ يَوْمًا بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا رَوْاهُ الْحَمْسَةُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَحْمَدُ. اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب شعبان آدھا ہو جائے تو روزہ نہ رکھو۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: یہ ممانعت اس لئے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو جائے اور رمضان المبارک کے روزہ میں قوت بحال رہے۔ یہ نئی تزییہ ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبد الرحمن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ نیز اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عاداتاً رکھے جاتے ہیں مثلاً جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں روزہ رکھنا جائز ہے۔ (فتح الباری وغیرہ)

(۵۶۴) وَعَنْ الصَّمَاءِ بِنْتِ بُسْرِ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ
اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَصُومُوا يَوْمَ
السَّبْتِ إِلَّا فِيمَا افْتَرَضَ عَلَيْكُمْ،
فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلَّا لِحَاءَ
عِنَبٍ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ،
فَلْيُمِضْهَا». رَوَاهُ الْحَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ،
إِلَّا أَنَّهُ مُضْطَرَبٌ، وَقَدْ أَنْكَرَهُ مَالِكٌ، وَقَالَ أَبُو
دَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ.

نفعی تشریح: ﴿لحاء عنب﴾ کے لام پر فتح اور کسرہ دونوں طرح پر ہے اور آخر میں مد ہے۔ جس کے معنی ہیں چھلکا اور ”العنب“ کی عین کے نیچے زیر اور نون پر فتح ہے۔ مشہور پھل یعنی انگور کو ”عنب“ کہتے ہیں۔ ﴿فلیصغھا﴾ یہ باب فاعل اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی اسے کھالے اور اس سے روزہ افطار کر لے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”ہفتہ کے روز روزہ کی یہ ممانعت اس لئے ہے کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔“ اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿الصماء بنت بسر بن عبيد﴾ صادر زیر اور میم مشدد ان کا نام بہیہ تھا اور بھیہ کی باء پر پیش ”حاء“ مفتوح اور باء مشدد اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بھیہمہ میم کے اضافہ کے ساتھ تھا۔ ”بسر“ کی باء پر پیش اور ر ساکن قبیلہ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبد اللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(۵۶۵) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَكْثَرَ يَصُومُ مِنَ الْيَوْمِ، يَوْمَ السَّبْتِ، وَيَوْمَ الْأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أَخَالِفَهُمْ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهَذَا لَفْظُهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ”یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔“ (اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں)

حاصل کلام: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناخبری حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لئے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے۔ کیونکہ یہود ہفتہ کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں۔

(۵۶۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ. غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ الْمُغَلَّبِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر اس لئے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مہدی بن حرب الحجری سے روایت کی ہے اور حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثین نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ بھی تقریب التحذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ البتہ مہدی الحجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی تائید کی ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”مقبول“ کہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی، ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ ”یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے“ یعنی اہل عرفہ کیلئے یہ دن عید کا ہے۔ اس لئے انہیں اس روز روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم

عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(۵۶۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس نے ہمیشہ روزہ رکھا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا صَامَ مَنْ صَامَ» اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا۔“ (بخاری و مسلم) اور الْأَبَدُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِإِسْلِيمَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ مُسْلِمٌ میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں کہ ”نہ روزہ يَلْفِظُ: «لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ»۔ رکھانہ افطار کیا۔“

لغوی تشریح: ﴿لَا صَامَ مَنْ صَامَ﴾ میں ”الابد“ ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ﴿لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ﴾ یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور ”نہ افطار کیا“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

۲ - بَابُ الْاِعْتِكَافِ وَ قِيَامِ رَمَضَانَ

رَمَضَانَ

(۵۶۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا سَ مِنْ غُفْرٍ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. کر دیئے جاتے ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بَابُ الْاِعْتِكَافِ﴾ کے لغوی معنی روکنے اور بند کرنے کے ہیں اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا اور ”قیام رمضان“ سے مراد رات کو نماز پڑھنا یا قرآن پاک کی تلاوت کرنا ہے اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ ﴿إِيمَانًا﴾ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب پر یقین رکھتے ہوئے اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص کی نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریاء و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ ﴿اِحْتِسَابًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے جو قیام کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کتنے بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین و تر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپ

نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (ابن حبان) اس لئے سنت نبوی ﷺ تو بہر نوع گیارہ رکعت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(۵۶۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دھاکہ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ، - أَيِ الْعَشْرِ رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ الْأَخِيرَةُ مِنْ رَمَضَانَ، - شَدَّ مِئْزَرَهُ، (بخاری و مسلم) وَأَخْبَا لَيْلَهُ، وَأَيَقُظُ أَهْلَهُ مُتَّقِينَ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿شد میزہ﴾ میز کی میم کے نیچے زیر، میزہ ساکن ہے۔ یعنی اپنی چادر باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپ عبادت کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے اس کیلئے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات سے عبادت کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ﴿واحیا لیلہ﴾ یعنی نماز وغیرہ میں شب بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ ﴿وایقظ اہلہ﴾ یعنی اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کیلئے نیند سے اٹھاتے۔

(۵۷۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے أَنْ يَغْتَكِفَ، صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ اور پھر اعتکاف کی جگہ داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم) مُعْتَكِفُهُ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿صلی الفجر﴾ صبح کی نماز پڑھتے، اکیس رمضان کی نماز مراد ہے۔ ﴿ثم دخل معتکفہ﴾ اسم ظرف کا صیغہ ہے یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ نماز فجر کے بعد آپ علیحدگی اختیار کر لیتے، یوں نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کے ابتداء کا ہے بلکہ اعتکاف کیلئے تو آپ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے، جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ حدیث میں وضاحت ہے کہ آپ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(۵۷۱) وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اغْتَكَفَ أَرْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم) ابھی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تا آنکہ آپ وفات پا گئے۔ آپ کی بیویاں آپ کے بعد اعتکاف کرتیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل)

(۵۷۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيَدْخُلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ، - فَأَرْجُلُهُ، (اعتکاف کی حالت میں) مسجد میں ہوتے۔ پس میں وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةٍ، آپ کو کنگھی کرتی اور جب آپ اعتکاف میں إِذَا كَانَ مُعْتَكِفًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ هُوَ تَوَّابٌ سِوَاكَ ضَرُورِي حَاجَاتِ كَافَّةٍ لِّلْبَخَارِيِّ. داخل نہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے

ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان کان﴾ یہ ”ان“ حرف تاکید ہے اور یہ ان ثقیلہ سے خفیہ استعمال ہوا ہے، اصل کلام ”انہ کان“ تھا ﴿لیدخل﴾ ادخال سے ہے یعنی داخل ہوتے ﴿علی﴾ یہ علی حرف جار نہیں بلکہ یاء مشدودہ ہے یعنی میری جانب ﴿فارجلہ﴾ تو میں آپ کو کنگھی کرتی۔ آپ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی، تیل لگاتی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے اور اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ ﴿الاحاجۃ﴾ مگر ضروری حاجت کیلئے۔ اس سے بول و براز، غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ مراد ہے جو مسجد میں نہیں کئے جاسکتے۔

(۵۷۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: السُّنَّةُ عَلَى حَضْرَةِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا مَرِيضًا، وَلَا يَشْهَدُ جَنَازَةً، وَلَا يَمَسُّ امْرَأَةً، وَلَا كَرَىٰ نَجَازَةً فِي شَرِكَةٍ كَرَىٰ، نَهَ عَوْرَتِ كَوَافَتِهِ يُبَاشِرَهَا، وَلَا يَخْرُجُ لِحَاجَةٍ إِلَّا لِمَا لَگَے اور نہ ہی اس سے مباشرت کرے اور سوائے لَا بُدَّ لَهُ مِنْهُ، وَلَا اِغْتِكَافٍ إِلَّا حَاجَاتِ ضَرُورِي كَافَّةٍ لِّلْبَخَارِيِّ بِصَوْمِهِ. وَلَا اِغْتِكَافٍ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ كَافَّةٍ لِّلْبَخَارِيِّ اِبْدَاوُدُ اس كَے جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلَا بَأْسَ بِرَجَالِهِ، إِلَّا رَاوِيوں میں كُوئی خَلل نہیں لیكن راجح یہ ہے كہ اس كَے اَنَّ الرَّاجِحَ وَفَّقَ آخِرِهِ.

آخری الفاظ موقوف ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان لا یعود﴾ یہ عیادت سے ہے یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کیلئے نہ نکلتے۔ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ولا یمس امرأة﴾ یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ﴿ولا یبأشرها﴾ اور نہ اس سے جماع کرتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”لمس“ سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ مراد ہو۔ ﴿ولا اعتکاف الا بصوم﴾

اور روزہ کے بغیر اعتکاف نہ کرتے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے، دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کے ساتھ روزہ مشروط نہیں ہے۔ ﴿مسجد جامع﴾ وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ ﴿الان الرجاء وقف آخرہ﴾ یعنی آخری جملہ ﴿والاعتکاف الا بصوم﴾ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا ہے کہ مرفوع حدیث صرف ﴿لا یخرج لحاجۃ﴾ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے اور یہاں فرمایا ہے آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے عبدالرحمن بن اسحق کے علاوہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ یہ سنت ہے۔

(۵۷۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلَّا أَنْ يَجْمَعَهُ عَلَى نَفْسِهِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ وَفَقَهُ أَضْأً.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الا“ لیس علی المعتکف صیام، یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔“ (اسے رواہ دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کا بھی موقوف ہونا ہی راجح ہے)

حاصل کلام: صحیح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور اس میں سے ﴿لا یخرج لحاجۃ﴾ کا جملہ ہی مرفوع ثابت ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اعتکاف بہر نوع مسجد میں ہونا چاہئے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کیلئے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہئے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ روزہ شرط ہے لیکن کوئی واضح نص اس بارے میں منقول نہیں۔ تاہم رسول اللہ ﷺ سے بلاصوم اعتکاف کرنا ثابت نہیں۔ لیکن اس سے روزہ شرط ہونا لازم نہیں آتا۔

(۵۷۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ، فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَجَرِّبَهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے کچھ مردوں کو آخری ہفتہ میں شب قدر دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں تمہاری خواب کو دیکھتا ہوں جو آخری ہفتہ میں موافق آیا ہے۔ اگر کوئی اس کو تلاش کرنے والا ہو تو وہ آخری ہفتہ میں اسے تلاش کرے۔“ (بخاری و مسلم)

السَّبعِ الْاَوَاخِرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ادوا﴾ اراءۃ سے بنی بر مفعول ہے۔ ﴿فی السبع الاواخر﴾ سے آخری سات دن مراد ہیں جس کی ابتداء تیس کی رات سے ہوتی ہے۔ ﴿اری﴾ کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ ﴿تواطت﴾ کے معنی موافقت کے ہیں۔ ﴿متحریہا﴾ جو اس کا طالب ہو۔ یہ ”التحری“ سے ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہے۔

(۵۷۶) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي حَضْرَةَ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما، نبی کریم ﷺ نے شب قدر کے بارے میں فرمایا ”یہ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ: ستائیس کی رات ہے۔“ (ابوداؤد) اس حدیث کا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعَشْرِينَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد، موقوف ہونا زیادہ رائج ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ) شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے، وَقَدْ اخْتَلَفَ فِي تَعْيِينِهَا عَلَى اس بارے میں چالیس اقوال ہیں۔ جنہیں میں نے فتح اَرْبَعِينَ قَوْلًا، أوردناها فِي فَتْحِ الباری میں نقل کیا ہے۔ الباری.

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفة﴾ یعنی رائج یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نبی ﷺ کا یہ فرمان نہیں۔ البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ ﴿قد اختلف﴾ اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں چالیس قول نقل کئے ہیں مگر ان میں رائج اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس، کبھی تیس، کبھی پچیس، کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو اور جن روایات میں بڑے جزم سے تعین کا ذکر ہے جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تیس کا ذکر ہے تو یہ اس لئے کہ اس سال اسی رات شب قدر تھی یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(۵۷۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيَّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ، مَا أَقُولُ فِيهَا؟ قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ حَضْرَةَ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! (ﷺ) مجھے بتلائیں کہ اگر میں جان لوں، شب قدر کونسی ہے تو اس میں کیا کروں؟ لَيْلَةُ لَيْلَةُ الْقَدْرِ، مَا أَقُولُ فِيهَا؟ آپؐ نے فرمایا ”کہہ“ اے اللہ! بے شک تو ہی قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ درگزر کرنے والا ہے، تو درگزر کرنا پسند کرتا ہے، مجھ

الْعَفْوُ، فَاعْفُ عَنِّي». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ سِوَا ابْنِ أَبِي شَيْبَةَ. (اسے ابوداؤد کے علاوہ پانچوں نے ابی داؤد، وصحاحہ الترمذی والحاکم۔ روایت کیا ہے اور اسے ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارابت﴾ آپ مجھے بتلائیں یہ ﴿اخرنی﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ای لیلہ﴾ مفعول ہونے کے اعتبار سے ﴿ای﴾ پر نصب اور مبتداء ہونے کے ناطے ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہے۔ ﴿عفو﴾ کے عین پر زبر اور واؤ مشدود ہے۔ یعنی بہت درگزر کرنے والا، بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

(۵۷۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوسَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَشْدُوا الرَّحَالَ (کسی کیلئے) کجاوے نہ باندھو۔ (یعنی) مسجد الحرام، میری إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿لا تشدوا الرحال﴾ ”الرحال“ رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے اور کجاوے باندھنا سے کنایہ یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ حصول برکت و فضیلت، سفر مت کرو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ تبرک کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مخص ہے۔ البتہ دوسرے اغراض و مقاصد کیلئے سفر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ با اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف و فضل پر دال ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے، وہاں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مقدور بھر کوشش کی جائے۔



۶۔ کتاب الحج

حج کے مسائل

(۱) بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانُ مَنْ فَرَضَ
عَلَيْهِ

(۵۷۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”عمرو دوسرے عمرے تک دونوں کے مابین گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت بینہما، والحج المبرور لیس لہ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الحج﴾ کی حاء پر فتح اور کسرہ دونوں آتے ہیں، جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا اور لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف باکثرت قصد کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے اور یہ بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ﴿العمرة﴾ لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے کئے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد احرام طواف، سعی، صفا و مروہ، سرمنڈانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہی اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ ﴿الحج المبرور﴾ سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کئے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

(۵۸۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيهِ؛ الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ .

لغوی تشریح: ﴿علی النساء جہاد﴾ کہ کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام مخذوف ہے اور حج و عمرہ پر جہاد کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ﴿واصلہ فی الصحیح﴾ اس کی اصل ﴿الصحیح﴾ میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے اور یہ حدیث عمرہ کے وجوب کی دلیل ہے۔

(۵۸۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَغْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَخْبِرْنِي عَنْ الْمُمْرَةِ، أَوْاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «لَا، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَفَقَهُ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ ضَعِيفٍ. وَعَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعاً: «الْحَجُّ وَالْمُمْرَةُ قَرِيبَتَانِ».

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفہ﴾ رائج بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے انہی سے ایک صحرا نور بدو نے سوال کیا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے بلکہ اس کی سند ضعیف اور ناقابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفہ الاحوذی (ج ۲: ص ۱۱۳) میں دیکھی جاسکتی ہے ﴿من وجہ آخر ضعیف﴾ ایک اور ضعیف سند سے کیونکہ وہ عبد اللہ بن لھیع عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے اور ابن لھیع اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم رحمہ اللہ کی ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید

سے سماع بھی نہیں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ بھی حضرت زیدؓ کا قول ہے مگر سند میں انقطاع ہے۔ (سبل، التلخیص) عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(۵۸۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا السَّبِيلُ؟ قَالَ: «الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِسْنَادُهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ خَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضًا، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! ”سبیل“ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا ”زادے کا خرچ اور سواری۔“ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر راجح اس کا مرسل ہونا ہے اور ترمذی نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں

کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما السبیل﴾ ”سبیل“ کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو وجوب حج کیلئے ”سبیل“ کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۃ ال عمران میں یوں ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (۳: ۹۷) ﴿الزاد والراحله﴾ راحلہ سے مراد سواری، خواہ وہ جانور ہو، موٹر کار ہو، بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز اور الزاد سے واپسی تک اہل و عیال کے خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(۵۸۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْبًا بِالرُّوْحَاءِ، فَقَالَ: «مَنْ الْقَوْمُ؟ قَالُوا: الْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «رَسُولُ اللَّهِ»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ أَمْرَأَةٌ صَبِيًّا، فَقَالَتْ: أَلِهَذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ روحاء مقام پر کچھ سواروں سے ملے تو آپ نے فرمایا تم کون ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا، ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ”اللہ کا رسول ہوں۔“ پھر آپ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور پوچھا کیا اس کا حج ہے؟ آپ نے فرمایا ”ہاں! اس کا ثواب تجھے ملے گا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿رکبا﴾ راہ پر زبر اور کاف ساکن یہ ”راکب“ کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ ﴿بالروحاء﴾ راہ پر فتح آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿فقالوا من انت﴾

تو انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انیس رات کے وقت ملے ہوں اور وہ آپ کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انہوں نے آپ کو نہ دیکھا ہو ﴿ولمکد اجر﴾ اور اجر و ثواب تمہیں ملے گا اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ حج اس سے بلوغت کے بعد کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آئندہ چوتھی حدیث کے تحت آرہا ہے۔

(۵۸۴) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الْفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَجَاءَتْ أَمْرَأَةٌ مِنْ خَنَعَمَ، فَجَعَلَ الْفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الْفَضْلِ إِلَى الشَّقِّ الْآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ فَرِيضَةَ اللَّهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الْحَجِّ أَذْرَكَتْ أَبِي شَيْخًا كَبِيرًا، لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأُحِجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سواری تھے کہ قبیلہ خنعم کی ایک عورت آئی تو فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی اور نبی ﷺ فضل رضی اللہ عنہ کا منہ دوسری جانب پھیرتے تھے۔ پس اس عورت نے کہا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک حج، اللہ کا فرض ہے اس کے بندوں پر۔ میرا باپ بڑی عمر والا بوڑھا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا ”ہاں! اور یہ حجة الوداع کا واقعہ ہے۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿ردیف﴾ ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو ”ردیف“ کہتے ہیں۔ ﴿خنعم﴾ خاء پر زبر اور ثاء ساکن اور عین پر زبر، یمن کے مشہور قبیلہ کا نام ہے اور اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ ﴿الشق﴾ یعنی جانب۔ آپ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کا چہرہ اس لئے پھیر دیا تاکہ شیطان انہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ ﴿حجة الوداع﴾ یہ وہ حج ہے جو نبی کریم ﷺ نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپ وفات پا گئے اور ”الوداع“ کے واؤ پر زبر ہے اس کا مصدر ”ودع توديعا“ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ کے نیچے کسرہ ہے یوں یہ موادعة کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجة الوداع اس لئے رکھا گیا کہ آپ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری جس کے دور

ہو جانے کا امکان ہو، میں نیابت درست نہیں یہ شرط جج فرض کیلئے ہے نفلی جج کیلئے اس میں بلا شرط نیابت جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے اور جج بدل کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کا قریبی ہی نائب بنے۔

راوی حدیث: ﴿فضل بن عباس رضی اللہ عنہ﴾ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابة الکبریٰ بنت الحارث الہلالیہ تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کیلئے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال ۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے یرموک میں شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی۔ ان کے جسم پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر تھی۔

(۵۸۵) وَعَنْهُ أَنَّ أَمْرًا مِنْ جُھینَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكَ دَيْنٌ أَكُنْتُ قَاضِيَتَهُ؟ أَفْضُوا اللَّهَ، فَإِنَّهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»۔
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ قبیلہ جھینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا، بے شک میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کر سکی، اور فوت ہو گئی ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا ”ہاں! اس کی طرف سے حج کر، اگر تیری ماں کے ذمہ ادھار ہوتا تو کیا تو وہ قرض نہ اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿جھینہ﴾ جیم پر پیش، ہا پر زبر۔ یہ تفسیر ہے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے یہ قطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔ ﴿حجی﴾ امر مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ ”دین“ وال پر زبر یعنی قرض اور اسے دین اس لئے کہا گیا تاکہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

(۵۸۶) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الْحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى»۔
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے اور جو غلام حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔“ (اسے ابن ابی شیبہ اور

أَبْنِ شَيْبَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَرَجَالُهُ نَفَاثٌ، إِلَّا أَنَّهُ تَهَيَّيْنَا رَوَايَتَ كَيْفَ هِيَ اسَ كَ رَاوِي ثَقَفَ هِيَ مَكْرَاسَ كَ
اِخْتَلَفَ فِي رَفْعِهِ، وَالْمَحْفُوظُ أَنَّهُ مَوْفُوتٌ. مَرْفُوعَ هُونِ فِي اِخْتِلَافَ كَيْفَ كَيْفَ هِيَ اَوْرَ مَحْفُوظَ يَهْ هِيَ كَهْ كَهْ يَهْ

(حدیث موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿بلغ الحنث﴾ کی حاء کے نیچے کسرہ، نون ساکن، اس کے معنی گناہ کے ہیں۔ یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ اس کے نامہ اعمال میں جرم کی بنا پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بچپن میں کیا ہوا جرم اللہ کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔ بلوغت کی عام علامت احتلام کا ہونا ہے۔ جس سے وہ مرد بن جاتا ہے۔

(۵۸۷) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «لَا يَخْلُونَ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أَمْرًا بِي خَرَجْتُ حَاجَةً، وَإِنِّي اكْتَسَبْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ». مُتَقًى عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ”کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ ہرگز اکیلا نہ ہو مگر اس کے ساتھ محرم ہو اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“ پس ایک آدمی کھڑا ہوا تو اس نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک میری عورت حج کیلئے روانہ ہوئی اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں شامل ہونے کیلئے لکھا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔“ (متفق علیہ)

اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لا یخلون﴾ یہ نون تاکید کے ساتھ ”خلوة“ سے بھی کا صیغہ ہے ﴿ذو محرم﴾ میم اور راء پر زبر اور ان کے مابین حاء ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے۔ جیسے باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ ﴿اکتسبت﴾ باب افعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے۔ فلاں غزوہ کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کیلئے یہ بھی فی الجملہ ”من استطاع الیہ سبیلاً“ کے حکم میں شامل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کیلئے تنائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کو تنہا محرم کے بغیر سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض اولہ کی بنا پر بوڑھی، قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس کے خلاف ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں۔ البتہ

نفل حج ہو تو عورت کو بہر نوع اجازت لے کر جانا چاہئے۔

(۵۸۸) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: لَتَبَيْتُكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ؟» قَالَ: أَخِي، أَوْ قَرِيبِي، قَالَ: «حَبَبَتْ عَنْ نَفْسِكَ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَالرَّاجِحُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَفَقَّهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے سنا، وہ کہہ رہا تھا: ”شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپؐ نے فرمایا ”شبرمہ کون ہے؟“ اس نے کہا میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا ”تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا“ پہلے اپنی طرف سے کر کر پھر شبرمہ کی طرف سے کر لیتا۔“ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا رائج ہے)

لغوی تشریح: ﴿شبرمہ﴾ شین اور راء پر پیش ہے ان کے مابین باء ساکن۔ ﴿او قریب لی﴾ یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کیا یا کہ وہ میرا قریبی ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر کسی نے خود حج نہیں کیا تو وہ دوسرے کی طرف سے نیابت نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کسی کی جانب سے حج کی نیت سے احرام باندھا ہو تو وہ اسی کی جانب سے قرار پائے گا۔ دوسرے کی طرف سے نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے مرفوع ہونے کی نفی کی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ سے اس کی تصحیح بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ ابن حبان رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے مرسل کہا ہے۔ بہر نوع اگر اسے موقوف بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کسی بھی صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ حج بدل میں نائب پہلے خود حج کرے پھر نیابت کرے۔

(۵۸۹) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ»، فَقَامَ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُهَا لَوَجَبَتْ. الْحَجُّ مَرَّةً، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الْحَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو آپؐ نے فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے“ تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کیا ہر سال اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپؐ نے فرمایا ”اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار ہے پس اس سے جو زائد ہے وہ نفل ہے۔“ (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا

ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے اس سے زائد نفل ہے اور اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر یہ نہیں کہتا تا کہ امت پر مشقت نہ پڑ جائے۔ اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر آنحضرت ﷺ بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اسے درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ آنحضرت ﷺ کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول و عقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

راوی حدیث: ﴿اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ﴾ یہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جو وفد بنو تمیم کا آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس میں شامل تھے اور مؤلفہ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

۲ - باب المواقیف (احرام کے میقات کا بیان)

(۵۹۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَفَتْ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحَفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلْمَلَمَ، هُنَّ لَهُنَّ، وَلَمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ ذُوْنَ ذَلِكَ فَمِنْ حَبْثُ أَنْشَأَ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ، شام والوں کیلئے جحفہ، نجد والوں کیلئے قرن منازل اور یمن والوں کیلئے یلملم کو احرام باندھ کر نیت کرنے کی جگہیں مقرر کیا ہے اور یہ میقاتیں ان کیلئے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کیلئے بھی جو دوسرے شہروں سے ان کے پاس سے حج یا عمرہ کے ارادہ سے گزریں اور جو کوئی ان میقاتوں کے ورے (اندرا) ہو وہ جہاں سے چلے وہیں سے (احرام باندھے) یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب المواقیف﴾ یہ میقات کی جمع ہے۔ وہ ہے جو ایک عبادت کے وقت اور جگہ کی حد بنتی کرتا اور متعین کرتا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنہیں شارع علیہ السلام نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ ﴿وقت﴾ یعنی

احرام کیلئے میقات مقرر کیا اور یہ توقیت سے تحدید و تعین کے معنی کیلئے ہے۔ ﴿ذوالحلیفہ﴾ حاء پر ضمہ، تصغیر ہے، جو مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر ہے جو آج کل ”بئر علی“ کے نام سے مشہور ہے۔ ”الجحفہ“ جیم پر پیش اور حاء ساکن، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل (مرحلہ ایک دن کی مسافت کے برابر فاصلے کو کہتے ہیں) پر اور مدینہ طیبہ سے پونے چھ مراحل پر واقع ہے اس کا نام مہیجہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہا لے گیا جس کی بنا پر اسے جحفہ کہا جانے لگا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے۔ اسی لئے آج کل اس سے کچھ پہلے ”راغ“ مقام سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ ﴿قرن المنازل﴾ اسے ﴿قرن الثعالب﴾ بھی کہا گیا ہے یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمکدار پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ہے۔ ﴿یللم﴾ یاء اور دونوں لام پر فتح ہے اور درمیانی میم ساکن، جو مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿هن﴾ یعنی یہ میقات اور مقامات ﴿لھن﴾ ان مذکورہ اہل بلدان کے لئے ہیں۔ ﴿ممن اراد الحج والعمرة﴾ جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو حج اور عمرہ کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ﴿ومن كان دون ذلك﴾ اور جو اس کے ورے ہو یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہو تو وہ احرام باندھے ﴿من حيث انشا﴾ جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی سے ہی احرام باندھے۔ ﴿حتى اهل مكة من مكة﴾ یہاں تک کہ اہل مکہ مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرہ کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں جو حکماً اہل مکہ میں سے ہیں وہ بھی وہیں احرام باندھیں اور آج کل جو عمرہ کے احرام کیلئے میقات سے باہر جا کر احرام باندھنے کا طریقہ چل نکلا ہے، اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۵۹۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتْ اہل عراق کیلئے ذات عرق کو۔ میقات مقرر کیا (اسے لِأَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ۔ رَوَاهُ أَبُو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم داؤد وَالسَّائِفِي، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی جابر، إِلَّا أَنَّ رَوَاهُ شَكٌّ فِي زُفْعُو۔ نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے)

وَفِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔ احمد، ابوداؤد اور ترمذی

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبْنِ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ نبی ﷺ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے مشرق والوں کیلئے عقیق کو میقات مقرر فرمایا

وَقَتَّ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيقَ . تھا۔“

لغوی تشریح: ﴿ذات عرق﴾ عین کے نیچے کسرہ ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور وہ قرن منازل کے شمال میں اس کے برابر واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ ﴿وفی البخاری.....﴾ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق حضرت عمرؓ نے میقات مقرر کیا۔ تو یہ بظاہر حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت کے خلاف ہے اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ ﴿العقیق﴾ یہ ”ذات عرق“ سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”ذات عرق“ کی حدود میں داخل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ہر وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں اور اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ ”ذات عرق“ میقات واجب ہے اور ”عقیق“ میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

حاصل کلام: خوب یاد رہے کہ وادی ”مر الظہران“ جو آج کل وادی فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے، وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب جدہ کے قریب بحر احمر کے مغربی جانب جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو ”قرن المنازل“ کہتے ہیں اور دوسرا شمالی کنارہ ضریہ کے قریب ہے جسے ”ذات عرق“ کہتے ہیں۔ جہاں سے اہل عراق، اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے محاذات ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا جب وہ نبی ﷺ کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو شخص ان پانچوں میقات میں کسی ایک میقات پر سے نہ گزرے تو اسے چاہئے کہ وہ جو نئے میقات کے برابر سے گزرے۔ وہاں احرام باندھ لے۔ حضرت عمرؓ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ سے ہی ذات عرق کو اہل عراق کیلئے مقرر کیا تھا اور تمام علماء اس اصول و ضابطہ پر متفق ہیں۔ محاذات کا مفہوم یہ ہے کہ جو میقات کسی کے دائیں یا بائیں جانب ہو اور وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا۔ لہذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہوگا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے برابر کا خط ہے۔

اس لئے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا اس لئے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور ان کو ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے لہذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تبھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستے پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز جج کرنے کیلئے جاتے ہیں ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات پر سے گزرے ہیں اور نہ ہی کسی میقات کے برابر سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں ہے جبکہ ان کے اور حدود میقات کے مابین تقریباً ایک سو میل کی مسافت ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے منبج کی طرف ذوالحلیفہ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے جا رہا ہو۔ بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات کے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات کے پیچھے ہوگا اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پر جا کر نہ اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

۳ - بَابُ وَجْهِهِ الْإِحْرَامِ وَصِفَتُهُ احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(۵۹۲) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ وَغُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ، وَأَهَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُومِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوا حَتَّى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مَتَّقُوا عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حج اور عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے حج کیلئے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جنہوں نے عمرہ کیلئے لبیک کہا تھا وہ حلال ہو گئے اور جنہوں نے حج کیلئے لبیک کہا یا حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب وجوه الاحرام و صفتہ﴾ الوجوه وجہ کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام

اللہ ﷻ إِلَّا مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . پاس۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الاحرام﴾ احرام کا باب، یہ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔ ”احرام“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ ﴿الامن عند المسجد﴾ مگر صرف مسجد کے پاس۔

حاصل کلام: مسجد سے مسجد ذوالخليفة مراد ہے۔ جس وقت آپؐ اپنی اونٹنی پر سیدھے کھڑے ہوئے تھے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ”بیداء“ کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے تین بار لبیک پکارا تھا۔ جب آپؐ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں۔ یعنی آپؐ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپؐ نے لبیک کہا اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپؐ ”بیداء“ کی چوٹی پر چڑھے تو آپؐ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپؐ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنہوں نے وہاں آپؐ کے احرام کا مشاہدہ کیا انہوں نے اسی کا ذکر کیا اور جب آپؐ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر باوازا بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اب آپؐ نے احرام باندھا ہے۔ پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے یہاں سے احرام باندھا ہے گویا ہر فرقہ نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ اس لئے ان روایات میں کوئی تاقض نہیں۔

(۵۹۴) وَعَنْ خَلَادِ بْنِ السَّائِبِ ، خلاصہ بن سائب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : «أَتَانِي جَبْرِيلُ ، میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہ فَأَمَرَنِي أَنْ أَمُرَ أَصْحَابِي ، أَنْ يَرْفَعُوا ”کو حکم دوں کہ لبیک کہتے ہوئے اپنی آوازوں کو أَصْوَاتُهُمْ بِالْإِهْلَالِ“ . رَوَاهُ الْخَمْسَةُ ، بلند کریں۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جَبَّانَ . اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے لبیک کہنی چاہئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابہ کرامؓ اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علماء کرامؓ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہئے۔ (السل)

راوی حدیث: ﴿خلاد﴾ کی خاء پر زبر اور لام مشدود۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سويد انصاری خزرجی ہیں۔ ثقہ تابعی ہیں جنہوں نے انہیں صحابی کہا انہیں وہم ہوا۔

﴿ابیہ﴾ ان کے والد سائب رحمہ اللہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو سلمہ ہے۔ اور وہ بدر میں شہید

ہوئے۔ غلام عمد معاویہ رضی اللہ عنہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمن کا عامل مقرر کیا اور اہل ۱۷ھ میں فوت ہوئے۔

(۵۹۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ مَرْوَى هِيَ كَ نَبِي اللَّهِ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ كَرِيمٍ ﷺ فِي الْحَرَامِ بَانِدُ هُنَّ كَ وَتِ كَ كَ كَ لَاحِلًا لِهِ، وَاعْتَسَلَ. رَوَاهُ الشَّيْخُ أَبُو حَسَنٍ. (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے)

حاصل کلام: امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے جو اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر امام عقیلی رضی اللہ عنہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اس لئے احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے۔

(۵۹۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سُئِلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «أَنْ يَلْبَسَ الْقَمِيصَ، وَلَا الْعَمَامَةَ، وَلَا السَّرَاوِيلَ، وَلَا الْبُرَانِسَ، وَلَا الْخِفَافَ، إِلَّا أَحَدًا لَا يَجُوزُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ، وَلَا تَلْبَسُوا رَنَاقَ الْخُشْبِ وَارِثِي (لیکن اگر کسی شخص کے پاس جوتے نہیں تو وہ موزے پہن لے اور اسے چاہئے کہ دونوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے اور ایسا کوئی کپڑا نہ پہنے جسے زعفران اور کیسو (ایک زرد رنگ کی خوشبو دار بوٹی) لگا ہوا ہو۔“ (بخاری و مسلم شیناً مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الزَّعْفَرَانُ، اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں) وَلَا الْوَرَسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَالْفُظُّ لِمُسْلِمٍ.

لعنوی تشریح: ﴿العمامہ﴾ یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے اور ﴿السراویل﴾ چادر کی جگہ ٹانگوں میں پہنی جاتی ہے۔ جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ﴿البرانس﴾ یہ برنس کی جمع ہے باء اور نون پر ضمہ اور راء ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ ﴿الخفاف﴾ خاف کے نیچے زیر۔ خف کی جمع ہے یعنی موزے۔ ﴿من الکعبین﴾ کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران ٹخنے ننگے رہیں اور ”کعب“ سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پٹلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ﴿الودس﴾ واؤ پر زبر اور راء ساکن زرد رنگ کی خوشبو دار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لئے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے کیلئے قمیص، پاجامہ، شلوار، ٹوپی اور موزے پہننا درست نہیں۔ جو تا اگر میسر نہ ہو اور صرف موزے ہوں تو انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لینے کا حکم ہے۔ فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ موزے پہننے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ابن عباس رحمہ اللہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن عمر رحمہ اللہ کی حدیث میں موزوں کو کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ ابن عمر رحمہ اللہ کی حدیث ابتداء احرام کے وقت تھی اور ابن عباس رحمہ اللہ کی حدیث میں کاٹنے کا حکم نہیں اور یہ حکم آپؐ نے عرفات میں بیان فرمایا تھا۔ اس لئے کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کاٹنے کا حکم اس حدیث سے واجب نہیں رہا۔ مگر جمہور علماء کاٹنے کے قائل ہیں اور وہ ابن عباس رحمہ اللہ کی مطلق روایت کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ امام ابن قدامہ (صاحب المغنی) نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لیا جائے تاکہ اختلاف سے بچ نکلے۔ اسی طرح شلوار کے بارے میں بھی امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر شوافع اس کو چادر نہ ہونے کی صورت میں مطلقاً پہننے کے قائل ہیں اور ان کا استدلال بھی ابن عباس رحمہ اللہ کی حدیث سے ہے۔ جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اس کے قطعاً قائل نہیں۔ البتہ امام محمد بن حسن شیبانی اور بعض شوافع کا کہنا ہے کہ اگر چادر میسر نہ ہو تو شلوار کو پھاڑ کر چادر نما بنا کر پہننا جائز ہے۔ مگر ان کا یہ قول محض قیاس پر مبنی ہے جس پر کوئی نص نہیں۔ اس لئے شلوار کے بارے میں صحیح موقف امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ ہی کا معلوم ہوتا ہے کہ چادر نہ ہونے کی بنا پر احرام میں شلوار پہننا جائز ہے۔ نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زعفران اور ورس سے رنگا ہوا لباس بھی احرام میں جائز نہیں۔ یہ ممانعت رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشبو کی وجہ سے ہے کیونکہ احرام کے بعد خوشبو لگانا بالاتفاق حرام ہے۔ البتہ اگر اسے دھو کر اس کی خوشبو زائل کر دی جائے تب جائز ہے۔

(۵۹۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَطِيبُ سَاحِلَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِبَيْتِ اللَّهِ كَطَوَافِ كَرِيْمٍ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اطیب﴾ یہ تطیب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے کہ اس میں خوشبو لگاتی تھی۔ ﴿لاحرامہ﴾ یعنی احرام پہننے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کی حالت میں خوشبو لگانا حرام ہے۔ ﴿قبل ان یطوف بالبيت﴾ بیت اللہ کے طواف سے پہلے، اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار، قربانی اور حلق یعنی سرمندوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

(۵۹۸) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فرمایا ”احرام والا نکاح نہ کرے“ قَالَ: «لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلَا أَوْ لَا يَنْكِحُ»۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ﴿لا ینکح المحرم﴾ یعنی خود نکاح نہ کرے ﴿ولا ینکح﴾ یہ پہلے نکاح سے ہے یعنی نہ کسی دوسرے کو نکاح دے۔ ﴿ولا ینکح﴾ یہ خطبہ خاء کی زیر سے ہے یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کیلئے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا یا کسی کو نکاح دینا کسی کو اپنے لئے یا کسی اور کیلئے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۵۹۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کے جنگی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انہوں نے صَنِيدِهِ الْحِمَارَ الْوَحْشِيِّ وَهُوَ غَيْرُ احرام نہیں باندھا تھا، مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مُحْرِم - قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا اور وہ احرام والے تھے لِأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ - : هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ طرف کسی چیز سے اشارہ کیا تھا؟“ انہوں نے کہا بَشِيرٍ؟ قَالُوا: لَا، قَالَ: «فَكُلُوا مَا نَهَيْتُمْ أَنْ تَكُلُوا» آپ نے فرمایا ”پس کھاؤ اس کے گوشت سے بَقِيٍّ مِنْ لَحْمِهِ“۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ جو بچ گیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی قصۃ الحمار الوحشی﴾ جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصہ میں، اس قصہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابو قتادہؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کہیں نکلے تھے مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابو قتادہؓ نے احرام نہیں باندھا تھا مگر ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جب وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظر انداز کر دیا مگر جب ابو قتادہؓ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاشی پکڑاؤ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ابو قتادہؓ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابو قتادہؓ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہو گئے۔ بالآخر جب وہ آنحضرت ﷺ سے جا ملے تو آپؐ نے یہ سارا ماجرا عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی اعانت نہ کی ہو اور نہ ہی

اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو تو محرم بھی اس سے کھا سکتا ہے مگر اس بارے میں مزید تفصیل ہے جو آئندہ حدیث کے تحت آرہی ہے۔

(۶۰۰) وَعَنْ الصَّعْبِ بْنِ جَثَامَةَ عَنْ حَضْرَتِ صَعْبِ بْنِ جَثَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَتْ لَهُ حَتَّى غَدَا بِطُورِ أَهْدَى لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ حِمَارًا تَحْفَهُ بِهِ جَاوِزًا وَأَبْوَاءُ يَأْكُلُونَ مِنْهُ "وَدَان" مَقَامٌ عَلَيْهِ تَوَحُّشِيًّا، وَهُوَ بِالْأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَانَ، أَتَى فِيهِ وَهِيَ أَنْهِيَ وَابَسَ كَرَدِيَا أَوْ فَرَمَا كَرَدِيَا "هَمْ نَفَرَدَهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ» يَهِيَ اس لَئِي وَابَسَ كَرَدِيَا كَرَدِيَا هَمْ اِحْرَامِ وَالِي هِيَ۔" عَلِيكَ إِلَّا أَنَا حُرْمٌ"۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حمارا وحشیاً﴾ یعنی وحشی گدھے کا ایک ٹکڑا۔ کیونکہ صحیح مسلم میں اس کے گوشت اور گوشت کا کچھ حصہ کے الفاظ بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم باب تحریم الصيد للمحرم ﴿بالابواء﴾ الف پر زبر اور باء ساکن ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ایک بستی آباد ہے اور وہ بستی بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال اسی جگہ پر ہوا اس کے اور جحفہ کے مابین بیس یا تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ودان﴾ واؤ پر زبر اور وال مشدوہ ہے۔ یہ ابواء کے قریب جگہ کا نام ہے۔ ﴿حرم﴾ حاء اور راء دونوں پر پیش ہے۔ یعنی ہم محرم ہیں۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت حرام ہے گو اس کی اجازت یا اشارہ وغیرہ سے شکار نہ کیا گیا ہو مگر پہلی حدیث میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ دی گئی ہے کہ شکار جب محرم کیلئے کیا گیا ہو تو اس کا کھانا بھی محرم کیلئے حرام ہے گو اس نے اس کا اشارہ وغیرہ بھی نہ کیا ہو کیونکہ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے کہ جب میں نے آپؐ نے عرض کیا کہ جناب یہ شکار میں نے آپؐ کیلئے کیا ہے تو آپؐ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "حالت احرام میں زمین کا شکار تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لئے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔" جس سے معلوم ہوا کہ شکار جب محرم کے حکم سے یا اس کے اشارہ وغیرہ سے کیا گیا ہو یا شکار محرم کی ضیافت کیلئے کیا گیا ہو تو اس کیلئے اس کا کھانا ناجائز ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿صعب رضی اللہ عنہ﴾ کی صادر پر زبر اور عین ساکن۔ بن ﴿جثامہ﴾ جیم پر زبر اور "ثا" مشدو، اللیثی بیٹ قبیلہ سے تھے۔ ودان اور الابواء میں رہتے تھے۔ خلافت صدیقی میں ان کا انتقال ہوا مگر بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمان تک زندہ رہے۔

(۶۰۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَمِعَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جانوروں میں سے پانچ سب کے سب
 ۞: خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ شَرِيرٌ ہیں۔ حل اور حرم (سب جگہوں پر) مار دیئے
 فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: جائیں اور وہ ہیں بچھو، چیل، کوا، چوہا اور کٹ کھانے
 الْعَقْرَبُ، وَالْحِدَاةُ، وَالْعُرَابُ، وَالْاَكْتَا۔“ (بخاری و مسلم)
 وَالْفَأْرَةُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

لغوی تشریح: ﴿الدواب﴾ باء پر شد ہے اور دابة کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا
 ہے پھر عموماً اس کا استعمال چوپائے جانوروں پر ہونے لگا۔ ﴿فواسق﴾ فاسقہ کی جمع اور ان کا فسق اور
 شران کی خباثت اور کثرت نقصان کی بنا پر ہے۔ ﴿الحداة﴾ حاء کی کسرہ کے ساتھ ”عنبہ“ کے وزن
 پر وہ خمیشت جانور جسے چیل کہتے ہیں۔ ﴿العقرب﴾ یعنی بچھو اور اس میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ ﴿
 والکلب العقور﴾ عین پر زبر ﴿عقر﴾ سے ہے جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں اور اس سے
 مراد ہر چیز نے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے۔ جیسے شیر، چیتا، بھیریا وغیرہ۔

(۶۰۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بے شک نبی ﷺ نے سیگی لگوائی جب کہ آپ
 احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری و مسلم)

(۶۰۳) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ
 إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَالْقَمَلُ يَتَنَازَرُ عَلَى وَجْهِهِ، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أَرَى
 الْوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرَى، أَنْتَجِدُ شَاةً؟» قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَضُمْ ثَلَاثَةَ أَبْطَامٍ، أَوْ أَطْعِمِ سِتَّةَ مَسَاكِينَ، لِكُلِّ
 مَسْكِينٍ نِصْفُ صَاعٍ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔
 حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے
 رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور جو میں
 میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا ”میرا
 یہ خیال نہ تھا کہ تم کو بیماری نے اس حالت کو پہنچا
 دیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تیرے پاس بکری
 ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ: نہیں۔ آپ نے فرمایا
 ”تین دن روزہ رکھ یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع ہر
 مسکین کے حساب سے کھانا دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حملت﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ ﴿القمل﴾ قاف پر زبر اور میم
 ساکن جنہیں جو میں کہتے ہیں۔ ﴿یتناثر﴾ یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں
 اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ انہیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ ”ما کنت اری“ اری کے حمزہ پر پیش
 صیغہ مجہول کی وجہ سے یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ ﴿الوجع﴾ یعنی تکلیف ﴿ما اری﴾ حمزہ پر زبر۔ دیکھنے
 کے معنی میں۔ یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ﴿انتجد شاة﴾ یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپ
 نے انہیں سرمذونے کا حکم دیا اور اس کے کفارہ کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کا روزہ رکھنے

کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ﴾ عجرہ کے عین پر پیش اور جمیم ساکن، یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ ”البلی“ سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۶۰۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَنْتَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلَا يَنْفِرُ صَيْدُهَا، وَلَا يُخْتَلَى شَوْكُهَا، وَلَا يَحِلُّ سَاقِطُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ»، فَقَالَ الْعَبَّاسُ: إِلَّا الْإِذْخَرَ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلَّا الْإِذْخَرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کی فتح دی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی حمد و ثنائیاں کی اور فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی پر حلال نہ تھا مگر میرے لئے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کیلئے حلال نہیں ہو گا یعنی نہ اس کا شکار بھگایا جائے، نہ اس کا کوئی کانٹے دار درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس کی گری ہوئی چیز سوائے شناخت کرنے والے کے کسی پر حلال ہے اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے وہ دو بہتر سوچے ہوئے کاموں میں سے ایک کام میں اختیار رکھتا ہے۔“ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! اذخر (ایک قسم کی گھاس) کے سوا، کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور چھتوں میں رکھتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا ”سوائے اذخر کے“ (یعنی اسے کانٹے کی اجازت ہے۔)“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حبس﴾ یعنی روکا اور منع کیا۔ ﴿الفیل﴾ ہاتھی جسے ابیرہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کیلئے لے کر آیا تھا۔ جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ ”وسلط“ یہ تسلیط سے ہے یعنی غلبہ کے معنی میں ﴿ساعة من نهار﴾ دن کی ایک گھڑی اور اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ ﴿لاینفرد﴾ صیغہ مجہول تنفیر سے ہے یعنی بھگایا نہ جائے ﴿ولا یختلی﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی نہ کاٹا جائے۔ ﴿ساقطہا﴾ یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ ﴿اللمنشد﴾ یہ انشاد

سے ہے یعنی اس کی گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے البتہ اس کو اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے تاکہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ ﴿قتیل﴾ یعنی مقتول۔ ﴿فہو﴾ یعنی مقتول کا ولی۔ ﴿بخیر النظرین﴾ یعنی ولی کو دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے، چاہے تو قصاص لے یا دیت وصول کرے۔ ﴿الا الذخیر﴾ یعنی آپؐ یہ فرمائیں ”الا الذخیر“ ازخ کے سوا کہ اس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ ازخ کے حمزہ اور خاء کے نیچے زیر ہے اور ذال ساکن۔ یہ لہجے بتوں والی خوشبو دار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں بسنے والوں کو قتل کرنا حرام ہے جو اس میں داخل ہو گیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹی کاٹنا حرام ہیں۔ اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کیلئے اٹھانی حرام ہے۔

(۶۰۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بْنِ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ؛ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَنَدَّمَهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لَأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

السلام نے مکہ کو حرمت دی اور اس کے بسنے والوں کیلئے دعا کی اور بے شک میں نے مدینہ کو حرمت دی۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کے صاع اور اس کے مد کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی طرح دعا کی جو مکہ میں بسنے والوں کے متعلق تھی۔“

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حرم مکہ﴾ یہ تحریم سے ہے یعنی اس کو حرم بنایا اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا شکار حرام ہے۔ اس کے درخت کاٹنے حرام ہیں اور وہاں بدعات کا ارتکاب حرام ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی کا مفہوم یہ ہے کہ دعا سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان اللہ حرم مکہ کہ اللہ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے۔

(۶۰۶) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «الْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

لغوی تشریح: ﴿عیر﴾ عین کے نیچے زیر اور یاء ساکن۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

کے جنوب مغرب میں قباء واقع ہے ﴿نور﴾ ثاء پر زبر، واؤ ساکن، یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے ”ما بین عیر واحد“ کہ عیر اور احد کے درمیان یعنی ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ جبل ثور مکہ مکرمہ میں بھی ہے۔ اس میں ہجرت کے موقع پر آپؐ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے ”اذھما فی الغار“ یہاں سے یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے مثلاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ شرفاً غریباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے کہ ”انھا حرام ما بین لابتیھا“ کہ دو حروں کے درمیان جو کچھ ہے حرام ہے اور اس سے مراد ایک ”حرۃ و برۃ“ ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا حرۃ و اقم جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے یوں چاروں سمت حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

۵ - باب صِفَةِ الْحَجِّ وَدُخُولِ حَجِّ كَالطَّرِيقَةِ اور مکہ میں داخل ہونے کا مَنَکَہ

بیان

(۶۰۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الْحُلَيْفَةِ قَوْلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «اغْتَسِلِي، وَاسْتَنْفِرِي بِثَوْبٍ، وَآخِرِمِي»، وَصَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ الْفُصُوءَ، حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى الْبَيْدَاءِ، أَهَلَ بِالتَّوْحِيدِ: «لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ، لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ»، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا الْبَيْتَ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلَاثًا، وَمَشَى أَرْبَعًا، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچہ جنا۔ آپ نے فرمایا ”غسل کر اور کسی کپڑے سے لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔“ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (آپ کی اونٹنی کا نام) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپ بیداء کے برابر آئے تو آپ نے توحیدی تبلیہ پکارا ”حاضر ہوں“ اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بلا شک سب تعریفیں اور انعامات تیرے ہیں۔ بادشاہت بھی تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔“ یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ رکن (اسود) کو آپ نے بوسہ دیا، تین بار رمل کیا اور چار بار معمول کے مطابق چلے۔ پھر آپ مقام ابراہیم پر

الرُّكْنِ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنْ
 الْبَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ
 الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ
 شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ»،
 فَرَقِيَ الصَّفَا حَتَّى رَأَى الْبَيْتَ،
 فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللَّهَ، وَكَبَّرَهُ،
 وَقَالَ: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ، لَا
 شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ،
 وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا إِلَهَ إِلَّا
 اللَّهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ،
 وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ
 ذَلِكَ قَالَ مِثْلَ هَذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ
 نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى الْمَرْوَةِ، حَتَّى
 إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِي بَطْنِ الْوَادِي
 سَعَى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَسَى إِلَى
 الْمَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ
 عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ:
 فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى
 مِنَى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا
 الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ
 وَالْفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيلًا حَتَّى
 طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَّازَ حَتَّى أَتَى
 عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقَبَةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ
 بِمِزَّةٍ، فَتَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ
 الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُجِلَتْ لَهُ،
 فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي، فَخَطَبَ النَّاسَ،
 ثُمَّ أَدَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ،

آئے اور نماز پڑھی پھر رکن (حجر اسود) کی طرف
 واپس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر مسجد حرام کے
 دروازہ سے صفا کی طرف نکلے جب صفا کے نزدیک
 پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ ”تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ
 کی نشانیوں میں سے ہیں۔“ (پھر فرمایا) ”میں شروع
 کرتا ہوں (سعی کو) اس مقام سے کہ جہاں سے اللہ
 نے شروع کیا ہے۔“ پھر صفا پر چڑھے۔ یہاں تک کہ
 آپؐ نے بیت اللہ کو دیکھا۔ پھر قبلہ رخ ہوئے اور
 اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا ”اللہ کے
 سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک
 نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر
 چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے
 اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار
 کی جماعت کو اکیلے اسی نے شکست دی۔“ پھر اس
 کے درمیان تین بار دعا کی۔ پھر صفا سے اترے اور
 مروہ کی طرف گئے۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے
 دونوں پاؤں وادی کے نشیب میں پڑے تو دوڑے
 یہاں تک کہ آپؐ نشیب سے اوپر چڑھے اور مروہ
 کی طرف چلے۔ مروہ پر وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔
 پھر جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ
 ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذی الحج) ہوا تو لوگ منیٰ
 کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار تھے پھر
 وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز پڑھی۔
 پھر تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورج نکل آیا
 تو وہاں سے روانہ ہوئے اور مزدلفہ سے گزرتے
 ہوئے عرفات میں پہنچے تو خیمہ میں اترے جو آپؐ

ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَوْقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقُضَاءِ إِلَى الصَّخْرَاتِ، وَجَعَلَ جَبَلَ الْمُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلاً، حَتَّى إِذَا غَابَ الْقُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَقَّ لِلْقُضَاءِ الزَّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيبُ مَوْرِكَ رَحْلِهِ، وَيَقُولُ بِيَدِهِ الْيُمْنَى: «بَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَسَكِنَّةً، أَلَسَكِنَّةً»، وَكُلَّمَا أَتَى جَبَلًا أَرْخَى لَهَا قَلِيلاً حَتَّى تَضَعَدَ، حَتَّى أَتَى الْمُرْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَشْعَرَ الْحَرَامَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى أَصْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسَّرٍ، فَحَرَكَ قَلِيلاً، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيقَ الْوُسْطَى الَّتِي تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِي

کیلئے نمہ میں لگایا گیا تھا۔ پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپ سوار ہو کر وادی کے درمیان میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا پھر اذان دلوائی پھر اقامت کہلوائی تو نماز ظہر ادا کی پھر اقامت کہلوائی تو عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی۔ پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور راہ چلنے والوں کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلہ کی جانب کر لیا۔ پھر آپ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ سورج غروب ہونے لگا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی حتیٰ کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا پھر آپ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ آپ نے قصواء کی باگ اتنی تنگ کر رکھی تھی کہ اس کا سر آپ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے ”اے لوگو! تسکین و اطمینان اختیار کرو“ اور جب بھی آپ کسی ٹیلے پر آتے تو باگ تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے کہ وہ اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نقلی نماز نہیں پڑھی۔ پھر لپٹ گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر سوار ہو کر مشعر حرام پر آئے۔ پس آپ قبلہ رو ہوئے دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ آپ وہاں اچھی طرح

عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ سَفِيدِي ظَاهِرِ هُونِے تَک ٹھہرے رہے پھر سورج نکلنے حَصَبَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ سے پہلے واپس ہو کر وادی محسر کے نشیب میں آگئے مِّنْهَا، مِثْلَ حَصَى الْحَذَفِ، رَمَى تو سواری کو کچھ تیز کر دیا۔ پھر درمیانی راستہ پر چلے جو مِّنْ بَطْنِ الْوَادِي، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى جَمْرَةِ کَبْرٰی (بڑا شیطان) پر پہنچتا ہے پھر آپؐ اس جمرہ پر الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللَّهِ آئے جو درخت کے پاس ہے تو اسے سات کنکریاں ﷺ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ، فَصَلَّى وادی کے نشیب سے ماریں، ہر کنکری کے ساتھ اللہ بِمَكَّةَ الظُّهْرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُّطَوَّلًا۔ اکبر کہتے تھے، ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیے

کے دانے) کے برابر تھی۔ پھر آپؐ قربان گاہ کی طرف گئے اور وہاں قربانی کی پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اسماء بنت عمیس﴾ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ ﴿واستغفری﴾ یہ ”استغفار“ سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں لگٹ لگٹ کسنا اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز یا (رسی یا ازار وغیرہ) بند باندھ لیتی ہے پھر ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ ﴿واحرمی﴾ احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ ﴿القصواء﴾ قاف پر زیر اور صا ساکن، اس کے اصل معنی تو کان کٹا ہوا، کے ہیں مگر یہاں یہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ ﴿البیداء﴾ دراصل بیابان جگہ جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ اسے ”البیداء“ کہتے ہیں مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ ﴿اہل﴾ اہلال سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ﴿بالتوحید﴾ یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لا شریک کا ذکر کیا جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں شریک کلمات بھی کہتے تھے۔ ﴿لبیک﴾ لبی کا مصدر ہے جب ”لبیک“ کہے کا تو یہ مصدری معنی میں منصوب ہوگا اور اس کا عامل محذوف ہوگا اور مکرر ”لبیک“ سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ یعنی آپ کی اطاعت پر قائم۔ آپ کی اطاعت پر قائم ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا، قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حج کا جواب ہے۔ ﴿ان الحمد﴾ حمزہ کے نیچے زیر ہے جملہ مستأنفہ کی بنا پر مگر تغلیل کی صورت میں اس پر زیر آئے گی۔ ﴿استلم الركن﴾ رکن یعنی حجر اسود

پر ہاتھ رکھا اور اس کا بوسہ لیا۔ ﴿فرمل﴾ یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ ﴿ثلاثاً﴾ یعنی سات میں سے تین چکر یوں دوڑ کر پورے کئے۔ ﴿ومشی اربعاً﴾ اور باقی چار حسب عادت چل کر پورے کئے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں نیز اسے طواف دخول، طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ ﴿مقام ابراہیم﴾ وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خود بخود اوپر ہو جاتا تھا۔ ﴿فصلی﴾ پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکفرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد پڑھی۔ ﴿من الباب﴾ یعنی الصفا کا معروف دروازہ۔ ﴿دنا﴾ قریب ہوئے۔ ﴿شعائر﴾ یہ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی علامت اور یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انہی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ ﴿ابدا بما بدا اللہ﴾ یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور مروہ کا بعد میں ﴿فرقی﴾ بل السلام میں ہے کہ قاف پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی۔ یعنی چڑھے ﴿انجز وعده﴾ یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبہ کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ ﴿نصر عبده﴾ اپنے بندے کی مدد کی۔ بندہ سے خود آپ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ﴿وہم الاحزاب﴾ یہ حزب کی جمع ہے اس کے معنی جماعت اور لشکر ہے۔ یعنی ان کے لشکر کو ختم کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ ﴿ثم دعابین ذلک﴾ یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ ﴿ثلاث مرات﴾ تین مرتبہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپ نے یہ ذکر تین بار کیا۔ ﴿حتی اذا انصب﴾ یہ انصب سے ہے یعنی وادی میں نیچے اترے۔ ﴿حتی اذا صعد﴾ یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی، مگر مصنف رحمہ اللہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ ﴿یوم الترویہ﴾ ثناء پر زبر راء ساکن اور واؤ کے نیچے زیر اور یاء مخفف یہ مصدر ہے۔ ”ادواء“ یعنی پینے کے معنی میں اور ”یوم الترویہ“ ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی دن حجاج میدان عرفات کی ضرورت کیلئے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ﴿توجهوا﴾ یعنی انہوں نے قصد کیا اور روانہ ہو گئے۔ ﴿فصلی بھا﴾ یعنی مٹی میں پیچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا ﴿ثم مکث قليلاً﴾ یعنی نوزی الحجہ کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ ﴿فاجاز﴾ یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے ﴿حتی اتی عرفہ﴾ یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ ﴿القبۃ﴾ قاف پر پیش، چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ ﴿بنمرۃ﴾ نون پر زبر، میم کے نیچے زیر اور راء پر زبر میدان عرفات سے کچھ پہلے معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں۔ ﴿فرحلت﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ تریل سے ہے یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ ﴿فاتی بطن الوادی﴾

اس وادی سے مراد وادی عرنہ ہے جس کے عین پر پیش راء پر زبر اور اس کے بعد نون۔ وادی عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ﴿الموقف﴾ قاف کے نیچے زیر یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿الی الصخرات﴾ پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ ﴿حبل المشاة﴾ حاء کے اوپر زبر اور باء ساکن اور مشاة کی میم پر پیش "ماش" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں پیدل چلنے کا راستہ۔ ریت کے درمیان ٹیلے کو بھی جبل کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ "جبل" بھی آیا ہے۔ ﴿وذہبت المصفرة قليلا﴾ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہو گئی۔ جس سے اس کے غروب کا یقین ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے تک ٹھہرا جائے اور میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی طلوع فجر تک ہے۔ جو شخص اس وقت میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا موقف صحیح ہے اور جو اس دوران یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہو گیا۔ ﴿حتی اذا غاب القرص﴾ یعنی جب سورج کی نکیہ غائب ہو گئی اور وہ اچھی طرح غروب ہو گیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ ﴿دفع﴾ یہ "اذا" کا جواب ہے یعنی آپ عرفات سے روانہ ہوئے۔ ﴿وقد شق﴾ واؤ حالیہ ہے اور ﴿شفق﴾ کی نون پر زبر یعنی ملا اور کھینچنے سے تنگ ہوا۔ ﴿الزمزم﴾ زاء کے نیچے زیر یعنی اونٹنی کی مہار یعنی مہار کو کھینچنا تنگ کیا تاکہ وہ نہ بھاگے۔ ﴿لیصب﴾ لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے یعنی چھوٹا تھا اور بچھڑا جاتا تھا۔ ﴿مودک﴾ میم پر زبر واؤ ساکن راء کے نیچے زیر۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ ﴿السکينة﴾ اس پر زبر ہے یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ ﴿کلما اتی حبلا﴾ حاء کے ساتھ یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے ﴿ادخی لها﴾ تو اس کی مہار ڈھیلی کر دیتے ﴿لم یسبح﴾ یہ تسبیح سے ہے یعنی نفل نہیں پڑھے۔ ﴿اضطجع﴾ یعنی سونے کیلئے لیٹ گئے۔ ﴿لاتبین﴾ یعنی ظاہر ہوا۔ ﴿لمشعر الحوام﴾ یہ مزدلفہ میں مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿وهلل﴾ یہ تحلیل سے ہے یعنی لا الہ الا اللہ پڑھا۔ ﴿اسفر﴾ یعنی جب روشن ہو گیا۔ ﴿بطن محسر﴾ میم پر پیش حاء پر زبر سین کے نیچے زیر اور شد مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ ہی مزدلفہ کا اس کا نام "وادی محسر" اس لئے رکھا گیا کہ ابرہہ کے ہاتھی یہاں رک گئے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آ گئے۔ ﴿فحرک﴾ یہ تحریک سے ہے یعنی آپ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تاکہ وہ تیز چلے اس لئے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے جیسے آپ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی ہستی سے جلدی سے گزر گئے تھے۔ ﴿ثم سلك الطريق الوسطی﴾ دونوں راستوں کے درمیان والے راستہ پر چلے اور یہ وہ راستہ تھا جو عرفات کے راستہ کے علاوہ تھا ﴿النی تخرج علی الجمرة الكبرى﴾ اسے جمرة عقبہ بھی کہتے ہیں اور "جمرة" نکلیروں

کے جمع ہونے کا نام ہے۔ ﴿حَتَّىٰ آتَى﴾ یعنی یہاں تک کہ آپؐ وہاں پہنچے۔ ﴿الْجُمُرَةِ الَّتِي عِنْدَ الشَّجَرَةِ﴾ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد کیلئے منیٰ کا حصہ نہیں۔ آپؐ کے زمانہ میں وہاں درخت تھا تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ ﴿الْخُذْفِ﴾ فاء پر زبر ذال ساکن، انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لویا کے دانہ کے برابر ہوتی ہو۔ ﴿رَمَىٰ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي﴾ یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں۔ بایں طور پر کہ منیٰ، عرفہ اور مزدلفہ آپؐ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ﴿الْمَنْحَرِ﴾ یعنی قریان گاہ اور وہ منیٰ ہے۔ ﴿نَحْرُ﴾ یہ لہ سے ہوتا ہے جیسے حلق سے دوسرا جانور ذبح کیا جاتا ہے ﴿افاض﴾ یعنی آپؐ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ ﴿الْإِلَى الْبَيْتِ﴾ یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کیلئے اور اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑے گا۔

(۶۰۸) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ حَضَرْتُ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَّغَ مِنْ تَلْبِيَّتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ فَارِغَ هَوْتَهُ تَوَلَّى اللَّهَ تَعَالَىٰ مِنْ رِضَامِنْدِي أَوْ عُمْرَةٍ سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالْجَنَّةَ، جَنَّتِ طَلَبَ كَرْتِے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ سَے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اِذَا فَرَّغَ مِنْ تَلْبِيَّتِهِ﴾ اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دعا مستحب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فراغت سے مراد وہ وقت ہو جب لیلک کنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کا راوی محمد بن ابی زائدہ ضعیف ہے۔ راوی حدیث ﴿حَضَرْتُ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ﴾ انصار کے قبیلہ اوس کی خطمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابوعمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن خطمی قبیلہ کا جھنڈا آپؐ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ہمراہ تھے اور اسی موقع پر شہید ہوئے۔

(۶۰۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هَهُنَا، وَمِنَى كُلُّهَا مَبْنَحَرٍ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هَهُنَا، وَعَرَفْتُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ» حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں نے قریانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قریان گاہ ہے۔ لہذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قریانی کر دو اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام

وَوَقَفْتُ هَهُنَا، وَجَمَعْتُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ». ہے اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔
قیام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وجمع کلہا موقف﴾ الجمع میں جیم پر فتح اور میم ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے جمع اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا کو جنت سے زمین پر اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے یا اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے "الجمع" کہا گیا ہے۔

(۶۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج کیلئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس موقع پر مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور جب واپس جانے کیلئے مکہ سے نکلے تو زیریں حصہ سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بیان ہوا کہ آپؐ تثنیہ علیا کے راستہ سے داخل ہوئے اور تثنیہ سفلی سے واپس ہوئے۔ بعض کے نزدیک حج کیلئے مکہ میں داخل ہونا انہی راستوں سے مسنون ہے اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخلہ کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلہ کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(۶۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو ذی طوی میں صبح تک شب بسر کرتے اِلَّا بَاتَ بِذِي طَوًى، حَتَّى يُصْبِحَ، اور غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ وَيَغْتَسِلُ، وَيَذْكُرُ ذَلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بات﴾ رات گزارتے۔ ﴿بذی طوی﴾ طوی کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تون۔ مکہ کے قریب ایک مقام و جگہ۔ (کہ جو آج کل --- ایک پرانے کنوئیں کی وجہ سے --- بڑی طوی کے نام سے مشہور ہے)

(۶۱۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا، اَنَّهُ كَانَ يُفْبِلُ اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے۔
 الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا
 الْحَاكِمُ مَرْفُوعًا، وَالْبَيْهَقِيُّ مَوْقُوفًا. ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن اس حدیث میں وہم اور اضطراب پایا جاتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حجر اسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ص: ۴۴) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

عالمِ باطل یہ ہے کہ اس پر اپنی پیشانی رکھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اسے جائز سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا شذوذ ہے۔

(۶۱۳) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا ثَلَاثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعًا، وَأَنْ يَمْشُوا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ تین چکروں میں تیز قدم چلیں اور دونوں رکنوں کے درمیان چار چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں۔ (بخاری و مسلم)

نفعی تشریح: ﴿امرہم﴾ ہم سے مراد آپ کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ ۷ھ میں عمرہ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو حکم ارشاد فرمایا تھا۔ ﴿ان یرملوا﴾ میم پر ضمہ۔ دوڑتے ہوئے۔ ﴿اشواط﴾ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چکر لگانا۔

(۶۱۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا (أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالْبَيْتِ الطَّوَافَ الْأَوَّلَ حَبَّ ثَلَاثًا وَمَشَى أَرْبَعًا. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ أَوِ الْعُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعَى ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ بِالْبَيْتِ وَيَمْشِي أَرْبَعَةً). مَقْنَعًا عَلَيْهِ.

(متفق علیہ)

(۶۱۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں قَالَ: لَمْ أَرِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتَلِمُ کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سوائے دونوں یمانی مِنَ الْبَيْتِ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ۔ رکنوں کے بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ نہیں دیکھا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿يَسْتَلِمُ﴾ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے ﴿غیر الرکنین الیمانیین﴾ نون کے بعد والی ”یا“ مخفف ہے اور یمین کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اس پر تشدید ہے اور یمین کی طرف ان کا رخ ہے، اس لئے ان کو رکن یمانی کہتے ہیں اور ﴿رکن البیت﴾ یعنی حجر اسود کا رخ بھی اسی طرف ہے اور یہ دونوں رکن حجر اسود اور دوسرا رکن وہ ہے جو کعبہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ دونوں شامی رکنوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(۶۱۶) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حجر تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَلَ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ مجھے اچھی طرح معلوم وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لَا ہے کہ تو پتھر ہے کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْبَلُكَ مَا قَبَلْتُكَ۔ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(۶۱۷) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ آپؐ نوکیلے سرے والی چھڑی جو آپؐ کے پاس تھی، الرُّكْنَ بِمِخْجَنِ مَعَهُ، وَيُقْبَلُ سے حجر اسود کو چھوتے اور اس چھڑی کو بوسہ دیتے الْمِخْجَنَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بِمِخْجَنٍ﴾ میم پر کسر۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا۔ ثم دار چھڑی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اژدھام اور رش زیادہ ہو اور حجر اسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ”تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجر اسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں فارغ وقت میسر آجائے تو ہاتھ سے مس کر لیا کرو بصورت دیگر حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہی کہہ لیا کرو۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج کے ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں اور اگر حجر اسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہئے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو تبھی بوسا دینا ہے جب وہ حجر اسود سے لگیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوالطفیل رضی اللہ عنہ﴾ عامر بن واثلہ لیشی کنانی رضی اللہ عنہ۔ حیات نبی ﷺ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ھ میں وفات پائی اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۳ھ کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بننے والے صحابہ کرامؓ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(۶۱۸) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مُضْطَبِعاً بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ: أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طواف کیا جس کو اللہ ﷻ مضطبعاً ببرد اخضر۔ روایہ: آپؐ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مضطبعاً﴾ اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصہ کو اپنی دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔ اس طرح دایاں کندھا ننگا و برہنہ رہتا ہے۔

حاصل کلام: اضطباع پہلے پہل عمرہ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کیلئے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کیلئے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں۔ البتہ یہ اضطباع صرف پہلے سات چکروں کیلئے اور بعض نے کہا ہے کہ صرف رمل کی صورت میں اضطباع ہے بعد کے چار چکروں میں نہیں۔ (رمل)

راوی حدیث: ﴿یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو صفوان تیمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابی رسول ہیں۔ حنین، طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے عامل مقرر کئے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک بقید حیات رہے۔

(۶۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ يَهْلُ مِنَّا الْمُهْلُ كَچھ لوگ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہتے تھے، اسے بھی برا نہیں فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ان کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منی سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تکبیر کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(۶۲۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: بَعْنِي النَّبِيُّ كَرِيمٌ ﷺ نے مسافروں کے سامان کے ساتھ (یا فِي الثَّقَلِ، أَوْ قَالَ: فِي) فرمایا کہ کمزوروں کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے الصُّعْفَةِ، مِنْ جَمْعٍ، بَلِيلٌ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (منی کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فِي الثَّقَلِ﴾ ٹا اور قاف دونوں پر فتح۔ سامان مسافر ﴿الصُّعْفَةِ﴾ ضاد، عین اور فاف فتح ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین، بچے، خادم وغیرہ ﴿مِنْ الْجَمْعِ﴾ مزدلفہ سے منی کی طرف لے جانے کیلئے مجھے بھیجا۔ ﴿بَلِيلٌ﴾ رات کے وقت۔ طبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور و ضعیف حضرات کو اڑدھام کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کیلئے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منی کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور جو اس اڑدھام اور کثرت میں آئے اس کیلئے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔

(۶۲۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: أَسْتَأْذِنْتُ سَوْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا رَأَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ أَنْ تَذْفَعَ قَبْلَهُ، وَكَانَتْ نَبْطَةً، يَغْنِي نَفْقِيلَةً، فَأَذِنَ لَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے رات آپ سے اجازت طلب کی کہ وہ آپ سے پہلے واپس آجائے (یہ اجازت انہوں نے اس لئے طلب کی) کہ بھاری جسم والی تھیں۔ (اس وجہ سے آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھیں) آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منی کی طرف جانے کی رخصت و اجازت ہے۔

راوی حدیث ﴿حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ رضی اللہ عنہا﴾

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا نَماز میں شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں ہَذِهِ، يَغْنِي بِالْمُزْدَلِفَةِ، فَوَقَّفَ مَعَنَا تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے قبل عرفات میں حَتَّى نَذْفَعَ، وَقَدْ وَقَّفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ رات یا دن میں قیام کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا ذَلِكَ لَيْلًا أَوْ نَهَارًا، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، اور اس نے اپنی میل کچیل اتار لی۔“ (اسے پانچوں نے وَقَضَى تَفْتَهُ. رَوَاهُ الْخَنَسُ، وَصَحَّحَهُ ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا الترمذی وَابْنُ حُزَيْمَةَ. ہے)

لغوی تشریح: ﴿مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا هَذِهِ﴾ جس نماز کیلئے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ ﴿لَيْلًا أَوْ نَهَارًا﴾ اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذی الحجہ کی صبح تک جو عرفات میں قیام پذیر رہا اس نے حج پالیا جیسا کہ خطابی نے کہا ہے۔ ﴿فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ﴾ اس نے حج کو پورا کر لیا سے مراد ہے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے ﴿وَقَضَى تَفْتَهُ﴾ اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لئے۔ ”تفت“ دراصل سر کے بال منڈوانے یا ترشوانے کے بعد محرم حلال ہونے کے موقع پر جو کچھ کرتا ہے اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج ادا کرنے بھی شامل ہیں کیونکہ ”تفت“ تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں ”تفت“ میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ عروہ بن مضرس نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپ نماز کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا میں ”طے“ کے پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو دوڑا دوڑا کر تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر قیام کرتا رہا ہوں، کیا اب بھی مجھ پر حج کے کوئی ارکان باقی ہیں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔

راوی حدیث ﴿عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ﴾ میم پر ضمہ، ضاد پر فتح اور راء مشدد اس کے نیچے زیر، سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابن اوس بن حارث بن لام الطائی۔ حمید الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

(۶۲۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مشرکین طلوع آفتاب تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے شیر تو (ایک لَا يُمَيِّضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، پہاڑ کا نام) روشن ہو گیا اور نبی ﷺ نے ان کی وَيَقُولُونَ: أَشْرِقَ نَبِيٌّ! وَإِنَّ النَّبِيَّ مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے واپس تشریف ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَقَاصَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ لے آئے۔ (بخاری) الشَّمْسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿لَا يُمَيِّضُونَ﴾ واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ ﴿أَشْرِقَ﴾ اشراق

سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو۔ یعنی چاہیے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ شیر کی ٹا پر فتح اور باء کے نیچے کسرہ۔ منی علم الصم ہے۔ نداء محذوف کا منادئی ہونے کی وجہ سے شیر ہے۔ منی کی طرف جانے والے کے پائیں پہلو معروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ ہذیل کے شیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اسی پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے ”کیما نغیر“ تاکہ ہم غارت گری کر سکیں۔ یا ہم چل سکیں۔ اس کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں تاکہ ہم چلیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزدلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہئے اور جو طلوع سورج تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہو گیا۔

(۶۲۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، دُونِ سَمِ مَرُوى هِىَ كِه نَبِى كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَقِبَهُ قَالَا: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبِى حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حتى رمى جمرۃ العقبة﴾ جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جو منی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

(۶۲۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنَى عَنْ يَمِينِهِ، وَرَمَى الْجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصِيَّاتٍ، مَارَةً أَوْ فَرَمَا كِه يِه اِن كِه كُھڑے ہونے كِي جگہ وَقَالَ: هَذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ هِىَ جِن پَر سُوْرۃ بقرہ كا نزول ہوا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿رمى الجمرۃ﴾ اس جمرہ سے جمرۃ العقبہ مراد ہے۔ ﴿انزلت عليه سورة البقرة﴾ سورۃ کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا کہ حج کے اکثر احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس سے اس پر متنبہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ حج کے اعمال توقیفی ہیں۔ ان میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کا کوئی مجاز نہیں۔

راوی حدیث ﴿اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو زید تھی۔ اسامہ کے حمزہ پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور محبوب آزاد کردہ غلام کا بیٹا۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ۔ اپنی وفات سے

قبل ان کو ایسے لشکر کا سربراہ مقرر فرمایا جس میں اکابر صحابہ کرام ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے بھی شامل تھے۔ اس وقت اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ یہ لشکر نبی ﷺ کی وفات کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وفات ۵۴ھ میں ہوئی۔ (۶۲۸) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: رَمَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ جَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدَ ذَلِكَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ. رَوَاهُ (مسلم) مُنْبِئًا.

حاصل کلام: پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(۶۲۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَزِمِي الْجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَنَعِ حَصِيَّاتٍ، يُكَبِّرُ عَلَى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ، فَيَقُومُ طَوِيلًا، وَيَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَزِمِي الْوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشَّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ، ثُمَّ يَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُومُ طَوِيلًا، ثُمَّ يَزِمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقْبَةِ، مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هَكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَفْعَلُهُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ سب سے قریبی جمرہ کو سات سنگریزے مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے۔ پھر آگے تشریف لے جاتے اور میدان میں آکر کھڑے ہو جاتے اور قبلہ رخ ہو کر طویل قیام فرماتے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر جمرہ وسطیٰ (درمیانہ شیطان) کو کنکریاں مارتے۔ پھر بائیں جانب ہو جاتے اور میدان میں آکر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے۔ پھر اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور دعا فرماتے اور طویل قیام فرماتے۔ اس کے بعد جمرہ عقبہ کو کنکریاں وادی کی گچی جگہ سے مارتے مگر وہاں قیام نہ فرماتے پھر واپس تشریف لے آتے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح عمل کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿الجمرة الدنيا﴾ وال پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ مسجد نبی کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ﴿الجمرة الدنيا﴾ کہا گیا ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ﴿ثم يسهل﴾ یسہل میں ”یا“ پر ضمہ معنی اس کے

میدان کی طرف آنے کے ہیں۔ زمین کا نشیبی حصہ۔ ﴿یرمی الوسطی﴾ وسطیٰ سے مراد جمرہ ثانیہ (دوسرا جمرہ) جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ کو سنگریزے مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آکھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے۔ لہذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہئے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آکر طویل دعا ہاتھ اوپر اٹھا کر کرنی چاہئے۔ اس طرح اژدھام کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(۶۳۰) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ حدیث بھی مروی ہے قَالَ: «اللَّهُمَّ اَرْحَمِ الْمُحْلِقِينَ»، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”الہی سرمنڈوانے قَالُوا: وَالْمُقْصِرِينَ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! والے حاجیوں پر رحم فرما۔“ صحابہؓ نے عرض کیا اے قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمُقْصِرِينَ». مُتَّفَقٌ اللہ کے رسول (ﷺ)! بال ترشوانے والے پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا ”بال عَليہ۔ ترشوانے والوں پر بھی۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿المحلقین﴾ تحلیق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈواتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینا۔ ﴿والمقصرین﴾ یہ عطف تلقین ہے یعنی آپ یہ کہیں قل والمقصرین اور تقصیر بال ترشوانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف نہیں کئے جاتے۔

(۶۳۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت بن العاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَّاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ، فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْعُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبِجَ، قَالَ: «اذْبِجْ وَلَا حَرَجَ»، قِرْبَانِي سَہ پہلے حجامت بنوالی۔ آپؐ نے اسے فرمایا قِرْبَانِي سَہ کہ کوئی حرج نہیں اور ایک آدمی نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قِرْبَانِي کر لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا ”اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔“ اس روز آپؐ سے کسی عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق استفسار پر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اب کر لو“ کوئی حرج نہیں۔“

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وَقَفَ فِي حُجَّةِ الْوُدَاعِ﴾ دسویں ذی الحجہ کے روز زوال آفتاب کے بعد جب آپؐ اپنی سواری پر سوار رہتے ہوئے جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کھڑے ہوتے۔ ﴿لَمْ اشْعُرْ﴾ اشعر میں عین پر ضمہ، معنی ہے مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ ﴿قَدَمٌ وَلَا أُخْرَ﴾ قدم، آخر دونوں باب تفعیل سے ماخوذ ہیں صیغہ مجہول ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمہ چار کام بالترتیب انجام دینا ہوتے ہیں۔ پہلا جمرہ عقبہ کو سنگریزے مارنا۔ دوسرا قربانی کرنا۔ تیسرا سر منڈانا یا بال ترشوانا۔ چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر توافق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(۶۳۲) وَعَنْ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ حَضْرَتِ مِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَزَحَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ، وَأَمَرَ بِأَمْرٍ پهلے کی اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس کا حکم دیا۔ (بخاری) أَصْحَابَهُ بِذَلِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

راوی حدیث: ﴿مِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا﴾ مسور کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ سین ساکن اور ”واو“ پر فتح، بن مخرمہ۔ مخرمہ میں میم پر فتح اور ”خاء“ ساکن اور ”راء“ پر فتح۔ زہری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہو گئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۳ھ کے آغاز میں مکہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے ان کو منجنیق کا گولہ آکر لگا اور وہ وفات پا گئے۔

(۶۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمْ الطَّيْبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلَّا هَرَجِزَ حُلَالٍ هُوَ كُنِيَ.» (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا النِّسَاءُ). رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ اور اس کی سند میں ضعف ہے۔ ضَعْفٌ.

لغوی تشریح: ﴿الْأَنْسَاءُ﴾ یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے ﴿وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ﴾ اس لئے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاة ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔

(۶۳۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ حَضْرَتِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا کہ ”عورتوں کیلئے سر منڈوانا نہیں قَالَ: «لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، بلکہ ان کیلئے صرف بال ترشوانا ہے۔“ (اسے ابوداؤد وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ۔ رَوَاهُ أَبُو نے حسن سند سے روایت کیا ہے)

دَاوُدُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانا نہیں بلکہ انہیں صرف بال کترانا چاہئے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کیلئے بال کترانا ہی مشروع ہے۔

(۶۳۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ عَبْدِ الْمَطْلِبِ اسْتَأْذَنَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَبَيْتَ بِمَكَّةَ لَيْلِيٍّ مَنَى، مِنْ أَجْلِ وَهُوَ آبُ زَمْزَمٍ يَلْسِكُنَّ تَوَّابُ أَنْ كُوَاجِزَتِ دَعِ سِقَايَتِهِ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لیسالی منی﴾ منی کی راتوں سے مراد ۱۱ ویں، ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں کی راتیں ہیں۔ یہ اجازت انہوں نے اس مقصد اور غرض کیلئے طلب کی کہ وہ اور اس کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ اس کو تقسیم کرتے تھے۔ ”فاذن لہ“ یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کو منی ہی میں یہ راتیں گزارنی واجب ہیں اور جس کو کوئی عذر پیش آجائے مثلاً منی میں خیمے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن و مشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منی میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(۶۳۶) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَرْخَصَ لِرِعَاةِ الْإِبِلِ فِي الْبَيْتُوتَةِ عَنْ مَنَى، يَزْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَزْمُونَ الْعَدَا وَمِنْ بَعْدِ الْعَدَا لِيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَزْمُونَ يَوْمَ النَّفَرِ. رَوَاهُ الْحَسَنُ، (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے، ترمذی اور ابن حبان نے اے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارخص﴾ اور ایک نسخہ میں رخص ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی رخصت و اجازت دے دی۔ ﴿رعا﴾ ”را“ پر ضمہ راع کی جمع ہے۔ ﴿فی البیتوتہ﴾ بات کا مصدر ہے۔ رات

سروں کو پکایا اور کھلایا جاتا ہے۔ ﴿اوسط ایام التشریق﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس سے اس دن کے افضل ہونے کا بھی احتمال ہے اور اوسط سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوم النحر بھی ایام تشریق میں شامل ہے مگر بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کیلئے دھوپ میں رکھتے تھے۔ اس لئے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراء بنت نبهان رضی اللہ عنہا﴾ سراء کے راپر فتح اور تشدید اور نبھان کے نون پر فتح اور باساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبد الرحمن نے اس سے روایت بیان کی ہے۔

(۶۳۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَمِعَتْ مَرْوَةَ بِنْتُ أَبِي سَفْوَانٍ قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ لَهَا: «تَبْرَأُ بِبَيْتِ اللَّهِ كَطَوَافِ كَرِينَا» طَوَافُكَ بِالْبَيْتِ، وَسَعْيُكَ بَيْنَ صَفَا وَمَرْوَةَ كَمَا مِائِينَ سَعْيِ كَرِينَا حَجٍّ وَاعْتِمَارٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تبلیہ عمرہ کا کہا تھا۔ مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہو گئیں تو ان سے نبی ﷺ نے فرمایا ”عمرے کو چھوڑ دو اور ان سے فرمایا کہ حج کا احرام باندھ لو۔“ ﴿دفعہا﴾ کے معنی ہیں اسے ترک کر دے اور عمرے کے اعمال و افعال کو نظر انداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال کا فعل حج اور عمرہ میں صحیح نہیں۔ بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انہوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارن بن گئیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ قارن کیلئے حج اور عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(۶۴۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا تَوَضَّعَ فِي السَّبْعِ الَّذِي أَقَاضَ فِيهِ. (پچھروں) میں کسی چکر میں بھی رمل نہیں فرمایا۔ رَوَاهُ الْخَنَسَةُ إِلَّا الثَّرَمِيذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فِي السَّبْعِ الَّذِي أَقَاضَ فِيهِ﴾ طواف افاضہ کے طواف کے ساتھ پھیرے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ میں رمل نہیں اور نہ ہی طواف وداع میں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ طواف قدوم اس طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں پہلے داخلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کیلئے ہے۔ خواتین کیلئے نہیں ہے ہاں اگر

کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ گیا ہو تو اس کی تلافی کیلئے طوافِ افاضہ میں رمل کر لے۔

(۶۴۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمَحْضَبِ، ثُمَّ رَكِبَ إِلَى الْبَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (بالترتیب اپنے اپنے وقت میں) ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور پھر مقام محصب پر تھوڑا سو گئے پھر سوار ہو کر بیت اللہ کی جانب تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ (بخاری)

أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . عورتوں کیلئے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)
حاصل کلام: یہ طواف واداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمہ اللہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا پڑتا ہے مگر ان عورتوں کیلئے معاف ہے جو ایام ماہواری میں ہوں۔

(۶۴۴) وَعَنْ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيَمَا سِوَاهُ، مُقَابِلَهُ فِي هَذَا مِثْلُهَا فِي مَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةٍ فِي مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلَاةٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت ابن الزبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہے۔ بجز مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھنے سے افضل ہے۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسجد نبویؐ اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپؐ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ ہذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے یہ مطلب مفہوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد نبویؐ عہد نبویؐ میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبویؐ کے ساتھ ملحق ہے اس لئے وہ بھی مسجد نبویؐ کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ صد نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی کا دوسری مساجد میں ایک لاکھ پڑھی جانے والی نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن الزبیر رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ نام ان کا عبد اللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہے۔ قریش کے قبیلہ اسد سے ہیں۔ اس لئے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ جن ہی یہ قبائلیں ابن زبیر کی ولادت ہو گئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ پہلا نومولود تھا۔ بکثرت روزے رکھتے۔ بہت نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ تکلیف کو پہنچنے والے تھے۔ ۶۳ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز، عراق، یمن، مصر اور اکثر علاقہ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور ان

کو ۳۷ھ میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

٦ - بَابُ الْفَوَاتِ وَالْإِخْصَارِ حج سے رہ جانے اور روکے جانے کا

بیان

(۶۴۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَدْ أُخْصِرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتَّى اغْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا گیا تو آپؐ نے اپنا سرمند وایا اور قربانی کی اور اپنی ازدواج سے تعلق زن و شو قائم کیا یہاں تک کہ آپؐ نے آئندہ سال عمرہ کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿باب الفوات والاحصار﴾ فوات کے فاء پر فتح۔ یعنی اس کا کیا حکم ہے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے۔ جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے اور احصار کے معنی رکنا ہے۔ جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اسے بیت اللہ پہنچنے میں رکاوٹ ہو۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ ﴿احصر﴾ صیغہ مجہول یعنی عمرہ سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کر دے۔ ﴿حتی اعتمر عما قبل﴾ حتیٰ کہ آئندہ سال عمرہ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ کی قضاء واجب ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپؐ نے کیا اور یہ وجوب کو مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ یہ عمرہ آپؐ کا پہلے عمرہ کی قضاء تھی۔ بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرۃ القضاء تو صرف اس لئے رکھا گیا کہ حدیبیہ کے موقع پر اس مسئلہ کا فیصلہ دونوں فرقہ کیلئے تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ احرام بند ہو کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپؐ نے وہیں احرام کھول دیا، قربانی کی اور سر کے بال منڈائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیئے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے وہیں نحر و زبح کر دیئے۔

احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجالانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے

کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی خواہ وہ جگہ حل ہو یا حرم اور یہی قول رائج ہے۔ مگر احناف کے نزدیک قربانی ہر صورت میں حرم میں ذبح و نحر ہونی چاہئے اور اسے کسی کے ذریعہ سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ناممکن ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے تمام اصحاب کے پاس حدی تو نہیں تھی اگر واجب ہوتی تو پھر سب کیلئے اس کا وجوب ہوتا۔ حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات رائج معلوم ہوتی ہے۔

(۶۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا بِنْتِ زَيْبِرِ بْنِ عَبْدِ الْمَطْلَبِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى ضَبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، (ﷺ) میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنْ مَحَلِّي جَمَالَ أَعْلَى اللَّهِ! تَوْنِي مَجْهُ رُوكَا»۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿شاکہ﴾ بیمار۔ ﴿محلی﴾ میم پر فتح اور ”حا“ کے نیچے کسرہ یعنی حج سے خروج کا وقت اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ یعنی وقت اور مقام دونوں کا بیان مقصود ہے۔ ﴿حبستنی﴾ صغہ مخاطب یعنی اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

(۶۴۷) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنْ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَ، وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَا: صَدَقَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَنَهُ التِّرْمِذِيُّ۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کا پاؤں توڑا جائے یا لنگڑا ہو جائے وہ احرام سے باہر آگیا اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی و ضروری ہے۔“ عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حجاج بن عمرو نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

قَالَ مُصَنَّفُهُ - حَافِظُ الْعَصْرِ،
 قَاضِي الْقَضَاءِ أَبُو الْفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ
 عَلِيٍّ بْنِ حَجَرٍ الْكِنَانِيُّ الْعَسْفَلَانِيُّ
 الْمِصْرِيُّ، أَبَقَاهُ اللَّهُ فِي خَيْرٍ -
 آخِرُ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ
 هَذَا الْكِتَابِ الْمُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ
 الْفَرَاغُ مِنْهُ فِي ثَانِي عَشَرَ شَهْرَ رَجَبِ
 الْأَوَّلِ سَنَةِ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ
 وَثَمَانِمِائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ
 الْعِبَادَاتِ، يَتْلُوهُ فِي الْجُزْءِ الثَّانِي.
 كِتَابُ الْيُتُوعِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى
 سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ
 تَسْلِيمًا كَثِيرًا دَائِمًا أَبَدًا. غَفَرَ اللَّهُ
 لِكَاتِبِهِ وَلَوْلَايَدِيهِ وَلِكُلِّ الْمُسْلِمِينَ،
 وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ.

بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر قاضی القضا
 ة (چف جسٹس) ابوالفضل احمد بن علی بن حجر الکنانی
 العسقلانی مصری اللہ تعالیٰ ان کو بھلائیوں میں ہمیشہ
 زندہ رکھے نے کہا ہے کہ اتنا حصہ جزء اول کا
 آخری حصہ ہے اور وہ اس کتاب کا نصف ہے۔
 انہوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ھ ماہ ربیع الاول کی ۱۲/
 تاریخ کو اس سے فارغ ہوا اور یہ عبادات کے
 چوتھائی کا آخری حصہ ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسرا
 نصف کتاب الیوبوع کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے
 کاتب اور اس کے والدین اور جمیع مسلمین کو اپنے
 دامن مغفرت میں ڈھانپ لے اور اللہ ہمارے لئے
 کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

لعقوی تشریح: ﴿کسر﴾ صیغہ مجهول۔ ﴿اوعرج﴾ عین اور را دونوں پر فتح۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو
 پیدائشی نہ ہو اور جب پیدائشی ہو تو اس صورت میں عرج را کو کسرہ سے پڑھا جائے گا۔ ﴿فقدحل﴾ یعنی
 اس کیلئے احرام ترک کر دینا جائز ہے اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ ﴿وعليه
 الحج من قابل﴾ آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرض حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی
 نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ الیمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوا
 کہ حرم احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے۔ (۱) احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی مانع کی
 وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ (۲) اس نے شرط کر لی ہو۔ (۳) کسی حادثہ کی وجہ سے پاؤں وغیرہ میں چوٹ آگئی ہو یا
 وہ لنگڑا ہو گیا ہو۔ جس شخص کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو اس کے بارے میں
 ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرہ کیلئے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید
 بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عمرہ کے لئے تلبیہ کہے گا اور از سر نو
 دوبارہ احرام باندھے گا پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کیلئے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے
 کہ دم دینا واجب نہیں ہے۔ (دم دینا۔۔۔ یعنی قربانی کرنا)

حدیث کے بعد والی عبارت ۱۲۹۹ھ کے مطبوعہ نسخہ مطبع صدیقیہ جو بھوپال کا ایک سرکاری مطبع ہے میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ کا مطبع ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخہ سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخہ میں ان کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام بھی ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ انہوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا۔ مثلاً امام یوسف جو مصنف کی اولاد ہیں۔ شیخ عبدالباسط بن احمد سیسی، ازہری، شیخ محمد بن عبداللطیف مملوکی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی طباعت نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی مؤلف روح المعانی کے پوتے کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ضباعہ بنت زبیر﴾ ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ضادر پر ضمہ۔ پورا نام ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علیؑ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔ ﴿عکرمہ﴾ عکرمہ کے عین پر کسرہ، کاف ساکن اور راء پر کسرہ۔ ابو عبداللہ کنیت۔ عکرمہ مدنی، عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ بربر قبیلہ سے تھے۔ بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہاء مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے درجے میں شامل ہیں۔ ۷۰ھ میں اسی سال کی عمر یا کر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

﴿حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علیؑ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔